

(حقوقِ طبع بحقِ مصنف محفوظ ہے)

دورِ حاضر کی بلند پایہ پیشکش

امامت و ملوکیت

در جواب

خلافت و ملوکیت

مُصَنَّف

حُجَّةُ الْإِسْلَام وَالْمُسْلِمِينَ أَسَاءُ الْعُلَمَاءِ وَالْمُجْتَهِدِينَ رُئُوسُ الْمَفْسَرِينَ آيَةُ اللَّهِ عَلَيْهِ سَلَامٌ نَحْشُ مَذَلَّةَ الْعَالِي

بَانِي. جَامِعَةُ عِلْمِيَّةِ بَابِ النُّجْفِ جَاڑِ اَضْلَع ڈیرہ اسماعیل خان

ناشر

مکتبہ انوار النجف دریا خان ضلع بھکر

نام مصنف _____ علامہ حسین بخش جارا
 نام کتاب _____ امامت و ملوکیت
 طبع _____ الذریعہ پریس سرگودھا
 تعداد _____ ایک ہزار
 اشاعت ششم _____ اگست ۱۹۹۱ء
 قیمت _____

ناشر
 مکتبہ انوار النجف دریا خان ضلع بہکڑ

سالانہ برسی علامہ صاحب

۱۵ - شوال - بمقام درسگاہ امامیہ ڈیرہ روڈ
 ۱۶ دریا خان ضلع بہکڑ

پیش لفظ

خلافت و ملوکیت جب الگ کتابی صورت میں شائع ہوئی تو علمی حلقوں میں اس کا بڑا چہ چا ہوا۔ خود
سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بعض اہلسنت حضرات پر یہ کتاب ہماری چنانچہ اس کی تردید میں
جوابات لکھے گئے۔ شیعہ حضرات نے اس کتاب کو خوب سراہا۔ بالخصوص جہاں کتاب مذکور میں اموی خاندان
کی گئی شیعوں کے لئے اس نے نوید مسترت کا کام کیا۔ مجھے میرے محترم دوست سید محمد علی شاہ، خلیف الرشید سید
شاہ مرحوم جگہ ۲۱ تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا نے اس کتاب کے مطالعہ کی دعوت دی شاید انہیں یہ توقع تھی
میں بھی کتاب مذکور کو الہامی دستاویز قرار دے کر مصنف کی تحقیق انیق اور اس کے اچھوتے انداز کی داد دے
ہوئے اس کے مداحوں میں شامل ہو جاؤں یا کم از کم اس کی توثیق کروں۔ لیکن شاہ صاحب کی حیرت کی حد نہ رہی
جب میں نے کتاب مذکور کے مطالعہ کے بعد اس کتاب کو ملت جعفریہ کے لئے رسم قاتل قرار دیا۔ اور میں نے اسی وقت
کہہ دیا کہ اس کی تردید واجب و لازم ہے ورنہ کالج کی فضا میں پٹنے والے نوخیز و خالی الذہن شیعہ نوجوان اس سے
متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے اور پھر اچھے ہوئے اذہان کا روبرو اصلاح ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو
جائے گا۔ چنانچہ شاہ صاحب موصوف نے کتاب مذکور کا جواب باصواب لکھنے کی پرزور تاکید فرمائی اور اس
کی طباعت و اشاعت کے جملہ مصارف کے برداشت کرنے کا بھی وعدہ فرمایا۔ اور جب مقدور پڑھے لکھے شیعہ
طبقہ سے تبادلہ خیالات کا اتفاق ہوا تو میں نے اکثر شیعہ نوجوانوں کو خلافت و ملوکیت اور اس کے مصنف کی
تحقیق و تدقیق اور طرز نگارش کا مداح پایا۔ پس میں نے عزم صمیم کر لیا کہ اس کی تردید ضرور کی جائے تاکہ متوہم
خطرہ مستقبل قریب میں حقیقت کا لباس نہ پہن لے۔ میں نے جواب میں غیر ضروری بحثوں میں وقت ضائع کرنے
سے پوری طرح گریز کیا ہے صرف مقام اختلاف کو نہایت تہذیب و متانت کے ہیچ میں واضح کیا ہے۔ اور
مودوری صاحب کے نظریات کو ان کی اپنی تحقیق کی روشنی میں باطل ثابت کیا ہے۔ نہ مضامین میں اس قدر طول
ہے کہ طبیعتوں کے لئے باعث ملول ہو اور نہ اس قدر اختصار ہے کہ مطلب قہی مشکل ہو جائے۔ خدا کرے تارئین
کلام اس کو سمجھنے اور اس میں سنجیدگی سے غور کرنے کی کوشش کریں اور جہاں میری دلیل میں سقم ہو مجھے مطلع
فرمادیں کیوں کہ میں اپنے آپ کو غلطی سے بالاتر نہیں سمجھتا۔ و ما تو فیقی الا باللہ العلی العظیم

(علامہ) حسین بخش

پرنسپل دارالعلوم محمدیہ بلاک نمبر ۱۹ سرگودھا

فہرست مضامین

| | | |
|--|----|-------------------------------|
| انسانی تمدن اور نظریہ توحید | ۶ | شیعیان علیؑ پر نازک دور |
| وجہ اختلاف | ۷ | راست گوئی اور راست بازی |
| قانون سازی میں نظریاتی اختلاف | ۸ | لیپ پوت کی مذمت |
| وجہ اشتباہ | ۹ | مذہب جمہور کی پالیسی |
| اسلامی آئین | ۱۰ | پہلا اور دوسرا طریقہ |
| قرآنی ہدایات | ۱۲ | تیسرا اور چوتھا طریقہ |
| حاکم کی تعیین | ۱۴ | مذہبی اختلاف کی ابتداء |
| اسلامی معاشرہ | ۱۸ | جمہور اہل اسلام |
| اسلامی حکومت کا سربراہ | ۱۹ | شیعہ مسلک کی جمہور سے علیحدگی |
| قرآن میں جمہوریت کی تردید | ۲۱ | تولی اور تبری |
| ہمارا رسولؐ | ۲۴ | جمہوریت اور جمہور اہل اسلام |
| جمہوری خلافت | ۲۵ | اسلام کے اصول حکمرانی |
| انعقاد خلافت میں جلد بازی | ۳۲ | دعوتِ فکر |
| مودودی صاحب کی محققانہ روش | ۴۱ | خلافتِ راشدہ کی خصوصیات |
| ملوکیت ہی ملوکیت | ۴۴ | دوسری خصوصیت |
| خلافتی الیکشن کا پس منظر | ۴۸ | تیسری خصوصیت |
| نظریاتی فرق کی وجہ | ۵۵ | چوتھی اور پانچویں خصوصیت |
| لقبول مودودی صاحب معاویہ کی غلط کاریاں | ۵۹ | انصاف کا تقاضا |
| دعوتِ فکر | ۶۲ | امامت اور فرقہ امامیہ |
| شیعہ مسلک | ۶۶ | |

| | | |
|---|-----|--------------------------------------|
| ساتویں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام | ۱۲۶ | قیادت |
| آٹھویں امام علی رضا علیہ السلام | ۱۲۷ | سیاسی قیادت |
| نویں امام محمد تقی علیہ السلام | ۱۲۸ | حضرت امام حسینؑ کا بروقت اقدام |
| دسویں امام علی نقی علیہ السلام | ۱۳۱ | دینی قیادت |
| گیارہویں امام حسن عسکری علیہ السلام | ۱۳۳ | عزاداری |
| بارہویں امام حجتہ ابن الحسن علیہ السلام | ۱۳۴ | اکثر اثنا عشر |
| شیعہ مکتبہ نمبر | ۱۳۸ | پہلا امام حضرت علی علیہ السلام |
| عقیدہ توحید | ۱۳۹ | ایمان ابوطالبؑ |
| عقیدہ عدل | ۱۴۰ | محمد و مناقب |
| عقیدہ نبوت | ۱۴۲ | حق علیؑ کے ساتھ |
| عقیدہ امامت | ۱۴۴ | زمانہ اقتدار |
| عقیدہ قیامت | ۱۴۵ | دوسرا امام حسن بن علی علیہ السلام |
| کرسی اقتدار کے رائج الوقت ذرائع | ۱۴۷ | تیسرا امام حسین بن علی علیہ السلام |
| دورِ حاضر میں اسلامی حکومت کا تصور | ۱۴۸ | دقتِ زمانہ |
| اسلامی مساوات | ۱۵۰ | مقصدِ عظیم |
| غریب کو کچلنے کی ذمہ داری کس پر ہے | ۱۵۲ | فتحِ مبین |
| امیر و غریب میں فرق | ۱۵۳ | چوتھے امام علی بن الحسین علیہ السلام |
| حضرت علیؑ کی حکومت روشنی کا مینار تھی | ۱۵۴ | سیاسی انقلاب |
| کردار میں بلندی | ۱۵۶ | پانچواں امام محمد بن علی علیہ السلام |
| حکومت اور رعایا کے لئے دستور العمل | ۱۵۷ | مذہبِ جمہور کی تشکیل و تنظیم |
| تقوینی کے متعلق جامع کلمات | ۱۵۹ | چھٹے امام حضرت جعفر صادق علیہ السلام |
| اجازات | | |

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

انسانی تمدن اور نظریہ توحید

وجود انسانی میں جذب و دفع اور محبت و نفرت کے فطری تقاضے نفوس زکیہ و عقول صحیحہ کے لئے دعوت فکر و عمل کے دائمی محرک ہیں اور تمدنی زندگی کی راہوں کو ہموار کرنے کے لئے انہی فطری تقاضوں کو بنیادی حیثیت دے کر آگے بڑھنا پڑتا ہے اور چونکہ افکار و انظار میں اتحاد و یگانگت بھی فطرت انسانیہ کے خمیر سے بالکل بیگانہ ہے لہذا تمدن انسانی میں عادلانہ روش کی تلاش نہایت مشکل مرحلہ ہے۔ پس وہ مرکز جس پر تمام عقول و افکار کی تنگ و دو کی انتہاء ہو اور وہ واحد نقطہ جس پر چہات مختلفہ سے سوچ و بچار کے خطوط آکر جمع ہوں۔ وہ صرف نظریہ توحید ہے۔

قرآن مجید نے تمدن انسانی کے توازن کو قائم کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے جن سیاسی خطوط کی نشاندہی کی ہے ان سب میں عقیدہ توحید کو بنیادی حیثیت حاصل ہے وہ اللہ جو تمام مخلوق کا خالق ہے۔ فرش سے عرش تک تمام کائنات علویہ سفلیہ کا موجد ہے اور ہر ذی روح و غیر ذی روح کو خلعت و عطا کرنے والا ہے جس طرح وہ خلق و تدبیر میں یکا و تنہا ہے اسی طرح حکومت و سلطنت میں بھی لاشریک ہے وہ جس طرح کوہی نظام میں اختیارات کلیہ کا حامل ہے اسی طرح انسانوں کے تشرعی امور میں بھی حق حکومت صرف اسی کی ذات میں محصور ہے اور انسان کی زندگی کے اختیار ہی شعبوں میں اگرچہ وہ بزور اپنی حکومت کو مسلط نہیں کرتا تاہم اس میں شک نہیں کہ انسانی تمدن اور اس کی بقا اور ارتقا کے لئے جو قوانین و ضوابط اس کی طرف سے مقرر ہوں گے وہ لافانی مصالح پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے عادلانہ اور منصفانہ نظام عمل کے خطوط ہوں گے جن پر چلنے والا انسان کبھی بھی زندگی کی دشوار گزار گھاٹیوں میں ٹھکنے نہ پائے گا اور ان کو اپنانے والا معاشرہ کبھی مشکلات و مصائب میں مایوسیوں کا شکار نہ ہوگا۔ ان میں مساوات بھی ہوگی اور حقوق کی نگہداشت بھی ہوگی۔ وہاں مساوات کا تصور حقوق کی برقراری سے متصادم نہیں ہوتا اور حقوق کی حفاظت مساوات سے ٹک نہ نہیں لیتی۔ طبقاتی زندگی میں ہر طبقہ فرائض و احکام کی بندشوں میں ایسی مضبوطی سے جکڑا ہوا ہوتا ہے کہ زبردست و زبردست بھائی بھائی نظر آتے ہیں۔ آقا۔ آقا ہونے کے باوجود غلام کو اس طرح سینے سے لگاتا ہے کہ اس میں احساسِ کمتری پیدا ہی نہیں ہونے پاتا اور غلام غلام ہونے کے باوجود اپنے آقا کے

ش بدوش معاشرتی معاملات میں اس کا ہاتھ بٹاتے ہوئے اپنے اندر فخر کی ایسی جھلک محسوس کرتا ہے کہ وہ اسے غلامی کے تصور سے بے نیاز رکھتی ہے اور ایسی پرسکون اور اطمینان بخش زندگی ایسے نظام عمل کے سوانا ممکن ہے۔

وجہ اختلاف فطری طور پر جذبہ تسخیر موجودات جو انسان کے اندر موجود ہے وہ قوت فکر و ادراک کو علوم مناسبہ اور فنون لائقہ میں دسترس حاصل کرنے کے لئے بے چین رکھتا ہے تاکہ تسخیر کی راہیں ہموار ہو سکیں اور یہی جذبہ انسانی قوی و مشاعر کو ہمیشہ متحرک رکھتا ہے۔

نیز جذب و دفع کے جذبات بھی فطری ہیں کہ ہر انسان اپنے لئے محبوب و مرغوب کی تحصیل کا خواہاں اور مکروہ و ناپسند سے گریزاں ہوتا ہے پس یہی فطری جذبات جہاں ایک آدمی کو آگے بڑھنے کی دعوت دیتے ہیں وہاں اُسے راستہ روکنے والی ہر طاقت سے ٹکرانے کی پیش کش بھی کرتے ہیں اور تحصیل مرغوب و محبوب کا جذبہ فطری طور پر کسی شریک کو پسند نہیں کرتا پس ہر وہ انسان جو دوسرے انسان کی محبوب و مرغوب چیز میں شریک ہونے کی کوشش کرے وہ اس کا دشمن قرار پاتا ہے اور جو شخص کسی کی مرغوب و محبوب چیز کی تحصیل میں مدد کرے وہ اس کا دوست ہوتا ہے۔ پس فطری طور پر ہر انسان چاہتا ہے کہ دنیا کی ہر اچھی چیز میرے لئے ہی ہونی چاہیے اور جو بھی اس خواہش میں میرا شریک بننا چاہے یا میرا راستہ روکنا چاہے اس کے ساتھ الجھنا لڑنا اور اس کو راستہ سے ہٹانا میرا فطری حق ہے کیونکہ ہر انسان کا جذبہ خود پسندی اس امر کا مقتضی ہے کہ جو چیز وہ اپنے لئے پسند کرے اس میں اس کا کوئی شریک نہ ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ انسان میں ایک قوت حاکمہ بھی موجود ہے جسے قوت عاقلہ کہا جاتا ہے وہ ان جذب و دفع کی قوتوں پر کنٹرول کرنے پر قادر ہے اور وہی انسانیت کا جوہر اور باقی حیوانات سے امتیازی نشان ہے۔ پس جہاں اپنی ذات کے لئے حلیب منفعت اور استیقام موجودات کی طرف پیش قدمی کی دعوت انسان کے جذبہ فطرت کی آواز ہے وہاں تجاوزِ حدود سے اجتناب شرافت و دیانت کی رعایت تمدنی مساوات اور اتحاد و یگانگت صلح و آشتی اور عدل و انصاف کے اصولوں سے تمسک عقل فطری اور اس کی صالح ضمیر کا فیصلہ ہے۔ **فَالْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا** (اس نے نفس انسانی کو برائی اور نیکی کا الہام کر دیا ہے) اور انسان کے مدنی الطبع ہونے کا یہی مقصد ہے افراد انسانی چونکہ قوت و ضعف میں یکساں نہیں ہیں اور جس طرح ان کی ظاہری قوتوں میں فرق ہے اسی طرح ان کے باطنی مشاعر یعنی دل و دماغ اور حس و شعور وغیرہ میں بھی کافی اختلاف ہے پس جذبہ

فطرت اگرچہ سب میں یکساں ہے لیکن اس کی طرف اقدام کرنا اور حد کا میابی تک پہنچنا ہر ایک کے بس بات نہیں۔ ہر شخص اپنی طاہری قوت اور دماغی صلاحیت کے ماتحت اپنی ہمت کے قدر پر چل کر مقصد تک رسائی پاسکتا ہے اور ہر طاقتور اپنے راستہ میں حائل ہونے والے ہر کمزور کو کچل کر بڑھنے کی فکر میں ہوتا ہے۔ اور جب جذبات ابھر جائیں اور خواہشات طشت از بام ہو جائیں تو عقل کے فتویٰ پر عمل کرنا مشکل ہوتا ہے بلکہ عقل کا تو ایسے حالات میں ناطقہ بند ہو جاتا ہے پس وہ کنج تنہائی میں سرمنہ ڈھانپے ہوئے بے بس قیدی کی طرح خواہشات و جذبات کے پنجرہ میں محبوس ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور انسانیت شتر بے مہار کی طرح ظلم و جور کی تاریک اور گھناؤنی وادیوں میں سرگرداں ہو کر اپنی مملکت کے اسباب مہیا کرنے لگتی ہے۔ کسی طرف ظالمانہ گرج اور جابرانہ شور مبلند ہوتا ہے اور کہیں مظلومانہ آہیں اور پُر درد کراہتی ہوئی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔ اس بے راہ روی اور جوہر و اعتساف سے بچنے کے لئے دو حل تلاش کئے گئے ہیں۔ ۱۔ تعلیم و تربیت ۲۔ قانون۔

عقول انسانیہ امر مجہ و طبائع کے اختلافات جذب و دفع کے تقاضوں میں کش مکش اور تمدن انسانی کے غیر تسلی بخش حالات کا جائزہ لیتے ہوئے جہاں تعلیم و تربیت کو ضروری قرار دیتی ہیں وہاں قانون کی بالادستی کی افادیت پر بھی یقین کامل رکھتی ہیں لیکن قانونی نوعیت کیسی ہو اور اس کی تشکیل و ترویج کے لئے بنیادی حیثیت کس نظریہ کو دی جائے؟ یہ ایک ایسا طویل و پیچیدہ مسئلہ ہے جس کو حل کرنے میں عقول و افکار مسلسل طولانی جنگ لڑ رہے ہیں اور ظاہر کسی صحیح نتیجہ پران کا پہنچ جانا بھی محالات میں سے ہے اور یہ ایک ایسا عقد و لایحل ہے جس کو تہمید کے ناخنوں سے کھولا نہیں جاسکتا جب تک اصل بنیادی غلطی کا سراغ نہ لگایا جائے اس کی جی مثال یوں سمجھئے کہ جس طرح مختلف النیال لوگوں پر مشتمل ایک قافلہ کسی دور دراز منزل کی طرف کسی مقصد کی خاطر زاد راہ اور ضروری لوازم سفر ساتھ لے کر گامزن ہو اور اشنائے راہ میں ضروریات و لوازم کی کمی بیشی یا طریق استعمال میں اختلاف اراد کے پیش نظر ان کے درمیان بھڑپٹ پر جائے اور حالات بگڑتے بگڑتے جبکہ عزت لوٹ کھسوٹ مار دھاڑ اور قتل و غارت تک نوبت پہنچ جائے اور اس قسم کے ناگفتہ بہ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ارباب حل و عقد اپنی عزت و ناموس اور جان و مال کی حفاظت اور پورے قافلہ والوں میں امن و سلامتی اور اتحاد و یکجہالت کی راہیں ہموار کرنے کے لئے آپس میں سر جھک کر مجلس مشاورت منعقد کریں اور متفقہ طور پر ایک ایسے دستور العمل کی تشکیل کریں جو قافلہ کے ہر فرد کے لئے قابل قبول ہونے کے علاوہ ان کی جان و مال و عزت کے تحفظ کا ضامن بھی ہو اور سکون وطمینان

اور امن و سلامتی کا علمبردار بھی ہو تو بنیادی طور پر صرف دو نظریے ہی سامنے آتے ہیں جو قانون کی اصل و اساس قرار دے جائیں۔ ایک یہ کہ قافلہ کے ہر فرد کی شخصی ملکیت کو ختم کر دیا جائے اور اس کی انفرادی خصوصیت کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر چیز اور ہر حق میں مساوات کا علم مل بند کیا جائے۔ اور ہر شے پر ہر شخص کو حق تصرف دے دیا جائے تاکہ سفر کا بقیہ وقت امن و سکون سے پاس ہو کیونکہ ہر شخص کو پتہ ہے کہ منزل مقصود پر رسائی کے بعد لوازم سفر اور ضروریات راہ کی افادیت ختم ہو جائے گی اور ہر فرد ان سے بے نیاز ہو جائے گا لہذا شخصی ملکیت اور انفرادی شخص کو سرے سے ہی ختم کر دیا جائے جو باہمی رفاقت اور امن و آشتی کے لئے باعث خطرہ ہے۔ اور یہ ہے نظریہ اشتراکیت اور اس کے مقابلہ میں دوسرے نظریہ ہے کہ ہر شخص کی انفرادی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے ضابطہ قانون کو ایسے خطوط پر مرتب کیا جائے کہ ہر شخص اپنی اپنی متعینہ حدود کا پابند ہو جائے اور باہمی ہمدردی اور رواداری کی مدد سے سفر کی باقی منازل کو چین و آرام سے گزارنے کا بندوبست کیا جائے۔

ان ہر دو نظریات میں خواہ کس قدر ہی خلوص کا جذبہ کا رہا ہو۔ آخر قوانین و ضوابط و وجہ اشتباہ کا ڈھانچہ تیار کرنے والے پھر بھی وہی انسان ہیں جن کو جذب منفعت اور دفع مضرت کے فطری جذبہ سے مستثناء نہیں قرار دیا جاسکتا اور سابق ہر دو نظریے اس مبنی پر قائم ہیں کہ انسانی زندگی صرف دنیاوی چند لمحات پر منحصر ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں۔ پس مبادا و معاد کی حقیقت سے ناواقفیت یا چشم پوشی ہی زندگی کے ہر شعبہ میں انسانی ذہن کی تشویش کی موجب ہوتی ہے اور عقیدہ توحید سے انحراف اور غرض خلقت سے روگردانی کبھی تمدن انسانی میں سکون و چین کو جنم نہیں دے سکتی۔ ہزار قانون بنائے جائیں لاکھ ضابطے تیار کئے جائیں لیکن حرص و ہوس، جذبات و خواہشات اور خود غرضی و نفس پرستی کے افسوس ناک نتائج سے محفوظ رہنا ناشدنی امر ہے اور جور و اعتساف اور ظلم و استبداد کی ناخوشگوار فضا سے باہر نکلنے کا تصور اور انسانیت کے لئے امن و سکون کے مقام کی تلاش صرف خوش فہمی بلکہ خود فیری کے مترادف ہے۔ بے شک قمر و غلبہ سے نچلے طبقہ کو دبایا جاسکتا ہے ان کی زبانوں پر پرہ بٹھایا جاسکتا ہے اور ان کو اپنی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی قلبی ہم آہنگی اور سچی وفاداری حاصل کرنا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ محال امر ہے اور جس نظریے کے حامیوں کے ہاتھ اقتدار پر اپنی گرفت کو مضبوط کر لیں ان کا قانونی شکنجہ تمام ماتحت افراد کو اگرچہ بے راہ روی سے روکنے میں موثر ثابت ہو سکتا ہے لیکن حکمران گروہ اور برسر اقتدار طبقہ کو بد عنوانیوں سے روکنے والا کون سا قانون ہو گا جب کہ قانون ساز بھی وہ خود ہیں اور قانون باز بھی وہی اور ایسے حالات میں اگر رعایا میں کچھ حس و شعور ہو تو وہ

کیونکہ حکمرانوں سے مطمئن ہوں گے اور حکمران اگر دانا ہوں تو وہ کیوں اس فریب میں رہیں گے کہ بس رعایا کا ہر فرد حکومت سے مطمئن ہے ؟

پس جب تک یہ تصور نہ ہو کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا بھی ہے اور اس عارضی زندگی کے بعد ہمیں ایک ذات کے سامنے جواب دہ بھی ہونا ہے اور ہمارے لئے نیکی کی جزا اور بدکرداری اور بے راہ روی کی سزا بھی ہے تو یقیناً تمدن میں اعتدال پیدا نہیں ہو سکتا پس توازن و اعتدال اور سکون و اطمینان کی فضائیں تب ہی پیدا کی جا سکتی ہیں جب عقیدہ توحید پر اس ساری عمارت کی بنیاد کھڑی کی جائے۔ عوام کو بھی خدا کے سامنے جوابدہ ہونے کا خوف ہو تاکہ حقوق معاشرہ حقوق نفس اور حقوق تمدن کی ادائیگی میں حکومت سے بھرپور تعاون کرنا اپنا ایمان سمجھیں اور حکمران طبقہ کو بھی یہی خوف دامن گیر ہو کہ ہم نے اپنی ہر بے راہ روی پر اللہ کے سامنے جوابدہ ہونا ہے پس وہ اپنے فرائض منصبیہ کی ادائیگی کو اپنا ایمانی فریضہ سمجھیں اور حکومت کی کلیدی اساسیوں پر تعیناتی حکومت کے نکتہ نگاہ سے نہیں بلکہ خدمتِ خلق کے پیش نظر قبول کریں ایسی صورت میں ناممکن ہے کہ رعایا حکومت سے مطمئن نہ ہو یا حکومت رعایا کے تعاون سے محروم ہو۔

انسان کے مدنی الطبع ہونے کے پیش نظر اجتماعی زندگی کے لئے قابل قبول اصول کی اسلامی آئین تشکیل میں نظریات کا باہمی تصادم ہر دور کے عقلاء کے لئے باعث تشویش و اضطراب بنا رہا اور دانشور طبقہ ہمیشہ انسان کی فلاح و اصلاح ، بقا و ارتقا کے لئے کامیاب و پرسکون اجتماعی زندگی کے نظامی قوانین و ضوابط پیش کرتا رہا لیکن روز اول سے قیامت تک کے لئے اسلام نے انسان کی تمدنی زندگی کا جو نظام پیش کیا ہے وہ تمام عقلانی تدابیر اور امکا نی مصالح پر حاوی ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسانیت نے پرچم اسلام کے نیچے جو سکون پایا وہ اسے اور کہیں نہ مل سکا۔

اشتراکیت کا نظریہ بھی انہی نظریات میں سے ہے جو سیاست مدنیہ اور ریاست ملکیہ میں اجتماعی نظام زندگی کے لئے اچھے اور موثر اصول نافذ کر کے انسانی افراد کے لئے امن و آشتی کی راہیں ہموار کرے ۔ اس کا بنیادی نقطہ نظریہ ہے کہ دنیا کی ہر شے ہر ایک کے لئے ہے اور ہر چیز میں ہر فرد برابر کا شریک ہے ۔ اس نظریے میں صرف انسان کا حیواناتی پہلو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس کے امتیازی نشان کو سرے سے نظر انداز کیا گیا ہے کیونکہ ہر شے کا ہر ایک کے لئے ہونا مسلم طور پر حیوانی متخیلات میں سے ہے حیوان کے نظریے میں زمین کی کسی پیداوار پر شخصی ملکیت کا دعویٰ ناجائز ہے وہ ماکول و مشروب اور ازدواجی تعلقات کے معاملہ میں تخصیصات کے دشمن ہیں لیکن بخلاف اس کے انسان میں عقل و ادراک کا جوہر اور شعور و امتیاز کا ملکہ جو حیوانی زندگی میں اشتراک کی نظریے کو خوب سمجھتا ہے

اس نے شخصی ملکیت کے نظریہ کو اپنایا اور عقلائے زمانہ اسی نظریہ کے ماتحت تمدن و اجتماع کی اصلاح و فلاح کے لئے ہمیشہ سے قوانین مرتب کر کے نافذ کرتے رہے۔

لیکن انسان خواہ کس قدر دانا اور دانشمند ہی کیوں نہ ہو انسانی اجتماعی زندگی کے اچھے اور بُرے تمام پہلوؤں پر محیط نہیں ہو سکتا۔ لہذا نہ وہ ہمیشہ آمد و خرابی کا سد باب کر سکتا ہے اور نہ ہر امکانی مصلحت و خوبی کے نفاذ کا پروگرام تیار کر سکتا ہے کیوں کہ انسان کے انفرادی و اجتماعی جمہلہ مصالح و مفاسد پر کلی اطلاع اس کے دائرہ امکان سے باہر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عقلائے زمانہ کے وضع کردہ قوانین ہر دور میں تسخ و ترمیم کی زد میں آتے رہے اور ایک وقت میں جو قانون انتہائی سوچ بچار اور بحث و تمیص کے بعد مبنی بر اصلاح قرار پا کر نافذ ہوا وہی چند دنوں کے بعد رومی ناقص اور نقصان دہ ثابت ہو کر منسوخ ہو گیا اور جو قانون ساز اسمبلی اُسے چار دن پہلے مفید سمجھ کر نافذ کر رہی تھی۔ وہی اسمبلی اس کے پیش آمدہ نقصانات سے مطلع ہو کر اُسے منسوخ کر کے ملک بدر کرنے کا حکم صادر فرما رہی ہوتی ہے اور اس جوڑ توڑ کے سیلاب رواں کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔

اور اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ہر متقن اپنے ذاتی جذبات و رجحانات کے ماحول میں تمدن کی اصلاح سوچتا ہے اور متعدد افراد کے جذبات و رجحانات میں وحدت و یگانگت بھی نہایت مشکل ہے۔ پس ایک دور میں جب یک گونہ جذبات میں اکثریت آگئی تو اقلیتی جذبات ان کے سامنے اختیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے اور قانون و د پاس ہوا جو اکثریتی خواہشات کا آئینہ دار تھا اور اسے اجتماعی قانون قرار دیا گیا پھر تھوڑے عرصہ بعد جب اقلیت اپنے اثر و رسوخ سے یا معقول رد عمل سے اکثریت کا روپ دھارنے میں کامیاب ہو گئی تو سابق پاس شدہ قانون کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے دوبارہ مجلس مشاورت کے انعقاد کی دعوت دی گئی اور اکثریتی خواہشات کا ترجمان قانون سابق قانون کی جگہ مسند اقتدار پر براجمان ہو گیا اور عوام کی حیثیت بے بس جھڑوں کی سی ہوتی ہے جب پہلے قانون کی لاشی سے ان کو ہانسا جاتا رہا تو ان میں سر اٹھانے کی مجال نہ تھی اب جو دوسرے قانون کی لاشی ان کے سروں پر بلند ہوئی تو وہ ویسے کے ویسے سمجھے ہوئے نظر آئے۔ پس قانون تمدن جذبات کے اکثریتی میلان کا نام ہے خواہ اکثریت ہو یا ملکیت اور جمہوریت ہو یا شخصیت۔ قانون سازی کی رفتار اتنی ہی سوج پر رہی ہے اور اظہار یہ کہ ہر طاقت و رجاعت کی طرف سے ذاتی مفاد کی خاطر اور اپنے تئیں اس کی زد سے بچانے کی خاطر قانون میں بعض شقیں ایسی رکھ دی جاتی ہیں جو بوقت ضرورت کام میں لائی جاسکیں۔

اشتراکیت ایک مضبوط آہنی پنجرہ ہے جس میں تمام انسانوں کو بے بس پرندوں کی طرح بند کر لیا جاتا ہے اور ہر ہر اقتدار گروہ کو اس پنجرہ سے باہر اس کا نگراں سمجھا جاتا ہے بس قانون اشتراک کے پنجرے کی تاروں میں محبوس انسان حیوانیت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا ہے اور جس کے ہاتھ میں وہ پنجرہ ہے وہ ہر حیثیت سے آزاد ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اچھے محل - عمدہ بیویاں - خوبصورت لباس، اعلیٰ مشروبات نفیس کھانے آرام دہ سواریاں اور قیمتی سامان آرائش پر صاحبان اقتدار کی اجارہ داری قائم رہتی ہے اور انہی لوازم زندگی میں سے رومی اور ناقص اشیاء عوام کے لئے ہوتی ہیں اور اس کھلے ہوئے فرق کے باوجود اعیان اشتراک بباغکِ دل اعلان بھی کرتے ہیں کہ ہر شے ہر فرد کے لئے ہے اور ہر انسان کو مساوی طور پر حقوق ملنے چاہئیں اشتراکیت یا جمہوریت یا آمریت یا شخصی سلطنت کے اندر عمومی اجتماعی زندگی سے وابستہ جملہ تمدنی قوانین میں مذکورہ کمزوریوں کی واحد وجہ یہ ہے کہ اصلاح تمدن کا مرکزی نقطہ نظروں سے غائب اور قانون تمدن کی اصل اساس آنکھوں سے اوجھل ہے اور وہ یہ کہ انسانی زندگی کی فلاح صرف اسی چند روزہ حیات فانی میں مرکوز سمجھی جاتی ہے اور عقیدہ توحید اور تصور مبادی و معاد کو یکسر نظر انداز کیا جاتا ہے اسلامی آئین کا دائرہ اسی فانی دور تک محدود نہیں بلکہ اُخروی زندگی اس کا حقیقی مطلع نظر ہے اور دنیاوی زندگی اس کے لئے ایک عبوری دور ہے پس اسلام اس عبوری دور کی اصلاح اُس باقی و غیر فانی زندگی کے لئے ضروری سمجھتا ہے کیونکہ وہی انسان کے سکون کی حقیقی منزل ہے۔ پس اسلام انسانی زندگی کے ہر شعبے میں حدود کو معین کرتا ہے اور چونکہ وہ خدائی قانون ہے لہذا ہر انسان خواہ چھوٹا ہو یا بڑا کمزور ہو یا طاقتور حاکم ہو یا محکوم اور ادنیٰ ہو یا اعلیٰ سب کے لئے ان حدود سے تجاوز کرنا ناجائز ہے۔ پس قانون خداوندی میں حلال و حرام اور جائز اور ناجائز کا فرق ہے۔ اسلام خواہشات و جذبات کو پنسنے کی کھلی اجازت نہیں دیتا بلکہ حدودِ متعینہ کی پابندی کا فرض عائد کرتے ہوئے اُسے ترقی کے میدان میں آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام آزادیِ ضمیر پر پور نہیں بٹاتا بلکہ اُسے جائز طریقہ اور صحیح راستہ سے سوچنے اور کرنے کی کھلی اجازت دیتا ہے اور دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دے کر انسانی جذبات کو کچلتا نہیں بلکہ جذبات کے لئے صحیح خطوط معین کر کے اپنے اختیار سے ان خطوط پر کامزن ہونے کی دعوت دیتا ہے جو درحقیقت اس کے لئے نفع بخش اور فائدہ رساں ہوتے ہیں اور انہی کی پاسداری میں تمدن انسانی کی کامیابی کا حقیقی راز مضمر ہوتا ہے اور اجتماعی زندگی پر سکون ماحول میں گذر سکتی ہے پس انسان اُخروی زندگی پر نظر رکھتے ہوئے جذبات و خواہشات کی بڑی سے بڑی قربانی دینے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے اور جذبات و بیجانیت پر کنٹرول کرنا باہمی تصادم سے بچا کر انسان کی زندگی کو پرسکون بنا دیتا ہے اور اسلامی نظریہ کے

ماحت پر ہوا اپنے چہرے پر جو کڑا سیکتا ہے اور بر طاقور کمرور کی دست گیری کے جذبہ کو اپناتا ہے لہذا باطنی ثابت دلائل میں اضافہ ہوتا ہے چھوٹے کی بڑے سے اور کمرور کی طاقور سے دوستی بڑھتی ہے اور یہی تمدنی زندگی کا کامیاب باب ہے بلکہ انسانیت کا اسے معراج کہا جاسکتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں غرباء طبقہ کے حقوق کی پامالی اسلامی نظریہ سے سخت متصادم ہے۔ اور اشتراکی طرز عمل میں طاقور کو طاقت سے محروم کر کے اور دولت مند سے دولت غصب کر کے ان کو غرباء کے مساوی کرنا اسلامی تعلیم کے خلاف ہے کیونکہ اسلام تو ایک ایسا عادلانہ اور منصفانہ نظام حیات پیش کرتا ہے جو پوری انسانیت کی اصلاح کا راز اس کے اصولوں میں مضمر ہے۔ اسلام نے سرمایہ دار کے مال میں غرباء کے حقوق مقرر کر دیے ہیں اور ہم ادائیگی کی صورت میں جہاں اُسے دنیا میں اسلامی حکومت کے سامنے جوابدہ ہونا پڑتا ہے اس سے کہیں زیادہ اس کو روزِ محشر کی سزا کا خوف دلایا جاتا ہے۔ اور اپنے اختیار سے غیرات و سخاوت کا راستہ اختیار کرنے والے کے لئے جنت کی پیش کش کی جاتی ہے تاکہ انسان اپنی آزاد مئی ضمیر کو برقرار رکھتے ہوئے اشیاء و سخاوت کے جذبہ سے غرباء پروری کے فریضہ سے سبکدوش ہو کہ غرباء کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے اہل ہو۔ طاقت ور اور دولت مند کو طاقت و دولت سے محروم کر کے مساوات و اشتراک کا علم بلند کرنے میں غریب طبقے کی ہمدردیاں حاصل کرنے سے زیادہ حسد و کینہ کے جذبات کی تکمیل کا راز مضمر ہوتا ہے لہذا اسے انسانیت کی صحیح خدمت نہیں کہا جاسکتا۔ پس اسلامی آئین ہی انسانیت اور تمدن کا وہ جامع قانون ہے جس کے اپنائے بغیر کبھی چین و امن کا سانس نصیب نہیں ہو سکتا۔ اور اسلامی مساوات یہ نہیں کہ صاحبانِ ثروت کی دولت چھین کر ان کے معیارِ زندگی کو گھٹا کر ان کو غریبوں جیسا کر کے سب انسانوں کو غربت و افلاس کے شکنجے میں جکڑ دیا جائے بلکہ اسلامی مساوات یہ ہے کہ غرباء طبقہ کے لئے ترقی کی راہیں ہموار کی جائیں اور بلند طبقہ کی چہرہ دستیوں سے ان کو آزا کر کے ان کا معیارِ زندگی بلند کیا جائے تاکہ سب انسان احساسِ کثرتی سب سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کے دوش بدوش چل سکیں۔

قرآن مجید جو فلاح و اصلاح انسانی پر مشتمل مکمل ضابطہ حیات اور دستورِ زندگی قرآنی ہدایات ہے اس کی تعلیمات کا بنیادی عقیدہ توحید ہے۔ قرآن مجید میں بار بار مختلف طرق استدلال سے عقیدہ توحید کو مستحکم کیا گیا ہے کہ کل کائنات کا خالق مدبر صانع و موجد اللہ ہے جو پوری کائنات کی خلقت صنعت تدبیر و احکام میں یکا و تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور وہی اپنی ساری مخلوق کا واحد فرمانروا مدبر و منتظم ہے اور اس کی حکومت میں نہ کسی کا حصہ ہے اور نہ کسی کا کوئی

حق ہے اس کے ماسوا سب مخلوق اس کی محتاج اور اس کے سامنے نیاز مند ہے۔

۱ هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (انعام) وہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔

۲ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (رعد) کہہ دیجئے اللہ ہر شے کا خالق ہے۔

۳ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ وہ وہی ہے جس نے ہمارے لئے وہ سب چیزیں پیدا کیں جو زمین میں ہیں۔

۴ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (البقرہ) وہ جس نے تم کو پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔

۵ لَهُ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اسی کی ملکیت میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

۶ یَدْبِرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ (السجدہ) آسمان سے زمین تک سب کی تدبیر وہی کرتا ہے۔

۷ قُلْ اِنَّ اَمْرًا كُلَّهُ لِلّٰهِ۔ کہہ دیجئے امر (اختیار) سب اللہ کے پاس ہے۔

۸ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ ۝ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ (انعام) وہی اپنے بندوں پر غالب اور دانا و بینا ہے۔

آیات قرآنیہ کے گنوائے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ نظام کائنات میں کلی حکومت اسی ذات واجب الوجود کو حاصل ہے اور عالم کا پورا تکنیکی نظام اسی کی حکومت کے ماتحت چل رہا ہے۔ باقی رہا انسانی زندگی کا شرعی نظام اور تمدنی و انفرادی پروگرام تو اس میں بھی عقلی طور پر ثابت کیا جا چکا ہے کہ اللہ کی حکومت کے سوا کوئی بھی حکومت سکون و اطمینان کی موجب نہیں بن سکتی پس انسانی زندگی کے اختیاری اعمال و کردار اور اجتماعی یا انفرادی افعال و اعمال کے لئے ضابطہ حیات اور قانون تمدن اسی ذات کا ہی وضع کردہ ہو جو تمام مصالح و مفاسد پر علم کلی و بصیرتِ تامہ رکھنے کی اہل ہے اور انسانیت بھی اپنے معراج کمال پر اس وقت پہنچ سکتی ہے جب اپنے خالق و مالک کے پیش کردہ ضابطہ حیات کو اپنی زندگی کے لئے مشعل راہ قرار دے اور قرآن مجید نے اس بارے میں واضح اور غیر مبہم اعلان فرمایا ہے۔

اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ اَمْرًا اَنْ لَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیْمُ۔

تم اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں سب اس کا امر ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور یہی صحیح دین ہے (یوسف)

اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ - پیروی کرو اس کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتاری گئی اور اس کے علاوہ دوسرے اولیاء کی پیروی نہ کرو۔ (الاعراف)

فَلْيَكُ حُدُودَ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (البقرة) یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں ان سے نہ بڑھو اور جو لوگ اللہ کی مقرر کردہ حدود سے بڑھیں، وہی ظالم ہیں۔

اسی طرح ان حکمرانوں کو کافر ظالم اور فاسق کہا گیا ہے جو اللہ کے حکم کے مطابق فیصلے نہ کریں۔

وَمَن لَّمْ يَجْعَلْهُمَ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (المائدہ)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ فرمان کے مطابق حکم نہ کریں وہ کافر ہیں۔

وَمَن لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (المائدہ)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ امر کے مطابق حکم نہ کریں تو وہ فاسق ہیں۔

جب یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ بندوں پر حق حکومت صرف اللہ کو حاکم کی تعیین ہی ماسل ہے جو کل کائنات کا حاکم و مدبّر ہے اور اسی کا حکم ہی ایسے پائیدار اصولوں پر مبنی ہو سکتا ہے جن میں کما حقہ انسانیت کی فلاح و اصلاح اور بقا و ارتقا کا راز مضمر ہو۔ اور اسی کی حکومت کے سامنے میں ہی بنی نوع انسان امن و چین اور سکون و اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں اور اسی کے عین کردہ نظام حکومت کے ماتحت ہی عدل و انصاف کا بول بالا ہو سکتا ہے اور ظلم و استبداد اور جور و اعتساف سے انسانیت کو بچٹکا رامل سکتا ہے۔

تو بس نظام حکومت بنجانے اور قائم کرنے کے لئے اللہ کی جانب سے نیابت کا حق اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جس کو اللہ خود نازل فرمائے۔ اور جس طرح خدائی نظام کے ہم تک پہنچنے کا ذریعہ خدا کا رسول ہے اسی طرح اس نظام کا نگران بھی اسی کو ہی ہونا چاہیے پس رسول کو خدا کی جانب سے حکومت میں نمایاں ہونے کی حیثیت حاصل ہے لہذا اس کا حکم عین حکم خدا اس کی اطاعت عین اطاعت خدا اور اس کی نافرمانی عین نافرمانی خدا کی اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کی وضاحت موجود ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بَاذِنَ اللَّهِ رِشَاءَ

اور ہم نے کوئی رسول بھیجا مگر اس لئے کہ باذن خدا اس کی اطاعت کی جائے۔

۲ وَمَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (نساء)

اور جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

۳ وَمَا أَنْتُمْ إِلَّا بِمَنْعٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَأَتَقُوا اللَّهَ فِي مَا كُنْتُمْ تَكُونُونَ (حشر)

اور جو کچھ تمہیں رسول دے پس لے لو اور جس سے تم کو روکے پس رک جاؤ۔

۴ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِي مَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (نساء)

تیرے رب کی قسم وہ ہرگز دعوے ایمان میں سچے نہیں ہو سکتے جب تک کہ تجھے اپنے باہمی جھگڑوں میں حاکم تسلیم نہ کریں اور پھر جو تو فیصلہ کر دے اس پر اپنے دلوں میں حرج بھی محسوس نہ کریں اور اسے اس طرح تسلیم کر لیں جس طرح تسلیم کرنے کا حق ہے۔

۵ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونُوا لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ صُلًى سَبِيلًا (الاحزاب)

کسی مومن مرد و عورت کو حق نہیں پہنچتا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو ان کا اس معاملہ میں کچھ اختیار باقی رہ جائے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے۔ وہ ظاہر نظر گمراہ ہے۔

۶ وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِنْهُمْ مِمَّنْ بَعْدَ ذَلِكَ وَمَا أُولَئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ مُعْرِضُونَ (النور)

اور وہ کہتے ہیں ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور اطاعت قبول کی پھر ایک فریق ان میں سے اس کے بعد اعراض کر لیتا ہے۔ ایسے لوگ مومن نہیں ہیں اور جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف بلایا جائے تو ان میں سے ایک فریق اعراض کرتا ہے (اس جگہ ان ایمان کے دعوتی کرنے والوں کی صریح مذمت ہے جو حکومت الہیہ کے فیصلوں سے گریز کریں جو اللہ کی طرف سے غمانیدگی کرتے ہوئے اس کے رسول نے سنائے۔)

۷ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (النور)

سوائے اس کے نہیں ایمان لانے والوں کا قول تو یہ ہوتا ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کی طرف بلا جائے تو کہہ دیں کہ ہم نے سنا اور مانا اور ایسے لوگ ہی چھکارا پانے والے ہیں (اس جگہ ان سچے ایمانداروں کی مدح ہے جو اللہ کے نمائندہ رسول کے حکم و فیصلہ کے آگے تسلیم خم کر لیں) ۸

فَحُكْمَ بَنِيهِمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ (المائدہ ۸)

(حضور کو حکم ہے) کہ جو اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق تم لوگوں میں حکم کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

۹ يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص)

اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا پس لوگوں کے درمیان حق کا فیصلہ کرو۔

سابق بیان اور آیات متذکرہ سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ انسانیت کی متوازن بقا کے لئے اسلامی آئین کیوں ضروری ہے اور اسلامی حکومت کے وقوع اور نفاذ کی ضرورت کیوں ہے؟ کیوں کہ اسلام صرف چند کلمات کی زبانی رٹ لگانے کا نام نہیں اور نہ صرف چند رسمی اعمال کی بجا آوری تک اس کی تعلیم محدود ہے بلکہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو خدا کے احکام کے مطابق گزارنے اور خدائی نظام حکومت سے ہر ممکن تعاون کا نام اسلام ہے۔ چنانچہ سورہ عصر میں صاف اعلان ہے وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ عصر کی قسم۔ انسان خسارے میں ہے مگر وہ جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں۔ ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت کریں اور صبر کی تلقین کریں۔ سورہ مجیدہ میں ہر انسان پر چار قسم کے فرائض سے عہدہ برآ ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے جن کے بغیر انسانیت خسارہ سے نجات نہیں پاسکتی۔

۱ ایمان۔ اللہ اور اس کی توحید پر ایمان انسانی کامیاب و فتح مند زندگی کا بنیادی نقطہ ہے۔ پس انسان کو چاہیے کہ اس کی حکومت کو تسلیم کرے اور اس کی جانب سے جملہ نمائندگان انبیاء و رسل پر ایمان لائے اور اللہ کا رسول جو عقائد پیش کرے ان کو من و عن تسلیم کرے۔

۲ عمل صالح۔ جب انسان نے اللہ کی توحید پر ایمان کو مستحکم کر لیا تو اس پر لازم ہے کہ زندگی کے جملہ لوازم میں اسی کی رضا کو ملحوظ رکھے پس اعمال نفس امورِ خانگی اور حقوق معاشیہ میں اپنے آپ کو مطلق العنان اور خود مختار نہ سمجھے بلکہ اس کا ہر عمل ہر قول اور ہر اقدام اللہ کے جاری کردہ قوانین کی بندشوں میں گھرا ہوا ہو اور اس کی معین کردہ حدود سے تجاوز نہ کرے۔

۳۔ وصیتِ حق۔ اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض داخل ہیں یعنی خود بھی اپنی زندگی کو اسلامی آئین کے سانچے میں ڈھالے اور اپنے دائرہ اثر و رسوخ تک اسلامی تعلیمات کی ترویج میں تاحد امکان حصہ بھی لے پس لوگوں کو ہر بھلائی پر آمادہ کرے اور ہر برائی سے ان کو روکے خواہ اس کا تعلق نفسِ فاعل سے ہو یا خارجی اصلاح سے ہو یا معاشرتی زندگی سے ہو پس حکومتِ اسلامیہ سے ہر ممکن تعاون اور قوم و ملت سے عملی و لسانی خدمت ہر انسان کے فرائضِ زندگی میں شامل ہے۔

۴۔ وصیتِ صبر۔ مشکلاتِ مصائب کے مقامات میں خود بھی صبر کا دامن تھامے رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرے تاکہ فساد و غلط کاری کی طرف اقدام نہ ہو اور جہاں دوسروں کے جذبات ابھرے ہوئے ہوں وہاں بھی صبر و ضبط کی تلقین کر کے معاشرہ کی اصلاح کا فرض ادا کرے تاکہ ظلم و جور اور فساد و اختلافات کی بجائے انسانوں میں صلح و آشتی کی فضا پیدا ہو جائے۔ وصیتِ حق کے بعد وصیتِ صبر کا ذکر اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وصیتِ صبر وصیتِ حق کی فرع ہے کیونکہ جو لوگ اعلائے کلمہ حق کو اپنا شعار بنائیں انہیں نا اہلوں کی جانب سے ہر قسم کے مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہذا اس قسم کے صبر آزمائیاں ہیں صبر و استقلال کا دامن تھامے رہنا اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرنا ان کے فرائض میں شامل ہے جس طرح کہ پہلے فقرہ میں عملِ صالح کو ایمان کی فرع قرار دیا گیا ہے۔

اگر انسانی معاشرہ کا ہر فرد خدائے حکیم کے پیش کردہ اس چار نکاتی پروگرام کو اپنی زندگی کے سفر کے لئے شعل راہ قرار دے کر آگے بڑھتے تو کیوں نہ انسانیت حقیضِ ناسوت سے بلند ہو کر اوجِ ملکوت سے ہمکنار ہونے کی سعادت حاصل کرے؟

اسلامی حکومت کا سربراہ جب انسانی معاشرہ کا ہر فرد یک گونہ ذمہ داریوں میں گھرا ہوا ہے تو حکومتِ اسلامی کا سربراہ وہ شخص ہو سکتا ہے جو ان ذمہ داریوں سے خود بھی عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت و جرات رکھتا ہو اور تمام مصالح و مفاسد سے پوری طرح خبردار ہوتے ہوئے حکمِ خداوندی کے نفاذ میں بلند ضمیر بلند مہمت اور بلند کردار کا مظاہرہ کر سکے۔ وہ خدا کی جانب سے وضع کردہ انسانی ضابطہ حیات کی ہر جزئی کا پورا قدردان ہو اور اس سلسلہ میں ذاتی اغراضِ نفسی مقاصد اور ماحول کے رویے اس کے ارادوں پر حاوی نہ ہو سکیں اور وہ اللہ کے حکم کے نفاذ میں بلا لومہ لائم بلند حوصلگی کا مظاہرہ کرے اور ایسا شخص جو جذباتِ انفسیہ اور وابشاتِ ذاتیہ کی سطح سے بلند ہو کر فلاح و اصلاحاتِ انسانیت کی خاطر مسندِ اقتدار پر قدم رکھے وہ وہی ہو سکتا ہے جس کو اللہ زیرِ عصمت اور خلعتِ مہارت سے آراستہ فرمانے اور وہی حکومتِ اسلامیہ کا سربراہ اور خدا کی جانب سے نامزد و نمائندہ ہوگا۔

پس خدا کا رسول ہی ایسی حکومت کے سنبھالنے کا اہل ہے یا وہ جس کو خدا کا رسول اپنے بعد کے لئے نامزد کرے کیوں کہ خدا کا رسول چونکہ جذبات و خواہشات سے بلند ہو کر اسلامی نظام کا سربراہ اور

اس کا محافظ و نگہبان ہوتا ہے لہذا وہ اپنے بعد کے لئے ایسے ہی فرد کا انتخاب کرے گا جس کو اسلامی نظام کے نفاذ و استحکام کے متعلق تمام تر ذمہ داریوں سے عہدہ براہونے کے لائق سمجھے گا۔ اور اس کے بعد یہ سلسلہ نامزدگی سے ہی انجام پاتا رہے گا۔

ارشادِ خداوندی ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ** (نسا) اسے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں سے اولوالامر ہوں۔

آیت مجیدہ میں اللہ نے تمام انسانوں پر حق حکومت کی وضاحت فرمائی ہے کہ اللہ اور رسول اور اولوالامر کو تم پر حق حکومت حاصل ہے اللہ کو نہایت خود اور رسول و اولوالامر کو اس کی جانب سے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے۔ پس مومنوں پر واجب ہے کہ اللہ کی اطاعت کریں اور رسول و اولوالامر کی اطاعت کریں کیونکہ ان کی اطاعت ہی درحقیقت اللہ کی اطاعت و فرماں برداری ہے۔ اور رسول و اولوالامر کی اطاعت کا اللہ کی اطاعت پر عطف و غلظت تفسیری ہے۔

جس طرح اللہ انتخاب سے نہیں بنتا لہذا لوگوں پر اللہ کا بنانا واجب نہیں بلکہ اس کا پہچانا اور اس کو حاکم مان کر اس کی اطاعت کرنا اور اس کے یہ فیصلہ کے سامنے سرنگوں رہنا انسانوں پر فرض ہے اسی طرح رسول انتخاب سے نہیں بنتا پس لوگوں پر رسول کا بنانا فرض نہیں بلکہ اس کا پہچانا اور اللہ کی جانب سے اس کی نمایندگی کو تسلیم کر کے اس کی یہ انفرادی و اجتماعی مسئلہ میں اطاعت کرنا مومنوں پر فرض ہے۔

پس اسی طرح اولوالامر بھی انتخابات سے نہیں بنا کرتے اور نہ لوگوں پر ان کا بنانا ضروری ہے بلکہ باؤن پر ہوگا رسول کی جانب سے نامزد افراد کو پہچانا اور یہ معاملہ میں ان کی اطاعت کرنا صاحبان ایمان کا فرائض ہے۔

آیت مجیدہ میں رسول اور اولوالامر کی اطاعت کا مطلق اور بلا استثناء حکم دیکھو قرآن مجید نے واضح کر دیا ہے کہ جس طرح رسول کے حکم میں غلطی یا کسی فرد کی اشتباہات کہ امکان نہیں ہوتا اسی طرح اولوالامر بھی، جس طرح کسی حکم میں غلطی کا امکان نہ ہو اور رسول کی طرح اولوالامر کو بھی اشتباہات و خواہشات نفسانیہ کی غلطی سے بلند نہ بنانا چاہیے۔ ورنہ اگر ان میں اشتباہات و خواہشات کی انتساب کا امکان ہوتا تو خدا کی جانب سے ان کے مطلق فرماؤں کو ماننے کا امکان نہ ہوتا اور عوام الناس کو جو ان کی اطاعت کا حکم نہ دیا جاتا بلکہ حکم اس طرح ہوتا کہ تم سے اولوالامر اگر خدا اور رسول کے احکام کے

مطابق تم کو حکم دیں تو ان کی اطاعت کرو ورنہ جذبات و خواہشات کی رو میں بہ کرنا جائز اور حرام کا حکم دینے والے حکمرانوں کے خلاف احتجاج کرو اور کلمہ حق کو بلند رکھو۔ پس خدا نے چونکہ بلا استثناء رسول کی طرح اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسول کی طرح اولوالامر بھی خدا کی حکومت میں اس کی پوری طرح نمایندگی کے اہل ہیں اور ان کا حکم خدا کا حکم اور ان کی نافرمانی خدا کی نافرمانی اور ان کی اطاعت خدا کی اطاعت شمار ہوتی ہے پس جس طرح انتخابات سے کسی کو رسالت کا عہدہ دستیاب نہیں ہو سکتا اسی طرح چناؤ سے رسول کی نیابت اور حکومت الہیہ میں نمایندگی کا عہدہ بھی نہیں مل سکتا۔

پس انسانوں پر حق حکومت صرف اللہ کو حاصل ہے اور اس کی طرف سے نمایندہ اس کا رسول حکومت اسلامیہ کا سربراہ ہو سکتا ہے اور رسول کے بعد حکومت اسلامیہ کا سربراہ وہی ہو سکتا ہے جو انسانیت کی قدروں سے صحیح واقف ہو اور اللہ کی جانب سے حکومت کی نمایندگی کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور ایسے شخص کا علم رسول کے نامزد کرنے سے ہو سکتا ہے نہ کہ الیکشن سے۔ کیونکہ الیکشن خواہ کس قدر ہی نیک نیتی سے ہو اور افراد انسانہ میں اچھے چناؤ کی اہمیت کا احساس کتنا ہی قوی ہو تاہم کسی کی ظاہری خوبیوں کی بنا پر ہی اسے چنا جائے گا خواہ اس کی باطنی برائیاں ظاہری خوبیوں سے زیادہ ہی کیوں نہ ہوں اور ہو سکتا ہے کہ اس کی باطنی برائیاں بے بسی کے پردہ میں چھپی ہوئی ہوں۔ اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد بے بسی کا پردہ الٹ جانے سے وہ بے نقاب ہو کر اس کی تمام ظاہری خوبیوں کو اپنے وسیع دامن میں پردہ پوش کر دیں۔

پس وہ اللہ جو ظاہری و باطنی جملہ صفات حسنہ و سیئہ سے خبردار ہے وہ ہر شخص کی صالح ضمیری سے کما حقہ واقف ہے لہذا حکومت اسلامیہ کی سربراہی کے لئے موزوں ترین فرد کا صحیح انتخاب وہی کر سکتا ہے پس اس کا رسول اس کے اذن سے جس کا اعلان کرے وہی درست اور بجا ہوگا۔ سب سے پہلے زمین کی پہلی خلافت و حکومت کی تشکیل کا مسئلہ

قرآن میں جمہوریت کی تردید | قرآن مجید میں بار بار دہرایا گیا ہے جب اللہ نے اپنی حکمت و مشیت سے آدم کو نامزد فرمایا تو فرشتوں کے اجماعی بورڈ نے اس پر صدائے احتجاج بلند کی۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (البقرة)

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

قُلُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ

وَنَقَدَّسُ لَكَ (البقرة)

فرشتوں نے کہا کیا ایسے شخص کو زمین میں بناتا ہے جو اس میں فساد و خوریزی کرے گا حالانکہ ہم تیرے تسبیح گزار اور تقدیس بیان کرنے والے ہیں۔

حضرت آدم کے ظاہری خمیر سے ان کو اس سے سرزد ہونے والی امکانی برائیوں کا اندازہ ہو گیا تھا لیکن اس ظاہری خمیر کے اندر باطنی خوبیوں کے اندازہ سے بے خبر تھے پس انہوں نے اپنے ظاہر کی خوبی جتلا کر آدم کے ظاہری سقم کی بنا پر زبان احتجاج کھولی اور دبی زبان سے اپنا استحقاق پیش کیا لیکن خدا نے اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے کہہ کر ان کو خاموش کر دیا اور مقام امتحان میں کھڑا کر کے آدم کی باطنی خوبی جو ہر علم کو ظاہر کیا پس فرشتوں کو اس باطنی مصالحت سے خبردار کر کے آدم کے سامنے سجدہ ریز اور سرنگوں ہونے کا حکم صادر فرمایا اور خلافت و حکومت کے لئے یہ معیار واضح کر دیا کہ میں ظاہر و باطن کی جملہ مصالحتوں کو خوب جانتا ہوں۔ لہذا میرے فیصلہ پر کسی کو احتجاج کرنے کا کوئی حق نہیں ہے فرشتوں نے آدم کے سامنے جھک کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور ہمیشہ کے لئے اپنی خواہش سے دستبردار ہو گئے۔

۲ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جب بنی اسرائیل گرد و نواح کے سلاطین کے جوہر و استبداد سے تنگ آئے تو انہوں نے اپنے دور کے بنی سے حکومت کے سربراہ کے تعین کی درخواست کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے وہ انتخابی تجربہ کر چکے تھے جو انہیں اس نہیں بٹھینا تھا ورنہ وہ داران بنی اسرائیل کو بنی سے درخواست کرنے کی کیا ضرورت تھی آپس میں الیکشن لڑ کر ایک کو اقتدار سونپ دیتے اور دشمن سے نیپٹ لیتے۔

قَالَ لَهُمْ بَنِي إِسْرَءِيلَ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلَكًا قَالُوا إِنَّا يَكُونُ لَكَ أَلَمَاتٌ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمَلَكِ مِنْكَ وَلَمْ يُوْتِ سَعَةً مِنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكًا مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (البقرة)

ان کے بنی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے تو کہنے لگے اس کو تم پر حکومت کہاں سے ہو سکتی ہے حالانکہ ہم حکومت کے اس سے زیادہ سزاوار ہیں اس کو کشائش مال تو دہی ہی نہیں گئی (جی سنے) کہا تحقیق اللہ نے اس کو تم پر چن لیا ہے اور اسے علم و جسم میں زیادہ کیا ہے اور اللہ جسے چاہے اپنی حکومت عطا فرمائے اور اللہ صاحب وسعت و علم ہے۔

دیکھتے اللہ کی جانب سے نبی نے طاوت کا اعلان کیا تو اس وقت کے سیاسی لیڈروں نے
صدائے احتجاج بلند کی اور اپنا استحقاق پیش کیا اور اس کی مالی کمزوری کو محل طعن قرار دیا لیکن نبی نے ان
کی ایک زبانی اور اللہ کے فیصلہ کو بدلنا گوارا نہ کیا اور حضرت طاوت کی باطنی خبریوں کو بیان کیا کہ وہ
علم و جہالت میں تم سب سے زیادہ ہے لہذا وہ ہی حکومت کا اہل ہے نیز اللہ اپنی جانب سے
حکومت کی سربراہی جس کو عطا فرمائے اس کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

۳ جہاں اولوالامر کی اطاعت کا حکم صادر فرمایا۔ ارشاد ہوا۔ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ
إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النساء) پس اگر تمہارا کسی بات
میں جھگڑا ہو جائے تو اللہ و رسول کی طرف اس کو پٹاؤ۔ اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

مرنے والا سرورشن خیمہ انسان اپنے پس ماندگان کے لئے کسی نہ کسی کو سربراہ نامزد کر کے جاتا
ہے تو رسول جو خدا کی جانب سے پورے معاشرہ انسانی کی اصلاح کے لئے حکومت الہیہ کا نمائندہ ہوتا
ہے وہ سارے انسانوں کو بغیر سربراہ کے تعین کے چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اپنی
زندگی میں پوری امت کے لئے سربراہ کو نامزد کر کے جائیں تاکہ پیدا ہونے والے جھگڑے کا سدباب
ہو جائے اور امت پر واجب ہے کہ رسول کی ہدایت کو اپنے لئے مشعل راہ قرار دے۔

خلافت کا انتخاب بجائے خود ایک نزاعی معاملہ ہے اگر اس کا فیصلہ خود رسول کی زبانی ہو جائے
تو ٹھیک ورنہ اگر الیکشن سے اس کا فیصلہ ہو اور ایک امیر و ارکامیابی سے مسند اقتدار پر قابض ہو جائے
تو چونکہ اس کی اندرونی خامیوں کی اطلاع کسی کو نہیں ہوتی لہذا اقتدار کے زور سے اس کے غلط فیصلے بھی
منظر عام پر آئیں گے اور النَّاسُ عَلَى دِينِ مُلُوكِهِمْ (لوگ بادشاہوں کے دین کے تابع ہوتے
ہیں) کے ماتحت اکثریت اس کے بر فیصلے کا نیر مقدم کرے گی اور اس کا نتیجہ بالآخر افسوسناک حالت
میں ہی ظاہر ہوگا۔ چنانچہ مودودی صاحب نے پوری کتاب 'خلافت و ملوکیت' میں اسی کا رونا رویا
ہے کہ جمہوری خلافت رفتہ رفتہ اسلامی تقاضوں سے کنارہ کش ہوتے ہوتے ملوکیت کے روپ میں
رونا جوگئی تو اس ملوکیت کے ذمہ دار و حقیقت وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلامی حکومت کی سربراہی
کے لئے رسول کی نامزد شخصیت کو ہٹا کر من مانے طریقے سے مسند اقتدار پر قبضہ کر لیا اور بالآخر
اسلامی طرز حکومت کی ناکو ٹو لو کے ہی رہے۔

اور اس انتخاب میں ایک غرابی یہ بھی ہے کہ جمہوری فیصلہ ہمیشہ ایک نئے نزاع کو منظر عام پر
لاتا ہے کیونکہ اکثریت کا نمائندہ چونکہ نفسی و خواہشات و جذباتی فطری تقاضوں سے بالاتر تو ہوتا نہیں

لہذا اس کے فیصلوں میں غلطیوں کا ہونا ممکن اور قرین قیاس ہے اور اس کے غلط فیصلوں کو مان لینا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے لہذا حکمران طبقہ اور عوام میں نزاع کا نیا دروازہ کھل جاتا ہے۔ جناب مودودی صاحب د خلافت و ملکیت کے صنف پر رقمطراز ہیں۔

چھٹا قاعدہ جس پر یہ ریاست قائم کی گئی تھی یہ تھا کہ حکومت کی اطاعت صرف معروف میں واجب ہے۔ معصیت میں کسی کو اطاعت کا حق نہیں پہنچتا۔ دوسرے الفاظ میں اس قاعدے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اور حکام کا صرف وہی حکم ان کے ماتحتوں اور رعیت کے لئے واجب الاطاعت ہے جو قانون کے مطابق ہو۔ قانون کے خلاف حکم دینے کا نہ انہیں حق پہنچتا ہے اور نہ کسی کو اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔

اور اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں جن اولوالامر کی اطاعت مطلقہ کا حکم دیا گیا ہے وہ خطائے معصوم ہیں اور عصمت چونکہ باطنی صفت ہے جس کا علم صرف علام الغیوب کو ہی ہو سکتا ہے لہذا امت کے لئے حکومت کی سربراہی کے لئے کسی کو نامزد کرنا اسی کا ہی حق ہے اور باہمی نزاعات کا قلع قمع سوائے اس کے نہیں ہو سکتا۔

اللہ کا رسول ہمارے نزدیک سوال کی حیثیت صرف مذہبیات میں راہنمائی تک محدود نہیں بلکہ وہ انسانیت کے مصلح اعظم تھے وہ اصلاح نفس۔ تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ کے جملہ شعبوں میں انسان کے لئے رہبر کامل تھے وہ جہاں اخلاق و کردار میں انسان کو حیوانیت کی سطح سے اٹھا کر اوج رفعت کے بلند ترین کنگروں پر لے جانے کا پروگرام لے کر آئے تھے۔ وہاں اصلاح و فلاح معاشرہ تمدنی اصول اور سیاسی تنظیم کے ذریعے سے انسانوں کیلئے پرامن و پرسکون زندگی بسر کرنے کی دعوت بھی لے کر آئے تھے وہ جس طرح مسلمانوں کے اندرونی معاملات میں قائد و پیشوا تھے اسی طرح خارجی و سیاسی امور میں بھی وہ پادری و مرشد تھے پس دینی و دنیاوی ہر دو اقتدار کی مسند کے مالک تھے اور ان کا فیصلہ ہر حیثیت سے واجب الازعان اور واجب الاتباع تھا۔

لہذا ان کے بعد مملکت اسلامیہ کا سربراہ وہی ہو سکتا ہے جو ہر دو لحاظ سے موزونیت تامہ رکھتا ہو۔ پس جہاں وہ سلطنت ملکیہ اور سیاست مدنیہ پر کنٹرول کرنے کا اہل ہو۔ وہاں اپنے نفس کے جذبات و خواہشات پر بھی پوری طرح قابو پاسکتا ہو تاکہ اس کا کوئی فیصلہ اور کوئی اقدام جذبات ذاتیہ کا ترجمان نہ ہو اور اس کا ہر سانس ملک و ملت کی فلاح و بہبود کا غماز و عکاس ہو۔ نیز وہ قرآنی علوم کا ماہر ترین فرد ہو تاکہ مسند اقتدار کے ساتھ ساتھ وہ مسند علم کا بھی مالک ہو اور

جس طرح رسول کے لئے ضروری ہے کہ اپنی پوری امت سے اہم و افضل و اکمل ہو۔ اسی طرح اس کے بعد امت کے سربراہ میں ان اوصاف کا ہونا ضروری ہے تاکہ رعایا صرف اس کے اقتدار کے خوف سے سچی ہوئی نہ ہو بلکہ اس کے علمی و عملی تفوق کے پیش نظر بدل و بان اس کی قدردان بھی ہو۔ اور وہ اس کو اپنا دینی و اسلامی ہادی بھی سمجھتی ہو۔ پس اس کی اطاعت خدا و رسول کی اطاعت سمجھی جائے اور اس کی نافرمانی خدا و رسول کی نافرمانی قرار دی جائے۔

مسلم شیعہ کی رو سے جناب رسالت مآب کے بعد پوری امت میں حضرت علی علیہ السلام ہی وہ شخصیت ہے جس کو دینی و سیاسی ہر لحاظ سے امت کے لئے رہبر کامل اور مصلح اعظم قرار دیا جاسکتا ہے پس وہی رسول کی مسند کا صحیح وارث اور امت اسلام کا حقیقی قائد اور حکومت الہیہ میں خدا و رسول کی جانب سے صحیح نمائندہ ہے اور اس کی اطاعت خدا و رسول کی اطاعت اور اس کی نافرمانی خدا و رسول کی نافرمانی ہے اور حجۃ الوداع سے واپسی پر جناب رسول کریم نے باذن خدا ان کی نامزدگی کا اعلان فرمادیا تھا اور بالتواتر یہ روایت کتب اہل سنت سے ثابت ہے حتیٰ کہ بعض متعصب مزاج مثنیٰ علماء نے بھی حدیث غدیر کا اعتراف کیا ہے اور اس کے بعد ہر پہلا امام بعد والے کو نامزد کرتا رہا شیعہ اصطلاح میں نیابت رسول کے عہدہ کو امامت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور آئمہ کی تعداد بارہ ہے اور اسی بنا پر شیعوں کو اثنا عشری بھی کہا جاتا ہے۔

مسلم شیعہ کی رو سے جناب رسالت مآب کی وفات سے ہی اقتدار بٹ گیا دینی اقتدار حضرت علی علیہ السلام کے پاس رہا اور دنیاوی اقتدار پر خلافت کے نام سے ملوکیت نے قبضہ کر لیا پس امامت و ملوکیت کے دو نور استے اسی وقت سے الگ الگ ہو گئے حالانکہ دور رسالت میں قیادت ایک تھی اور رسول کریم اس کے سربراہ تھے۔

جمہوری خلافت | وفات پیغمبر کے بعد منبر رسول کو سنبھالنے اور نیابت نبوی کے عہدہ جلیلہ پر متمکن ہونے کے لئے سفیفہ بنی ساعدہ میں مہاجرین و انصار کے درمیان بحث و کشیدہ ہوا اس میں طرفین کے دلائل کتب سیر و تاریخ میں جلی قلم سے لکھے جا چکے ہیں کافی لے دے کے جب کامیاب ہونے والے امیدوار سے جب حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی اور حضرت علیؑ نے اپنا استحقاق و احتجاج پیش کیا تو اس کے طرفداروں کی طرف سے دلائل میں لاجواب ہونے کے بعد قتل کی دھمکی دی گئی پس آپ کی خاموشی کو دلیل بیعت قرار دے کر اجماع کو نسل کی کاروائی میں اسے حرف آخر کی حیثیت دے دی

گئی۔ اور چونکہ اس طرز عمل کی بنا پر جسے چن لیا گیا اُسے صحیح نائب رسول سمجھ لیا گیا لہذا برسر اقتدار جماعت کی خوشنودی کے پیش نظر مذکورہ طریق انتخاب کو بھی شرعی حیثیت دے دی گئی چنانچہ اہل سنت کا مشہور عالم ابن قتیبہ دنیوری اپنی کتاب الامامۃ والسیاستہ میں رقمطراز ہے۔

پھر (سفیناٹو الیکشن کمیٹی کے فیصلہ کے بعد) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضرت ابو بکر کے پاس لایا گیا تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے۔ میں اللہ کا بندہ اور اس کے رسول کا بھائی ہوں۔ پس آپ سے ابو بکر کی بیعت کے لئے کہا گیا تو آپ نے فرمایا میں تم سے خلافت کا زیادہ حقدار ہوں لہذا تم کو میری بیعت کرنا چاہیے، میں تمہاری بیعت نہیں کروں گا تم نے نبی کریم سے اپنی قراتداری کو بطور دلیل پیش کیا ہے اور ہم سے خود غضب کرنے کو تیار ہو، کیونکہ تمہاری بہ نسبت ہم ان کے زیادہ قرابت دار ہیں۔

کیا تم نے انصار سے یہی بات نہیں کہی کہ چونکہ حضرت محمد ہم میں سے تھے لہذا ہم تم سے اس کے زیادہ حقدار ہیں پس انہوں نے تمہاری بات کو تسلیم کر لیا اور خود دست بردار ہو گئے پس میں تم پر وہی حجت پیش کرتا ہوں جو تم نے انصار پر پیش کی کہ ہم زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی رسول کے زیادہ قریبی ہیں پس اگر تم میں کچھ ایمان ہے تو ہمارے ساتھ انصاف کرو۔ ورنہ تمہارا یہ ظلم دیدہ و دانستہ ہو گا۔ یہ سن کر حضرت عمر بولے بیعت کے بغیر تمہارے لئے کوئی پارہ کار نہیں ہے پس حضرت علیؑ نے فرمایا کہ اس (خلافت کی اونٹنی) کا دودھ تو بھی اچھی طرح نکال لے کیونکہ اس میں تیرا بھی حصہ ہے پس آج اس کی حکومت کو پختہ کر لو کیونکہ کل اسی چیز کو وہ تیری طرف پٹائے گا۔ پس آپ نے فرمایا اسے عمر! بخدا میں تیری بات ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں اور میں اس کی بیعت کرتا ہوں یہ سنتے ہی حضرت ابو بکر بولے اگر آپ ہماری بیعت کرنا پسند نہیں کرتے تو میں مجبور نہیں کروں گا۔

ابو عبیدہ بن جراح (جو ایک نبایت جو نامذہب انسان تھا اور الیکشن کمیٹی کا رکن کہیں تھا) کو سنی اقتدار کی طرف سے وکالت کرتے ہوئے حضرت علیؑ سے یوں مخاطب ہوا۔ اسے ابن عمر، نو نو آدمی ہے اور یہ لوگ تیری ہی قوم کے سن یہ سیدہ بزرگوار ہیں۔ تجھ

میں ان جیسا تجربہ اور معاملہ فہمی نہیں ہے اور میرے خیال میں ابوبکر تیسری بہ نسبت (اس منصب جلیل سے عہدہ برامیونے کے لئے) زیادہ مضبوط صاحب برداشت اور حوصلہ مند ہے لہذا مناسب یہی ہے کہ تم خود دست بردار ہو کر اس معاملہ کو ابوبکر کے ہی سپرد کر دو۔ پھر اگر زندگی رہی اور وقت نے ملت دی تو فضل دین رحمہ اللہ، فہم سبقت اسلامی قیادت، دامادی رسول وغیرہ خصوصیات کی بنا پر تم ہی اس امر خلافت و نیابت پیغمبر کے سزاوار و حقدار ہو (ابو عبیدہ کی تقریر سن کر)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی جوابی تقریر میں ارشاد فرمایا: اللہ سے ڈرو۔ اے گروہ مہاجرین۔ محمدی اقتدار کو اس کے گھر اور مکان سے نکال کر اپنے گھروں اور مکانوں کی طرف نہ لے جاؤ اور اس کے اہل بیت کو اس کے مقام اور حق سے دور نہ کرو جو لوگوں میں واضح ہے پس خدا کی قسم اے گروہ مہاجرین بہ نسبت اور لوگوں کے ہم رسول کی نیابت کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ ہم اس کے اہل بیت بھی ہیں اور منصب خلافت کے سزاوار بھی اس لئے کہ اللہ کی کتاب کا قاری اللہ کے دین کا فقیہ اور رسول اللہ کی سنت کا عالم ہم میں ہے۔ رعایا کا واقف دار ان کے مصائب و مشکلات میں ان کی دستگیری کرنے والا اور ان میں حقوق کو برابر تقسیم کرنے والا خدا کی قسم ہم میں ہی ہے پس تم لوگ خواہشات کے پیچھے نہ جاؤ ورنہ اللہ کے راستہ سے گمراہ ہو جاؤ گے پس حق سے دور تر ہوتے جاؤ گے (ان تمام تقریروں کو سننے اور ان میں موازنہ کرنے کے بعد) بشیر بن سعد انصاری نے منتشر سی تقریر کی پس وہ کہنے لگا: اے علی اگر ابوبکر کی بیعت سے پہلے ہم لوگوں نے آپ کا بیان سن لیا ہوتا تو انصار میں سے دو آدمی بھی آپ کے خلاف نہ ہوتے (یعنی الامارۃ والیاستہ طبع مصرعہ) چاہے

پس یہ مجلس بالیقین ختم ہوئی اور ہر شخص اپنی منزل کی طرف چلا گیا۔ لیکن اقتدار اعلیٰ سنبھالنے کے بعد حضرت ابوبکر کے دل میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کا اختلافی نظریہ خارج بن کر چھپنے لگا اور

۱۔ ابو عبیدہ کی تقریر سے صاف واضح ہے کہ اوصاف ذاتیہ اور خصائص نفسیہ کے لحاظ سے حضرت علی منصب خلافت کے سزاوار تھے اور حضرت ابوبکر میں سوائے سن رسیدہ ہونے کے اور کوئی ذاتی صفت ایسی موجود نہ تھی جس کی بنا پر اس کو اس عہدہ جلیلہ کے لئے موزوں قرار دیا جاتا۔ گویا ایک سوچی سمجھی سکیم تھی جس کو موقع پا کر علی جابر بنہا دیا گیا اور حصول اقتدار کے بعد اس کو شرعی حیثیت دے دی گئی۔

العقاد خلافت کے غیر موزوں طریق کار پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنے والے گوشہ عزلت کو چھوڑتے ہوئے اور مہر سکوت کو توڑتے ہوئے حضرت علی کے ہموا ہو گئے اور جنہوں نے جناب رسالت مآب کی لڑوہ خیر خبر وفات سننے کے بعد اپانک اور غیر متوقع طور پر انعقاد خلافت کا شور سنا اور بدحواسی کے عالم میں شور و غل سے متاثر ہو کر ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بلا سوچے سمجھے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کنندگان کے زمرہ میں شامل ہو گئے تھے ذہن پیغمبر کے بعد حضرت علی کی زبان حق ترجمان سے انعقاد خلافت کے طریق کار پر تنقید سنی کہ اگر نیابت و خلافت رسول کی بنیاد قرا بتداری ہے تو میں تم سے زیادہ قرابت رکھتا ہوں اور اگر ذاتی اوصاف و خصائص اس کا معیار ہیں تو علم قرآن، علم فقہ، علم سنت امور رعایا کی دیکھنا بالمشاہدات میں ان کی دستگیری اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا یہ صفات ہم میں ہی موجود ہیں اور تم لوگ کسی صورت میں ہمارے ہم پلہ نہیں ہو سکتے چنانچہ سرکاری وکیل ابو عبیدہ جراح نے بھی اس امر کا اعتراف کیا کہ حضرت علی ہی معیار خلافت پر پورا اترنے والے ہیں اور ابوبکر کو سن رسیدہ ہونے کی بنا پر ہی اقتدار سونپ دیا گیا پھر جو نہی وقت گذرنا گیا حقیقت کا چہرہ بے نقاب ہوتا چلا گیا پس لوگ انتخاب کے طریق کار سے بیزار ہوتے گئے اور دھڑا دھڑا حضرت علی کے ہموا ہوتے گئے یہاں تک کہ حضرت علی کے مکان کو کرسی اقتدار سے اختلاف رائے رکھنے والے صحابہ کے لئے مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی لیکن کرسی اقتدار کے پاسبانوں کے لئے یہ چیز ناقابل برداشت تھی کیونکہ اس میں زوال اقتدار کا خطرہ یقینی تھا اور اس اختلاف کو دلائل سے تو ختم نہیں کیا جاسکا تھا پس تشدد کے ہاتھوں سے اس اختلاف کو دبا دینے کی تجویز پر غور کیا گیا۔ ابن قتیبہ دینوری نے اس معاملہ کے چہرہ سے نقاب کشائی اس طرح کی ہے۔

کیف كانت بيعة علي بن ابي طالب كرم الله وجهه۔

جن لوگوں کو ابوبکر کی بیعت سے اختلاف تھا معلوم ہوا کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے گھر میں جمع ہیں پس ان کی طرف غم کو روانہ کیا چنانچہ اس نے پہنچ کر ان کو بلایا اور وہ واقعا حضرت علی کے گھر میں تھے لیکن انہوں نے باہر آنے سے انکار کر دیا پس اس (عمرانے) کڑیاں منگوائیں اور قسم کھا کر کہا سکو ورنہ میں اس گھر کو ان تمام آدمیوں سمیت جو اس میں گھسے ہوئے ہیں جلا دوں گا۔ کسی نے کہا اے ابوجہل (عمرانے) اس گھر میں تو جناب فاطمہ بھی موجود ہے کہنے لگے جو تو ہوا کرے پس اس شدید دھمکی سے متاثر ہو کر حضرت علی

نے یہ خط صحابہ کے دونوں میں آں رسول کی منزلت و عزت اور یہ ہے آپس میں شیر و شکر ہونے کی حقیقت راہِ رطبت

کے علاوہ باقی تمام آدمیوں نے نکل کر بیعت کر لی۔ اور حضرت علی نے فرمایا میں نے قسم اٹھائی ہے کہ اس وقت تک باہر نہ آؤں گا اور نہ کندھے پر ردا ڈالوں گا جب تک قرآن کو جمع نہ کر لوں۔

اس وقت جناب فاطمہ دروازہ پر کھڑے ہو کر یہ فرما رہی تھیں۔ آنے والوں میں تم لوگوں سے بدترین انسان آج تک ہمارے اس دروازہ پر نہیں آیا تم نے رسول کریم کا جنازہ ہمارے پاس چھوڑ دیا اور معاملہ خلافت کو آپس میں طے کر لیا جتنے کہ نہ ہم سے مشورہ لیا اور نہ ہمیں اپنا حق دیا۔

حضرت علی علیہ السلام کے تشریف نہ لے جانے اور بیعت نہ کرنے کا عمر کے دل میں بہت قلق تھا، آپؑ حضرت ابوبکر کے پاس آکر (جذباتی لہجہ میں) کہنے لگا کیا تو اس بیعت نہ کرنے والے سے کوئی باز پرس نہ کر لگا؟ حضرت ابوبکر نے فوری طور پر مقتضی غلام کو حضرت علی کے بلانے کے لئے بھیجا وہ جب در دولت پہنچا تو آپؑ نے آنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے جواب دیا آپؑ کو رسول اللہ کا خلیفہ (ابوبکر) بلاتا ہے آپؑ نے فرمایا بہت جلد تم نے رسول اللہ پر چھوٹ باندھا ہے پس اس نے واپس آکر حضرت علی کا جواب سنایا جس کو سن کر ابوبکر پر کافی دیر تک گریٹاری رہا پھر عمر نے دوبارہ (تند لہجہ میں) کہا اس بیعت نہ کرنے

بقیہ تاثیر صفحہ ۲۸۔ بخاری شریف باب مناقب فاطمہ میں جناب رسالت مآبؐ سے مروی ہے فَاِطْمَئِنَّ سَيِّدَةُ نَبِيِّ اَهْلِ الْجَنَّةِ، یعنی فاطمہ جنت میں جانے والی تمام عورتوں کی سردار ہے اور مسور بن مخزوم سے مروی ہے آپؐ فرمایا فَاِطْمَئِنَّ بَصْنَعَةٍ مِّنِّي فَمَنْ اَغْضَبَهَا فَقَدْ اَغْضَبَنِي (فاطمہ میرا گھڑا ہے جس نے اس کو ناراض کیا ا نے مجھے ناراض کیا۔

اسے یہ سختی اسلام میں تہودی طرز حکومت کی پہلی داغ بیل اور منصفانہ رائے طلبی۔ نیز ڈرا دھمکا کر گھروں کو جلاوٹ کی قسمیں کھا کر پرچہ نبوت کی پاسبانی اور مملکت اسلامیہ کی نگرانی کے لئے سریر حکومت پر براجمانی کا اجماعی طریقہ دھونس و دھاندلی کی قابل تقلید مثال اور مقتدا ائے امت کی حیثیت سنبھالنے والے کی عادلانہ روش سرور کے لئے فکر سلیم سمجھنے کے لئے فہم مستقیم اور فیصلہ کے لئے قلب صمیم چاہیے۔

اے جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کے ان کلمات سے صاف عیاں ہے کہ منصب خلافت کے حصول کی تک و دو الیکشنی پارٹی نے جناب رسالت مآبؐ کے جنازہ اور ان کے کفن و دفن کی اہمیت بالکل نظر انداز کر دی تھی نے خوب کہا ہے یہ چوں صحابہ حبیب دنیا داشتند۔ مصطفیٰ را بے کفن بگذاشتند

اے حضرت علیؑ کے نزدیک ان کا خلیفہ رسول کہاں رسول پر بہتان و افترا تھا اور خلیفہ نے بھی اپنے عمل سے اسے کر لیا کیونکہ جب دوبارہ مقتضی کو چھپا تو اس کو بدایت کر دی کہ مجھے خلیفہ رسول نہ کہنا بلکہ امیر المومنین کے خطاب سے یاد آ

والے کو مہلت نہ دیجو تو ابو بکر نے دوبارہ قنفذ کو جانے کا حکم دیا اور یہ ہدایت کی کہ خلیفہ رسول کہنے کے بجائے کہو آپ کو امیر المومنین نے بیعت کے لئے طلب کیا ہے پس قنفذ نے جب پیغام پہنچا یا تو آپ نے بلند آواز سے ازراہ تعجب سبحان اللہ کا کلمہ زبان پر جاری فرمایا اور کہا اس نے ایسی چیز کا دعویٰ کیا ہے جس کا وہ اہل نہیں ہے لے بس قنفذ نے واپس آکر حضرت علی کا جواب سنایا تو ابو بکر کافی دیر تک روتا رہا اس کے بعد غم خود اٹھا اور ایک جماعت کو لے کر در فاطمہ پر پہنچا اور قیام الیوم کیا۔ جب جناب فاطمہ نے دروازہ پر شور و غل سنا تو دروند مند لہجہ میں اپنے آپ کو باز بصداد می۔ یَا أَبَتَا کُ یَا رَسُولَ اللَّهِ مَاذَا لَقِینَا بَعْدَکَ مِنْ ابْنِ الْخَطَّابِ وَابْنِ أَبِي قُحَافَةَ۔ اے ابا جان ! اے رسول اللہ آپ کے چلے جانے کے بعد مجھے خطاب اور ابو قحافہ کے بیٹوں سے کیا کیا تکلیفیں پہنچی ہیں۔ ؟

بی بی عالیہ کے بین اور صدائے گریہ کو سن کر کافی لوگ روتے ہوئے واپس پلٹے کہ ان کے دل غم و اندوہ سے پھٹ رہے تھے اور جگر پارہ پارہ ہو رہے تھے۔ عمر اور اس کی مخصوص پارٹی اپنی بات پر ڈٹی رہی چنانچہ وہ حضرت علی کو ساتھ لاکر ابو بکر کے پیش ہوئے اور کہنے لگے اس کی بیعت کرو۔ آپ نے فرمایا اگر میں نہ کروں تو کیا ہوگا ؟ کہنے لگے اس اللہ کی قسم جس کے سوا اور کوئی اللہ نہیں ہے تیری گردن اٹھا دیں گے لے آپ نے نہایت اطمینان و سکون سے فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کے عہد خاص اور رسول اللہ کے بھائی کو قتل کرو گے ؟ عمر نے کہا۔ اللہ کا عہد تو ٹھیک ہے لیکن رسول اللہ کا بھائی ہم نہیں مانتے لے ابو بکر خاموشی سے یہ سب باتیں سن رہا تھا اور آخر تک چپ بیٹھا رہا عمر نے

لے اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے نزدیک ان کا امیر المومنین کہلانا بھی ناجائز تھا اور حضرت علی کا جواب سن کر ابو بکر پر گریہ کا طاری ہونا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ خلیفہ رسول اور امیر المومنین کے خطابات جلیلہ کے لئے اپنے آپ کو ناموزوں سمجھتا تھا اس لئے حضرت علی کی تنقید اسے اپنے غاصبانہ رویہ پر ندامت کی دعوت دیتی تھی پس گریہ میں بے بس ہو جاتا تھا کیونکہ اقتدار کو شیر باد کہنا مشکل تھا۔

لے۔ یہ ہے منصفانہ اسلامی جمہوریت، اسی بنا پر تو سابق صدر پاکستان ایوب خان نے فاطمہ جناح کے مقابلہ میں جیت جانے کے بعد کما تھا جیسا کہ مشہور ہے کہ میرا انتخاب دور اول کے انتخاب سے اچھا ہوا ہے ۲ ہر کیف دور اول میں اسلامی راج کے قیام کے لئے منصفانہ رائے قاضی کا طریق کار انتہائی متبہناک ہے سے اقتدار کی ہوس میں حدیث موافقت کا بھی انکار کر دیا جس کو فقیہین کے علمائے تواتر سے نقل کیا ہے کہ جناب رسالت مآب نے جب ہاجرین و انصار میں بھائی چارہ قائم کیا تو حضرت علی کو اپنا بھائی نامزد فرمایا اس لئے محمد بن بل و رندی و مشرک و غیرہ نقل از

اس کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کیا تم اس کے بارے میں کوئی حکم صادر نہیں کرتے؟ پس ابو بکر نے جواب دیا جب تک فاطمہ اس کے پہلو میں زندہ ہے میں اس کو کسی بات کے لئے مجبور کرنے کو تیار نہیں ہوں۔
پس حضرت علیؑ نالہ و زاری کرتے ہوئے قبر رسول پر پہنچے اور باوازا بلند رسول کریمؐ کو ان کی قبر سے لپٹ کر فریاد سنائی یا بنی اُمّ اِنّ الْقَوْمَ اسْتَضَعَفُونِی وَ کَادُوْا یَقْتُلُوْنِیْ اے بھائی جان قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیں۔

اور مسلمانوں کے دلوں میں حضرت علیؑ کا وقار و تاحیات فاطمہؑ صحیح بخاری میں صراحت سے منقول ہے چنانچہ صحیح بخاری باب غزوہ خیبر میں ہے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں جب فاطمہؑ نے ابو بکر سے اپنا حق طلب کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ فَأَبِیْ اَبُو بَکْرٍ اَنْ یَّدْفَعَ اِلَیْ فَاطِمَةَ مِنْهَا شَيْئًا فَوَجَدَتْ فَاطِمَةَ عَلٰی اَبِیْ بَکْرٍ فِیْ ذٰلِكَ فَمَعَجَرَتْهُ فَلَمْ تَكَلِّمْهُ حَتّٰی تُؤْفِیَتْ وَ عَاشَتْ بَعْدَ النَّبِیِّ سِتَّةَ اَشْهُرٍ فَلَمَّا تُؤْفِیَتْ دَفَنَهَا ذَوْجُهَا عَلِیُّ لَیْلًا وَلَمْ یُؤْزِنْ بِهَا اَبَا بَکْرٍ وَ صَلَّى عَلَیْهَا وَ كَانَ لَعَلِّی مِنَ النَّاسِ ذَجْرُ حَیَاتٍ فَاطِمَةَ فَلَمَّا تُؤْفِیَتْ اِسْتَنَکَرُ عَلٰی وَجُوْهِ النَّاسِ۔ حضرت ابو بکر نے حضرت فاطمہؑ کو کچھ بھی دینے سے انکار کر دیا پس حضرت فاطمہؑ ابو بکر پر اس بات سے ناراض ہو گئیں پس اس سے قطع تعلقی اور قطع کلامی کر لی یہاں تک کہ ان کی وفات ہو گئی اور چھ ماہ رسول کریمؐ کے بعد زندہ رہیں جب ان کی وفات ہوئی۔ تو حضرت علیؑ نے ان کو رات کے وقت دفن کیا اور ابو بکر کو شمولیت کے لئے اطلاع تک نہ دی پس خود ہی ان پر جنازہ لے غالباً کرسی اقتدار کی طرف سے علیؑ کے قتل کا حکم صادر کر کے اپنے دل کی بھڑاس کو علیؑ کے خون سے ٹھنڈا کرنے کا ارادہ تھا جو پورا نہ ہو سکا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول زادہ کی موجودگی کی وجہ سے انہوں نے علیؑ سے الجھنا پسند نہ کیا ورنہ ہر ممکن اقدام سے گریز نہ کرتے اور جناب فاطمہؑ کا لحاظ بھی اس لئے نہیں کہ ان کا احترام دل میں تھا ورنہ قضیہ فدک میں ان کی دل شکنی نہ کی جاتی جیسا کہ صحیح بخاری باب الخمس اور باب غزوہ خیبر میں بصراحت مذکور ہے بلکہ علوم الناس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے یہ بات کہہ دی گئی تاکہ وہ یہ باور کر لیں کہ ان کے دلوں میں بنت رسولؐ کا احترام ہے۔
سے قرآن مجید میں یہ الفاظ حضرت ہارونؑ کے کلام کی حکایت ہے جب کہ انہوں نے اپنی قوم کی گوساہر پستی اور ارتداد کی رپورٹ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش کی تھی اور اس آیت مجیدہ سے تمسک اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جس طرح حضرت ہارونؑ اپنی قوم کو گوساہر پستی کے بعد متردد سمجھتے تھے اسی طرح حضرت علیؑ بھی ان کو خلافت سازی کے بعد ان جیسا سمجھتے تھے اور یہی مواغات اور یہی منزلت جو فریقین (باقی برصغیر)

ٹپھی اور حضرت فاطمہؑ کی زندگی میں لوگوں کے درمیان حضرت علیؑ کی اہمیت تھی جب ان کی وفات ہوئی تو حضرت علیؑ سے لوگوں کے رُخ پھر گئے اور بنہ باہمی شیعہ و شکر بننے کی حقیقت اعلان ہوئی۔

العقاد خلافت میں جلد بازی

وفات پیغمبرؐ سے قبل عامۃ الناس کو ہونے والے الیکشن کی کوئی خبر نہ تھی اور نہ اس راز کو افشا کیا گیا تھا صرف چند آدمیوں کے ذہن میں یہ بات راسخ تھی جو وفات پیغمبرؐ کی خبر کے نشر ہوتے ہی فوراً عمل پر عملی جامہ پہن کر منظر عام پر آئی ورنہ اگر یہ تحریک حیات پیغمبرؐ کے زمانہ میں چلائی جاتی تو اس افسوس ناک نتیجہ تک نہ پہنچتی جو بعد میں ظاہر ہوا۔ سقیفہ فانی الیکشنی بورڈ کے سوچے سمجھے منصوبہ کے ماتحت جب حاضر نمبروں میں تحریک العقاد خلافت پیش ہوئی تو انصار سے سعد بن عبادہؓ امیدوار کھڑا ہوا اور اس نے اپنے استحقاق کے لئے دلائل بھی پیش کئے پس اگر اسے عامہ کو حکم بنایا جاتا اور صحیح الیکشن لڑا جاتا تو یقیناً انصار جیت جاتے کیونکہ ووٹوں میں ان کا پلہ بھاری تھا۔

جن لوگوں نے سوچ سمجھ کر جنازہ رسولؐ کی اہمیت کو نظر انداز کر کے یہ قدم اٹھایا تھا اسے عامہ سے انتخاب کا ہونا یقیناً ان کے مفاد کے خلاف تھا پس انہوں نے انصاریؓ امیدوار کو مقابلہ سے دست بردار ہونے کا مشورہ دیا اور اپنی قیادت رسولؐ کو پیش کر کے ان سے اپنا استحقاق منوانے کی کوشش کی لیکن جب وہ زمانے کو منظم پارٹی کے ایک رکن یعنی حضرت عمرؓ نے ابو بکرؓ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کر لی اور پارٹی کے دوسرے اراکین نے بلا تاخیر یکے بعد دیگرے بیعت کر کے مبارکباد مبارکباد کا غل مچا دیا اور عوام کو دھکیل دھکیل کر بیعت کروالی گئی اور انصاریؓ امیدوار کو انتشار پسند کہہ کر اپنی من مانی کارروائی کے راستے سے بٹا دیا گیا اور اس جلدی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ قیادت رسولؐ کے جس بازو سے انصار کو اپنے اثر سے بٹایا جا رہا تھا انہیں معلوم تھا کہ اگر کچھ دیر ہو گئی تو ممکن ہے حضرت علیؑ یا کوئی دوسرا ہاشمی فوراً بیعت کرے اس استحقاق کو ختم کر کے جاری سوچے سمجھے منصوبے کو خاک میں ملا دے اس لیے ان کو چوں میں پھرنے والے بدوی لوگوں کو ادھر ادھر سے لا کر بیعت کی کارروائی پہنچنے کرایا گیا —

الحقیقہ حاشیہ ص ۱۱۱ کی کتابوں میں منتقل ہے اس کی رو سے حضرت مشاہدہ یاروں نے حضرت سے اور خلافت مذکورہ کے پستوں کی مثال کو عامہ پستوں کی سی ہو گئی۔

انتخاب کا علم ہوتا تو انصاری اُمیدوار اپنی پوری قوم کے ساتھ کچھ سوچ کر میدان میں قدم رکھتے تاکہ نتیجہ کی رسوائی سے بچ جائیں نیز مقام انتخاب ستیفہ بنی ساعدہ نہ ہوتا بلکہ یہ فیصلہ مسجد نبوی کی چار دیواری کے اندر ہوتا اور حضرت علی اور دیگر افراد بنی ہاشم اس میں باقاعدہ حصہ لیتے۔

موردی صاحب کی دیدہ دلیری بلکہ واقعات و حقائق سے اعلائیہ روگردانی ہے جو اس نے خلافت و ملکیت کے حصہ پر انتخابی خلافت کے عنوان سے تحریر کیا ہے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے لئے حضرت ابوبکر کو حضرت عمر نے تجویز کیا اور مدینے کے تمام لوگوں نے (جو درحقیقت اس وقت پورے ملک میں عملاً نمایندہ حیثیت رکھتے تھے کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

کس قدر غلط بیانی ہے کہ مدینے کے تمام لوگوں نے بیعت کی حالانکہ جناب فاطمہ بنت رسولؐ (جس کو بقول بخاری حضورؐ نے اپنا ٹکڑا بَضْعَةً مِّنِّي فرمایا) نے تازلیست نہ بیعت کی اور نہ خلیفہ تسلیم کیا اور بقول ابن قتیبہ دنیوری تازلیست ہر نماز کے بعد ان پر نعرین کرتی رہی۔ اسی طرح حضرت علی علیہ السلام نے بیعت سے صاف انکار کر دیا اور خلیفہ کبلانے والے کو غاصب خلافت قرار دیا اور خلیفہ رسول یا امیر المومنین کے خطابات بھی ان کے لئے ناجائز قرار دیئے جیسا کہ الامامۃ والسیاستہ کے حوالہ سے ابھی گذر چکا ہے۔ اسی طرح تاریخ کافی ایسے لوگوں کا پتہ دیتی ہے جنہوں نے بیعت سے انکار کر دیا چنانچہ مذکور ہو چکا ہے۔

نیز یہ کہنا کہ مدینے کے لوگ عملاً تمام ملک میں نمایندہ حیثیت رکھتے تھے، دعویٰ بلا دلیل ہے۔ امر خلافت کو اگر جمہوری منہج پر طے کرنا ہے تو مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے گوشوں میں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں اور ان میں معاملہ فہمی کی استعداد موجود ہے ان تمام کورائے زنی کا حق حاصل ہے۔ خواہ مکی ہوں یا مدنی بلکہ عربی ہوں یا عجمی البتہ اگر پیغمبرؐ نے کہیں انص کی ہو کہ مدنیوں کی رائے تمام عالم اسلام پر حاوی ہے تو تسلیم کرنے سے کوئی عذر نہیں لیکن پیغمبرؐ نے ایسا کبھی نہیں فرمایا اور نہ اس فیصلہ کو عقل سلیم قبول کرتی ہے بلکہ خود موردی صاحبی دوسرے مقام پر اس کو قبول نہیں کرتے چنانچہ کتاب مذکور کے حصہ ۳۵ پر سورہ نور کی آیت اختلاف سے استشہاد کرتے ہوئے رقمطراز ہیں اس فقرہ کی رو سے اہل ایمان کی جماعت کا ہر فرد خلافت میں برابر کا حصہ دار ہے کسی شخص یا طبقہ کو عام مومنین کے اختیارات خلافت سلب کر کے انہیں اپنے اندر مرکوز کر لینے کا حق نہیں ہے (بنابرین تمام افراد ملت سے اختیار خلافت چھین کر صرف بعض اہل مدینہ کے اندر مرکوز کرنا کسب جائز ہو سکتا ہے) (موردی صاحب اپنے فیصلہ پر نظر ثانی فرمائیں)

اب رہی یہ بات کہ مدینہ والوں نے کسی باڈیالا لچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، یہ فقرہ عامۃ الناس کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے تاریخ کا منہ چڑانے کے مترادف ہے اگر رضا و رغبت سے اور بغیر کسی دباؤ کے بیعت کا انعقاد تھا تو حضرت علی کے گھر میں جمع ہونے والوں کو نذرِ آتش کرنے کی دھمکی کس لئے دی گئی اور حضرت علی کو برسرِ عام قتل سے خوفزدہ کرنے کی کوشش کیوں کی گئی۔ اس بات سے انکار نہیں کہ عامۃ الناس کو منظم الکیشی کمیٹی کے ارکان نے بیعت کے لئے بلایا تو وہ ہاؤس سے متاثر ہو کر اور انجام سے بے نیاز ہو کر ہاتھ پر ہاتھ رکھتے گئے اور ہمیشہ ایسے لوگوں کی کثرت ہو کر تھی ہے جنہیں اپنی رائے کی قدر و قیمت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ البتہ معاملہ فہم اور خواص کا طبقہ پہلے دن سے اس انتخاب کے مخالف تھا اور آخر تک رہا اور بے سوچے سمجھے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے جنہوں نے بیعت کر لی ان میں سے بھی سنجیدہ طبقہ اس دھاندلی کی حقیقت کھلنے کے بعد اپنے کئے پر نادم ہوا چنانچہ حضرت علی کا احتجاج اور دلائل سننے کے بعد بشیر بن سعد انصاری کا نظریہ مذکور ہو چکا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی نے بروقت خلافت کے لئے اپنا نام پیش کیوں نہ کیا اس کا جواب اولاً تو یہ ہے کہ انتخاب کی کارروائی ایک منظم سازش کے ماتحت اچانک طور پر عمل میں لائی گئی اور کارروائی مکمل ہونے کے بعد مسجد نبوی میں اس کا اعلان کیا گیا اور ثانیاً یہ کہ یہی سوال انصار کی طرف سے حضرت علی کے احتجاج کے فوراً بعد بھی کیا گیا تھا جس کا جواب حضرت علی نے خود دے دیا تھا چنانچہ الامامۃ والسیاستہ مطبوعہ مصر ص ۱۲ پر ابن قتیبہ دینوری رقمطراز ہے۔

رات کے وقت حضرت علی جناب فاطمہ کو سواری پر سوار کر کے انصار کی مجالس میں نصرت طلبی کے لئے جاتے تھے تو وہ لوگ یہی جواب دیا کرتے تھے۔ اے بنت رسولؐ اب تو ہم اس شخص کی بیعت کر چکے ہیں اگر تیرا شوہر اور ابن عم پہلے آواز بلند کرتا تو ہم یقیناً اس سے عدول نہ کرتے تو حضرت علی ان کا سوال سن کر یہ جواب دیتے تھے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میت کو دفن کئے بغیر اپنے گھر میں چھوڑ کر نکل پڑتا۔ اور لوگوں سے حکومت و سلطنت کے لئے مجھ پر تاج اور جناب فاطمہ ان کی تائید میں یہی فرماتی تھیں کہ ابوالحسن نے جو کچھ کیا ہے انہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا البتہ جو کچھ ان لوگوں نے کیا ہے اللہ ان سے حساب لے گا۔

اس سوال و جواب سے اس حقیقت کی قلعی بھی کھل گئی کہ حضرت علی اور جناب فاطمہ کے نزدیک

خلافت کا انعقاد غلط تھا اسی لئے تو انہوں نے انصار سے تعاون کی اپیل کی اور یہ بھی ثابت ہوا کہ انصار نے بھی اندھا دھند بیعت کر لی تھی اور معاملہ فہمی کے بعد وہ اپنے کئے پر نالاں تھے جیسا کہ ان کے جواب سے صاف ظاہر ہے۔

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ حضرت علیؑ نے دعویٰ خلافت کے ثبوت کے لئے صرف قرابتداری کو ہی پیش نہیں کیا تھا بلکہ وہ ان کا اقناعی و الزامی جواب تھا کہ تم نے جس دلیل کی بنا پر انصار کو پیچھے ٹھایا ہے کہ ہم رسول کے قرابتدار ہیں میں اسی دلیل کو تم پر پیش کرتا ہوں کہ تمہاری بہ نسبت ہم رسول کے زیادہ قرابتدار ہیں لہذا خلافت ہمارا حق ہے بلکہ آپ نے ہر لحاظ سے اپنا حق ہونا ثابت کیا جیسا کہ گذر چکا ہے۔

سیاست ملکیت کا مسلم قانون اور ہر دور کا رائج الوقت اُٹل اور ناقابل انکار دستور ہے کہ کرسی اقتدار جس طریقہ سے حاصل ہو جائے اُسے صحیح اقتدار مانا جاتا ہے اور تمام برسر اقتدار افراد اُسے صحیح حکومت تسلیم کر لیا کرتے ہیں اور کرسی اقتدار کے ہوا خواہ ہر ممکن طریقہ سے اُسے جائز اور آئینی ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کرتے ہیں دھونس دھاندلی اور ناجائز ذرائع کا استعمال اس وقت تک قابل اعتراض ہوتا ہے جب اس کا تعلق کسی دوسرے سے ہو ورنہ کامیابی حاصل کرنے والا امیدوار خواہ وہ کسی طریق کار سے کامیاب ہوا ہو وہ کبھی اپنے طریق انتخاب کو غلط نہیں کہتا۔ اور نہ اس کی مخصوص پارٹی اس کو غیر آئینی اقتدار قرار دیتی ہے۔

سفینی انتخابی فیصلہ کے بعد سرکاری وکیل ابو عبیدہ بن جراح نے جب حضرت علیؑ کا الزامی جواب سنا تو اس نے پتیرا بدلا اور دلیل کا رخ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا کہ آپ نوجوان ہیں اور یہ بوڑھے تجربہ کار ہیں فی الحال آپ خاموش ہو جائیں اور اگر موت نے مہلت دی اور وقت نے ساتھ دیا تو فضل دین علم، فہم سبقت اسلامی، رشتہ داری اور دامادی رسول کے شرف کی بنا پر آپ ہی خلافت کے حقدار و سزاوار ہیں۔ اب اس بیان سے صاف واضح ہے کہ ابو عبیدہ بن جراح بلکہ پورے ایوان اقتدار پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ رشتہ داری معیار خلافت نہیں اور نہ طرہا یا موجب ترجیح ہے بلکہ خلیفہ رسول کو ذاتی اوصاف و کمالات کی بنا پر منصب خلافت کے لئے اہل و موزوں ہونا چاہیے اور وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ابو بکرؓ جگہ صحابہ اس بارے میں حضرت علیؑ کا مقابلہ نہیں کر سکتے پس حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کی جواز کیلئے اور حضرت علیؑ کو خاموش کرنے کے لئے یہی عند بار و پیش کر دیا کہ وہ بزرگ تجربہ کار ہیں بس ان کو اب رہنے دیجئے ورنہ درحقیقت دینی لحاظ

اور اوصاف و کمالات ذاتیہ کے اعتبار سے آپ ہی موزوں تر ہیں۔ گویا دے لفظوں میں اپنی دھاندلی کا اعتراف کرتے ہوئے اس پرسن رسیدگی کے عذر بار و کاغذات ڈال کر اپنے غلط اقدام کو چھپانا چاہتا تھا کہ عوام الناس پر اس انتخاب کے ناجائز ہونے کی حقیقت نہ کھل سکے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ ان کا اقتدار دنیاوی سلطنت تک محدود ہے کیونکہ ان کی سوچ بوجھ کا تعلق سیاست ملکیت سے ہے نہ کہ دینی معاملات سے، پس دینی لحاظ سے تو آپ کا ہم ملہ کوئی نہیں اور وہ اقتدار آپ کے لئے ہی مخصوص ہے البتہ وقت نے مہلت دی تو دنیاوی سلطنت میں بھی آپ کا نمبر آ رہی جائے گا۔ اور حضرت علی علیہ السلام نے بھی اپنی جوابی تقریر میں مہاجرین کے سامنے واشکاف الفاظ میں اعلان کیا کہ رشتہ داری کے لحاظ سے بھی ہم باقی تمام لوگوں سے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ ہم اہل بیت ہیں اور خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ براہونے کے لئے بھی ہم موزوں تر ہیں کیونکہ قارئین قرآن دین اللہ کے فقیہ اور سنت رسول کے عالم ہم ہی ہیں نیز امور رعایا میں معاملہ فہم ان کی مشکلات میں ان کے سمہر د اور تقسیم حقوق میں مساوات کے علمبردار بھی ہم ہیں۔ تم لوگ خواہشات کے پیچھے نہ پڑو ورنہ گمراہ ہو گے اور راہِ حق سے دُور ہوتے چلے جاؤ گے۔

اس بیان میں آپ نے اپنا استحقاق خلافت اوصاف و کمالات ذاتیہ کے لحاظ سے بیان کیا جس کا رد یا انکار کرنے کی جرات حکومتی جماعت میں نہ تھی آپ نے امور شرعیہ اور معاملات سیاسیہ دونوں میں اپنا ماہر ترین اُمت ہونے کا دعویٰ کیا جس پر کسی نے لب کشائی کی جرات نہ کی اور آخر میں آپ نے ستیفنائی انتخاب کو ناجائز قرار دیتے ہوئے صاف طور پر فرمایا کہ اس انتخاب کے طریقہ کار کی داعی صرف خواہش نفسانی ہے لہذا بطور نصیحت فرمایا کہ خواہش نفس کے پیچھے نہ جاؤ ورنہ گمراہ ہو گے۔ اور راہِ حق سے دُور ہوتے جاؤ گے اور حاضرین میں سے آپ کے اس فقرہ کی تردید بھی کسی نے نہ کی۔

بنابرین مودودی صاحب کا حضرت علی کے متعلق یہ نظریہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کے لئے اُحق سمجھتے تھے لیکن کسی قابل اعتبار تاریخی روایت سے ان کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو البتہ حکومت عثمان کے دور میں کنبہ پروری اور اقربانوازی کی بدولت جب ہر طرف سے بغاوت کا دھواں بلند ہونے لگا اور قلاوہ حکومت کانٹوں کا بار بن گیا تو وفات عثمان کے بعد حضرت علی نے اقتدار حکومت کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا بالآخر لوگوں کے پر زور اصرار سے بدلِ ناخواستہ اسے قبول کر لیا۔

مودودی صاحب نے حضرت سعد بن عبادہ انصاری کے اختلاف رائے کو قبائلی عصبیت پر محمول کرنے کی جرات کر کے آزاد محقق ہونے کے دعوے کے باوجود کرسی اقتدار کی جانبداری اور آبائی تقلید کا تقاضا پورا کیا ہے اور حضرت علی علیہ السلام اور جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کے اختلاف رائے کو ظاہر کرنا تو آبائی تقلید کے منافی سمجھتے ہوئے مناسب ہی نہ سمجھا اسی طرح ان اشخاص کے اختلاف رائے کو بھی بھنم کر گئے جنہوں نے حضرت عمر کی جلالت کی دھمکی سے متاثر ہو کر رسمی بیعت کر لی اور یہ سب اس لئے تاکہ کرسی اقتدار پر قابض ہونے والی جماعت کو حق بجانب کہنے میں آسانی ہو اور ہم پہلے سے کہہ چکے ہیں کہ اقتدار جس طریقہ سے بھی حاصل ہو جائے برسر اقتدار پارٹی اسے حق بجانب اور جائز و مبنی بر انصاف ثابت کرنے کے لئے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرتی ہے اور خوشامد ہی لوگوں کی کسی دور میں کمی نہیں ہوتی۔ وہ حزب اختلاف کی ہر تنقید کو غلط رنگ میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں جس طرح سعد بن عبادہ انصاری کے اختلاف کو مودودی صاحب نے قبائلی عصبیت سے تعبیر کیا اور ہر دور میں تاریخ نویس لوگ حکمران طبقہ کی خوشامد کے لئے حزب اختلاف کی سربراہ آوردہ شخصیتوں کو بھی نظر انداز کر دیا کرتے ہیں تاکہ یہ تاثر پیدا کیا جائے کہ وہ ہر طبقہ و قوم اور ہر فرد ملت کے ہر دل عزیز حکمران تھے اور ساری رعایا کے لئے وہ مقبول قائد تھے۔ چنانچہ اسی نظریہ کے ماتحت مودودی صاحب بلکہ اس گروہ کے اکثر و بیشتر مصنفین نے حضرت علی کے اختلاف رائے کو ذکر تک نہیں کیا حالانکہ الامامۃ والسیاستہ کی پیش کردہ روایت بباغ و دھسل حضرت علی و فاطمہ کے بیعت نہ کرنے کا اعلان کر رہی ہے۔

مودودی صاحب انتخابی خلافت کے زیر عنوان حضرت عمر کی خلافت کے انعقاد کے متعلق یوں رقمطراز ہیں ص ۸۷۔

حضرت ابوبکر نے اپنی وفات کے وقت حضرت عمر کے حق میں وصیت لکھوائی اور پھر مسجد نبوی میں لوگوں کو جمع کر کے اس کی نامزدگی کا اعلان کر دیا پس لوگوں نے اسے قبول کیا۔

(بحوالہ طبری تاریخ الامم والملوک)

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے جب ابوبکر کے انتخاب کو چیلنج کیا تھا اور عمر نے آپ سے ابوبکر کی بیعت کا تقاضا کیا تھا تو بقول ابن قتیبہ دینوری آپ نے فرمایا تھا کہ خلافت کہ اونٹنی کا دودھ اچھی طرح نکال لو کیونکہ اس میں تیرا بھی حصہ ہے آج اس کی حکومت کو بچتہ کر لو کیونکہ کل اس کو وہ تیری طرف پلٹائے گا، پس آپ کا فرمان من و عن صحیح ثابت ہوا اور خلافت کی ٹھٹھری کھڑی کھڑی پکالی گئی اس نے اس کا نام تجویز کیا تھا اس نے اس کو نامزد کر دیا اور لطف یہ کہ انعقاد خلافت کے اس

طریق کار کو اپنے لئے جائز قرار دے کر باقی تمام امت کے لوگوں کے لئے ناجائز قرار دے دیا اور ہم نے ابھی ذکر کیا ہے کہ سیاستِ ملکیہ کا ہر دور میں یہی دستور چلا آیا ہے کہ جس دھاندلی کو دوسروں کے لئے ناجائز سمجھا جاتا ہے اپنے حق میں اُسے جائز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلامی مساوات کا تقاضا یہ ہے کہ ایک طریق کار اگر بعض کے لئے درست اور بنی برائصاف ہے تو اس کو سب کے لئے درست قرار دینا چاہئے۔ مودودی صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں ص ۸۴

”حضرت عمر کی زندگی کے آخری سال حج کے موقع پر ایک شخص نے کہا کہ اگر عمر کا انتقال ہوا تو میں فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا کیونکہ ابوبکر کی بیعت بھی اپنا تک ہی ہوئی تھی اور آفرودہ کامیاب ہو گئی۔ اس کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ حضرت عمر نے سفیفہ بنی ساعدہ کی مجلس میں اپنا تک اٹھ کر حضرت ابوبکر کا نام تجویز کیا تھا اور ہاتھ بڑھا کر فوراً ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی ان کو خلیفہ بنانے کے معاملے میں پہلے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔“

(اس اپنا تک تجویز کا پس منظر مختصر طور پر ہم پہلے بیان کر چکے ہیں)

حضرت عمر کو اس شخص کے قول کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے کہا میں اس معاملہ پر ایک تقریر کروں گا اور عوام کو ان لوگوں سے خبردار کروں گا جو ان کے معاملات پر غاصبانہ تسلط قائم کرنے کے ارادے کر رہے ہیں۔ چنانچہ مدینہ پہنچ کر انہوں نے اپنی پہلی تقریر میں اس قصے کا ذکر کیا اور طبری تفصیل کے ساتھ سفیفہ بنی ساعدہ کی سرگذشت بیان کر کے یہ بتایا کہ اس وقت مخصوص حالات تھے جن میں اپنا تک ابوبکر کا نام تجویز کر کے میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اس سلسلے میں انہوں نے فرمایا اگر میں ایسا نہ کرتا اور خلافت کا تقبیہ کئے بغیر ہم لوگ مجلس سے اٹھ جاتے تو اندیشہ تھا کہ رات لوگ کہیں کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں اور بارے لئے اس پر راضی ہونا بھی مشکل ہو اور بدلنا بھی مشکل۔ یہ فعل اگر کامیاب ہوا تو اسے آئندہ کے لئے نظیر نہیں بنایا جاسکتا۔ تم میں ابوبکر جیسی بلند وبال اور مقبول شخصیت کا اور آدمی کون ہے؟ اب اگر کوئی شخص مسلمانوں کے شرے کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعت کرے گا تو وہ اور جس کے ہاتھ پر بیعت کی جانے لگی دونوں اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کریں گے۔

تاریخ کے صفحات پر وہ مخصوص حالات طشت از بام کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں ایسی کوئی چیز نہیں ملے گی کہ مودودی صاحب جیسا متفق اس کی ترمیم نہ پہنچ سکے۔ واقعات کا نظر غائر سے جائزہ لے کر ایک عام انسان بھی حقیقت کے چہرے سے نقاب الٹ سکتا ہے۔ پیغمبر کی خبر وفات سن کر منظم سازشی جماعت برب سفیفہ بنی ساعدہ میں پہنچی اور تحریک خلافت کی قرارداد پیش ہوئی تو سعد بن جہاد

انصاری نے انصار کا استحقاق جتلاتے ہوئے انتخاب لڑنے کا اعلان کر دیا انہوں نے جب دیکھا کہ عام انتخابات کے ذریعے ہماری کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے اور سعد بن عبادہ بھی دست بردار ہونے پر کسی طرح راضی نہیں اور تاریخ اسلام میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا لہذا لوگ اس امر سے غافل تھے کہ ایسے حالات میں کن کن ہتھکنڈوں سے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے اور کون کون سے ذرائع ایسے مواقع پر بروئے کار لائے جاسکتے ہیں۔ پس اس معاملہ میں تاخیر ہونے سے ایک طرف تو انصاری اُمیدوار خلافت کا مقابلہ مشکل سے مشکل تر ہو جانے کا خطرہ تھا اور دوسری طرف بنی ہاشم کے پہنچ جانے سے قرابت رسول کا بہانہ خود بخود بے کار ہو جاتا اور عام الیکشن میں کامیابی قطعاً ناممکن ہو جاتی پس عوام کی نا تجربکاری اور غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نیا عربہ نکالا وہ یہ کہ رائے شماری اور جمہوری انتخاب کے طریقہ کو بالائے طاق رکھ کر اچانک حضرت ابوبکر کا نام پیش کر دیا اور سب سے پہلے خود کھڑے ہو کر اس کی بیعت کر لی اس کے بعد پارٹی کے جملہ ارکان یکے بعد دیگرے بیعت کرتے چلے گئے۔ پس عوام الناس اور غیر جانبدار لوگوں نے بھی انجام سے بے نیاز ہو کر دیکھا دیکھی بیعت کر لی اس معاملہ میں کسی صاحب رائے کو سوچنے کا موقع ہی نہ دیا گیا کہ کون حق دار ہے اور کون نہیں۔ پس بیعت بیعت کا شور بلند ہو گیا اور مسجد نبوی میں جا کر اعلان کر دیا گیا۔ پھر بچے کھچے لوگوں کو اکاد کا لالا کر بیعت کو قانونی حیثیت دے دی گئی اور اب بھی جو لوگ انکار پر ڈٹ گئے یا جنہوں نے تنقید پر لب کشائی کی انہیں دھونس و دھاندلی سے شریک بیعت کر لیا گیا جس طرح ہمارے ملک پاکستان میں سابق صدر ایوب نے مارشل لا لگا کر بنیادی جمہوریتوں کی داغ بیل ڈال دی اور پھر تمام ممبروں سے اپنے حق میں ووٹ لے لئے۔ اقتدار کے ذریعے نہ کسی کو مزید سوچنے کا موقع دیا اور نہ مقابل اُمیدوار بننے کی کسی کو اجازت دی پس متفقہ طور پر اس کا انتخاب ہو گیا اور وہ بلا مقابلہ کامیاب صدر بن گیا۔

یہ تھے وہ مخصوص حالات جن کی بنا پر حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کا نام فوری طور پر تجویز کر کے بیعت میں جلدی سے کام لیا اور اگلے لفظوں میں اسی خطرہ کا اظہار بھی موجود ہے کہ اگر میں ایسا نہ کرتا اور خلافت کے تصفیہ کئے بغیر ہم لوگ مجلس سے اٹھ جاتے تو اندیشہ تھا کہ راتوں رات لوگ کہیں کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں اور ہمارے لئے اس پر راضی ہونا بھی مشکل ہو اور بدلنا بھی مشکل سیاست ملکیت کا قدیمی دستور ہے کہ کرسی اقتدار پر قابض ہونے والا ہمیشہ اپنی اہلیت کا اعلان کیا کرتا ہے۔ اور مقابل کے ناکام اُمیدواروں کو اس کے لئے اُن فنٹ اور نااہل قرار دیا کرتا ہے اور یہی فقرہ دہراتا ہے کہ ہم لوگ اقتدار پر قابض نہ ہوتے تو کوئی دوسرا نااہل اور غلط کار اس پر قابض ہو جاتا پس ہم نے

اقتدار پر قبضہ کر کے ملک و ملت کے ناموس کو بچا لیا ہے۔ حضرت عمر کے الفاظ ابعینہ اسی سیاسی چال کی ترجمانی کر رہے ہیں کہ ہم یہ فیصلہ نہ کرتے تو راتوں رات کوئی غلط فیصلہ ہو جاتا یعنی یا تو سعد بن عبادہ اپنی جمیعت بڑھا کر اقتدار سنبھال لیتا اور یا حضرت علی اپنی صفات ذاتیہ و کمالات نفسیہ اور وصیت نبویہ کی بنا پر اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ اس کے علاوہ اور کوئی تیسری شق نہ تھی اور چونکہ اقتدار کے یہ دونوں راستے حضرت عمر کے لئے مفید نہ تھے اس لئے ان کو غلط فیصلہ قرار دے دیا جس طرح سعد بن عبادہ اور حضرت علی کی نظروں میں ان کا فیصلہ غلط اور ناجائز تھا اور حضرت عمر کے لئے انصاریا بنی ہاشم کی خلافت پر راضی ہونا بھی مشکل تھا اور اس کا بدلنا بھی مشکل۔ جس طرح کہ انصاریا بنی ہاشم کے لئے موجودہ صورت میں حضرت ابوبکر کے انتخاب پر راضی ہونا بھی مشکل ہو گیا اور بدلنا بھی مشکل۔

حضرت عمر کا یہ کہنا کہ ”یہ فعل اگر کامیاب ہوا تو اسے آئندہ کے لئے نظیر نہیں بنایا جاسکتا“ غور طلب بلکہ انصاف طلب ہے کیونکہ اگر اس فعل کی کامیابی کو شرعی حیثیت حاصل ہے تو اسے آئندہ کے لئے بھی نظیر بنا کر اُسے شرعی حیثیت دی جاسکتی ہے اور اگر اس فعل کی کامیابی کو شرعی حیثیت حاصل نہیں بلکہ صرف دھاندلی ہے تو بے شک اُسے آئندہ کے لئے نظیر تو نہیں بنایا جاسکتا لیکن اس غیر شرعی حیثیت سے حاصل ہونے والی خلافت کو کیسے جائز و شرعی خلافت کہا جاسکتا ہے؟

اس کے بعد حضرت ابوبکر کی شخصیت کی مقبولیت کا اعلان اس لئے بجا ہے کہ برسر اقتدار پارٹی کا یہی قدیمی دستور ہے اور اسی طریقہ سے اپنی کامیابی کو جواز کی حیثیت دی جا یا کرتی ہے کہ جس کو ہم نے چنا ہے اس جیسا کوئی اور انسان نظر ہی نہیں آتا۔

حضرت عمر نے انتخاب کے اس طریق کار کو بعد میں اپنانے والوں پر فتوائے قتل بھی صادر فرمایا۔ اب اگر کوئی شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعت کرے گا تو وہ اور جس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی۔ دونوں اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کریں گے اور مودودی صاحب نے مسند احمد سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں ”جس شخص نے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی امیر کی بیعت کی اس کی کوئی بیعت نہیں اور نہ اس شخص کی کوئی بیعت ہے جس سے اس نے بیعت کی اور فتح الباری سے ان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ جس شخص کو مشورے کے بغیر امارت دی جائے اس کے لئے اس کا قبول کرنا حلال نہیں ہے۔“

منصف مزاج لوگ اگر حضرت عمر کے ان فرامین میں غور کریں تو صاف ظاہر ہے کہ ان کا ذاتی فعل ان کے قول کا دشمن ہے اور ان کا قول ان کے ذاتی فعل کی شرعی حیثیت کو چیلنج کرتا ہے کیونکہ ان کے نظریہ

میں مسلمانوں کے شوق کے بغیر کسی کی بیعت درست نہیں پس اس قسم کی بیعت بیعت ہے اور اس قسم کا امیر امیر ہے۔ پس ان کے اپنے فتوے کی وجہ سے پکڑا جانے والے مسلمانوں کے شوق کے بغیر اپنا تک حضرت ابوبکر کی بیعت کی تھی لہذا ان کی بیعت بیعت ہے۔ یہی اور ان کی بیعت سے قبلہ والا علیہ السلام شرعی خلیفہ رہا اور اگر مخصوص حالات کا انداز ان کے ذاتی فعل کو صحیح قرار دے سکتا ہے تو ان کے بعد اسی طریقہ کار سے منتخب ہونے والا امیر حکم ان ان بیعت مخصوص حالات کا بیان پیش کر سکتا ہے مودودی صاحب نے اپنی تحقیق کے پیش نظر حضرت عثمان کی غلط پالیسی پر جرات مندانہ تنقید کرتے ہوئے جس طرح صراط پر صاف لکھ دیا ہے اگر غلط کام بہ حال غلط ہے خواہ وہ کسی نے کیا ہو، کاشش وہ انعقاد خلافت کی غلط روش پر پردہ نہ ڈالتے بلکہ جرات سے کہہ دیتے کہ حضرت ابوبکر کا طریق انتخاب غلط اور غیر شرعی تھا اور تا قیامت اس قسم کا انتخاب ہر ایک کے لئے ناجائز اور غلط ہے پس اس قسم کی بیعت بھی غلط ہے اور اس قسم کا امیر بھی غلط کار ہے اور غلط کام بہ حال غلط ہے خواہ وہ کسی نے کیا ہو

مودودی صاحب کی محققانہ روش

مودودی صاحب جہاں ایک طرف بعض مقامات پر بے لاگ تبصرہ کرنے کے بعد آزادانہ اپنی رائے بلخوف و قوت لائے پیش کرنے میں ذرا بوجھ بھجوا کر نہیں کرتے وہاں دوسری طرف آسانی تقلید میں اندھا دھند مقام تحقیق سے بہت دور چلے جاتے ہیں اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ میرے نظریات میں باہمی تضاد کم ہو رہا ہے جس طرح حضرت عمر کا نظریہ اپنے عمل سے متضاد تھا۔

بعینہ مودودی صاحب بھی اسی قسم کے چکر میں پھنسے ہیں ان کی کورانہ آسانی تقلید کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان کو صحیح خلیفہ رسول تسلیم کر لیا جائے اور ان کے چناؤ پر کوئی تنقید نہ کی جائے اور اسی بنا پر انہیں نے تاریخی حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے تینوں خلیفوں کو صحیح اجماعی اور اسلامی جمہوری خلیفے تسلیم کر لیا حتیٰ کہ حضرت علی اور جناب فاطمہ کے اختلاف رائے کا تذکرہ تک نہ کیا حالانکہ کتب معجمہ میں واضح الفاظ سے اس کا ذکر موجود ہے اور سعد بن عبادہ انصاری کے اختلاف کو قبائلی عصبیت کا نتیجہ قرار دے دیا ص ۹ لیکن اسلامی جمہوریہ کے دستور و اصول بیان کرتے ہوئے یہ خیال تک نہ رہا کہ ان سے آسانی تقلید سے حاصل شدہ عقیدہ خلافت کے خوشنما محل کی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں گی چنانچہ

آپ اختلاف کے ذیل میں ۳۵ پر فرماتے ہیں اس فقرے کی رُو سے اہل ایمان کی جماعت کا یہ ہے۔
 خلافت میں برابر کا حصہ دار ہے کسی شخص یا طبقہ کو عام مومنین کے اختیارات خلافت سلب کر کے
 انہیں اپنے اندر مرکوز کر لینے کا حق نہیں ہے نہ کوئی شخص یا طبقہ اپنے حق میں خدا کی قسم سے خلافت کا
 دعویٰ کر سکتا ہے یہی چیز اسلامی خلافت کو ملکیت، طبقاتی حکومت اور مذہبی پیشواؤں کی حکومت سے
 الگ کر کے اسے جمہوریت کے رُخ پر موڑتی ہے۔ اس قاعدہ کی رُو سے اہل مدینہ کو کوئی حق حاصل نہیں
 کہ عام مومنین کے اختیارات خلافت سلب کر کے اپنے اندر مرکوز کر لیں اور جسے پاویں خلیفہ منتخب کئے
 تمام مومنین کے لئے اس کو واجب الطاعت حکمران مقرر کر دیں اور نہ حضرت عمر کو حق پہنچتا ہے کہ اپنی ذاتی
 تجویز سے حضرت ابوبکر کو آگے بڑھا دیں اور اس کی بیعت کر کے لوگوں کو ایسا کرنے کی دعوت دیں۔ اور
 اس کے بعد قاعدہ مذکورہ کی رُو سے حضرت ابوبکر کو حق نہیں پہنچتا کہ اپنے بعد کے لئے حضرت عمر کو نامزد
 کر کے تمام اُمت کے لئے اس کو واجب الطاعت فرمانروا مقرر کر دیں اسی طرح حضرت عمر کو
 قطعاً حق نہیں پہنچتا کہ تمام رُوئے زمین پر پھیلے ہوئے مسلمانوں کے اختیارات خلافت چھین کر صرف
 اہل مدینہ میں سے چھ آدمیوں کے حوالہ کر کے سب کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ آیت اختلاف سے
 استنباط کردہ قاعدہ کی رُو سے تینوں خلافتیں اسلامی جمہوری نہیں بلکہ ان پر ملکیت اور طبقاتی حکومت کا
 رنگ غالب ہے اور ان کو کسی طرح بھی شرعی جواز کی حیثیت نہیں دی جاسکتی اور نہ وہ شرعی طور پر
 واجب الطاعت دینی حکمران قرار دئے جاسکتے ہیں۔ خدا جانے وہ وہی صاحب کو یہ قاعدہ بہت
 جلد کیوں فراموش ہو گیا کہ ص ۸۳ پر انتخابی خلافت کے ذیل میں لکھ دیا۔ حضرت ابوبکر کو حضرت عمر نے
 تجویز کیا اور مدینے کے تمام لوگوں نے (جو درحقیقت اس وقت پورے ملک میں عملاً نمایندہ حیثیت
 رکھتے تھے) کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی
 سچ ہے حب الشی یُحبی ویُصم۔ یعنی انسان کو کسی شے کی محبت اس کے محبوب دیکھنے سے اندھا
 اور نقائص سننے سے بہرہ کر دیا کرتی ہے۔

۳۵ پر بتایا کہ یہی (مذہبی پیشواؤں کی حکومت) اور اسلامی ریاست کے درمیان فرق بیان
 کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں وہ (اسلامی ریاست) ملکیت کو خدا کے لئے خاص
 کرنے کی حد تک بھتیا کر لیتی ہے۔ یہی نظریہ سے متفق ہے مگر اس نظریے پر عمل
 درآمد کرنے میں اس کا راستہ بھتیا کر لیتی ہے۔ الگ ہو جاتا ہے مذہبی پیشواؤں کے کسی خاص
 طبقے کو خدا کی خصوصی خلافت کا حامل ٹھہرانے اور مل و عقد کے سارے اختیارات اس طبقے کے

حوالے کر دینے کے بجائے وہ حدود ریاست میں رہنے والے تمام اہل ایمان کو (جنہوں نے رب العالمین کے آگے تسلیم خم کرنے کا شعوری عہد کیا ہے) خدا کی خلافت کا حامل قرار دیتی ہے اور حل و عقد کے آخری اختیارات مجموعی طور پر ان کے حوالے کرتی ہے۔

”حک ۵۶ پر فرماتے ہیں۔ وہ (اسلامی ریاست) ایک ایسی ریاست ہے جو رنگ، نسل، زبان یا جغرافیہ کی عصبیتوں کے بجائے صرف اصول کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے زمین کے ہر گوشے میں نسل انسان کے جو افراد بھی چاہیں ان اصولوں کو قبول کر سکتے ہیں اور کسی امتیاز و تعصب کے بغیر بالکل مساوی حقوق کے ساتھ اس نظام میں شامل ہو سکتے ہیں دنیا میں جہاں بھی ان اصولوں پر کوئی حکومت قائم ہوگی وہ لازماً اسلامی حکومت ہی ہوگی۔ الخ“

اب ان ہر دو نظریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت ابوبکر و عمر و عثمان کے انتخاب پر بھی ذرا جائزہ نظر ڈالئے یقیناً مودودی صاحب کے یہ نظریے آبائی تقلید کے تحت تسلیم کردہ خلافت کے انتخاب کو اسلامی جمہوریت قطعاً نہیں بننے دیتے ایک طرف یہ کہ ایک ”مذہبی پیشواؤں کے کسی خاص طبقے کو خدا کی خصوصی خلافت کا حامل ٹھہرانے اور حل و عقد کے سارے اختیارات اس طبقے کے حوالے کر دینے کے بجائے وہ (اسلامی ریاست) حدود ریاست میں رہنے والے تمام اہل ایمان کو خدا کی خلافت کا حامل قرار دیتی ہے اور حل و عقد کے آخری اختیارات مجموعی طور پر ان کے حوالے کرتی ہے۔“ اور دوسری طرف لاکھوں فرزندِ اسلام کے اختیارات خلافت سلب کر کے اور ان سے حل و عقد کے سارے اختیارات چھین کر اہل مدینہ کے حوالے کر دیے۔ ایک طرف یہ کہہ دیا کہ نسلِ انسانی کے سب افراد زمین کے ہر گوشے میں کسی امتیاز و تعصب کے بغیر بالکل مساوی حقوق کے ساتھ اس نظام میں شامل ہو سکتے ہیں اور دوسری طرف یہ کہنے میں ذرہ بھر چپکپا سبٹ محسوس نہ کی کہ صرف اہل مدینہ کو حق حاصل ہے کہ کسی شخص کو ساری امت کی گردنوں پر سوار کر دیں کیونکہ حل و عقد کے پورے اختیارات ان ہی میں محدود تھے۔ ایک طرف کہہ دیا خدا کی خصوصی خلافت کا کوئی فرد حامل نہیں ٹھہرایا جاتا۔ اور دوسری طرف حضرت ابوبکر کا عمر کو نامزد کر کے خلیفہ مقرر کر دینا اور اسے واجب الطاعت سمجھنا بھی ذکر کر دیا۔ یہ سب اندھی تقلید کے افسوسناک نتائج ہیں کہ عقل دلائل و براہین کے ذریعے سے جو نظریات متعین کرتی ہے کورانہ تقلید و مقام عمل میں ان کو نظر انداز کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

ملوکیت ہی ملوکیت

آبائی کورانہ تقلید کی بدولت مذہب کا جو راستہ ملا ہے مودودی صاحب نے اس کی تصحیح کے لئے جن جن تکلفات کا ارتکاب کیا ہے وہ ناقد بصیر پر واضح وعیاں ہیں۔ انہوں نے کتب سیر و تاریخ کا مطالعہ کیا اور ہر کتاب سے اپنے مطلب کا فقرہ لیتے ہوئے اپنے زور قلم سے اُسے اپنے متعین راستے کی تائید و تصحیح کے لئے خوب نمک مسالہ لگا کر پیش کر دیا اور بعض اوقات اسی کوشش کے نتیجہ میں انہیں متضاد نظریوں کو یا ایسے نظریوں کو جن کا لازمہ تضاد ہے اپنانے میں کوئی باک نہ رہا۔ چنانچہ آپ کتاب خلافت و ملوکیت کا نظر غائر سے مطالعہ فرمائیں گے تو جہاں ایک طرف ان کی حدت پسندی و وسیع النظری مطلب فہمی جو دت طبعی وقت مزاجی اور سلاست بیانی کے ساتھ شان اجتہادی کی داد دینی ہوگی وہاں دوسری طرف ان کے ذہنی تشوش نظریاتی آویزش مقدارہ روش اور متضاد نگارش کو دیکھ کر آپ دریائے حیرت میں غوطہ لگائے بغیر نہ رہ سکیں گے جس کا مشتے نمونہ از خروار یا قطرہ از بحر ذخار و ذرہ از ریگزار آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

خلافت و ملوکیت کے ص ۲۴ پر امام ابوحنیفہ کی رائے یہ لکھی ہے ”پہلے بزور اقتدار پر قبضہ کرنا اور بعد میں دباؤ کے تحت بیعت لینا اُس کے انعقاد کی کوئی جائز صورت نہیں ہے۔ صحیح خلافت وہ ہے جو اہل الرائے لوگوں کے اجتماع اور مشورے سے قائم ہو۔ ابن ابی ذئب کا قول یہ نقل کیا ہے ”حقیقت یہ ہے کہ خلافت اہل تقوٰے کے اجتماع سے قائم ہوتی ہے اور جو شخص خود اس پر قبضہ کرے اس کے لئے کوئی تقوٰے نہیں ہے۔“

ص ۱۵۹ پر دورِ ملوکیت کی حیرت بیعت کا ردنا روتے ہوئے فرماتے ہیں ”لوگ مسلمانوں کے آزادانہ اور کھلے مشورے سے نہیں بلکہ طاقت سے برسرِ اقتدار آتے رہے بیعت سے اقتدار حاصل

ہونے کے بجائے اقتدار سے بیعت حاصل ہونے لگی۔“

آبائی تقلید کا عقیدہ سے غرض بصیر کرتے ہوئے بنظر انصاف خلیفہ اول حضرت ابوبکر کی انعقادِ خلافت کی تفصیلی تاریخی رپورٹ کا وقت فکر اور امعانِ نظر سے مطالعہ کریں کیا دورِ ملوکیت کی دھاندلی سے اس میں کچھ کمی تھی تاریخی ماخذ میں کانٹ چھانٹ اور کتر بیوت سے مطلب براری کرنے کے بجائے آزادانہ غیر جانبداری سے فیصلہ کریں کہ کیا حضرت ابوبکر کی بیعت سقیفائی مجلس میں اہل رائے

کے اجتماع و مشورے سے قائم ہوئی تھی؛ یا بقول ابن ابی ذئب اہل تقوٰے کے اجتماع سے قائم ہوئی تھی؛ اگر جواب نفی میں ہے تو بعد والی ملکیت اور اس ملکیت میں کیا فرق ہے یہ خلافت کیوں ہے اور وہ ملکیت کیوں ہے؛ اور اگر جواب اثبات میں ہے تو سعد بن عبادہ انصاری اور اس کی جماعت حضرت علی حضرت زبیر عبداللہ بن عباس مقداد بن اسود اور حضرت سلمان وغیرہ جیسے مقتدر اور معزز اصحاب پیغمبر کو اہل رائے اور اہل تقویٰ کیوں نہ قرار دیا گیا؛ اور یہ اجتماع مسجد نبوی کے بجائے سقیفہ بنی ساعدہ میں کیوں کیا گیا؟۔

ضلع ۱۶ پر فرماتے ہیں ”بڑا ظلم کرے گا وہ شخص جو ان دونوں کو ایک درجے میں رکھ دے۔ اور دعویٰ کرے کہ اسلام میں یہ دونوں طریقے یکساں جائز ہیں ایک محض جائز نہیں بلکہ عین مطلوب ہے اور دوسرا اگر جائز ہے تو قابل برداشت ہونے کی حیثیت سے ہے نہ کہ پسندیدہ و مطلوب ہونے کی حیثیت سے۔“

کیا حضرت ابوبکر کے اقتدار پر قبضہ جالینے کے بعد حضرت علی و جملہ بنی ہاشم (جو ان کے گھر میں جمع تھے) جلادینے کی دھمکی دے کر بیعت پر مجبور نہیں کیا گیا تھا؛ کیا حضرت علی کو بیعت نہ کرنے پر قتل کی دھمکی حضرت عمر نے نہیں دی تھی؛ (جیسا کہ سابقہ حوالہ دیا جا چکا ہے) پس بڑا ظالم ہے وہ شخص جو اس قسم کی حاصل شدہ خلافت اور ملکیت میں فرق کر لے۔

خود حضرت عمر کا یہ کہنا کہ ابوبکر کی خلافت کے انعقاد کا جو طریقہ ہم نے ایجاد کیا تھا وہ آئندہ کے لئے ناجائز ہے جیسا کہ مودودی صاحب کے حوالہ سے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ بعد میں اس طریق کار سے جو حکومت برسر اقتدار ہوگی وہ ملکیت ہوگی اور اسی طریق کار سے جو ہم نے حکومت بنائی ہے وہ خلافت ہے۔ مودودی صاحب کا فرمان ہے کہ نصب خلافت کا صحیح طریقہ وہ ہے جو خلافت راشدہ کے انعقاد کے لئے اختیار کیا گیا اور اس کے مقابلہ میں وہ طریقہ ہے جس کو معاویہ اور اس کے بعد والے لوگوں نے اختیار کیا پہلے طریقے کی اسلام نے ہمیں ہدایت کی ہے اور دوسرا طریقہ مجبوراً صرف قابل برداشت ہے نہ کہ پسندیدہ۔ اور ہم نے واضح کر دیا ہے کہ پہلے طریقہ اور دوسرے طریقے میں دھاندلی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ پہلا طریقہ جو حضرت عمر نے اختیار کیا چونکہ حضرت عمر نے اختیار کیا لہذا وہ اسلامی ہے اور دوسری طریقہ جو بعد والے لوگوں نے اختیار کیا چونکہ بعد والوں نے اختیار کیا لہذا غلط ہے اسی فرق کی بنا پر پہلا موجب خلافت ہے۔ اور دوسرا اساس ملکیت پہلے طریقہ میں حضرت عمر نے تحریک کی بغیر کسی مشورہ کے اچانک۔ پھر بیعت کر

لی اور چند آدمیوں نے اس کی تائید کر دی پھر باقیوں کو اقتدار کے زور سے تابع کر لیا گیا اور یہی طریقہ معاویہ اور ابی وائلے لوگوں کا بھی رہا۔ اس کے بعد مرنے سے پہلے اکا جہا ب کے مشورہ کے بغیر حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کی تجویز کی اور باقیوں سے منوالی گئی پھر کسی سے مشورہ لئے بغیر حضرت عمر نے پوری امت کے اختیارات چھ آدمیوں میں بند کر دئے اور خلیفہ کا انتخاب ہو گیا۔ اسی طرح دوسرے طریقے کا رد عمل ہے۔ قضیہ دومۃ الجدل میں حکیم کے موقع پر عمرو عاص نے معاویہ کا نام تجویز کر لیا۔ معاویہ کے طرفداروں نے اس کی تائید کر دی۔ پھر حضرت علی کی شہادت کے بعد پوری امت سے بزور اقتدار بیعت لے لی گئی اور دوسرے خلیفے کی طرح معاویہ نے قبل از مرگ یزید کو نامزد کر دیا اور ہوا خواہوں نے تائید کر دی پھر باقی امت بزور شمشیر تابع کر لی گئی۔ اور یزید کے بعد اموی شوالی کیٹی نے مروان کو منتخب کر لیا۔ تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی سمجھ سکتا ہے کہ ان ہر دو صورتوں میں طریق کار ایک ہی ہے پس منصف مزاج آزادی فکر و رائے رکھنے والے انسان پر مخفی نہیں رہتا کہ رسالت مآب کے بعد سے ہی ملکیت کا دور شروع ہو گیا تھا اور آزادی ضمیر کو کچلنے والی حکومتوں کے لئے راستہ یہیں سے ہوا کہ لیا گیا تھا جو رفتہ رفتہ تدریجاً صحبت پیغمبر کے اثرات سے دور ہوتے ہوتے افسوسناک حالات تک جا پہنچا۔ شروع شروع میں چونکہ لوگوں کی اکثریت اخلاق نبوی اور کردار اسلامی سے مانوس تھی پس حکمرانوں نے بھی نظام اسلامی اور کردار نبوی کو امکانی حدود تک رائج رکھا اور خود بھی ظاہری طور پر اسی کے پابند رہے اور ہر اقتدار پارٹی کے ہوا خواہ پورے زور و شور سے ان حکومتوں کو خلافتوں کا نام دیتے رہے اور خلفا سے سرزد ہونے والی غلطیوں کو دامن تاویل میں چھپاتے رہے اور اختلاف رائے رکھنے والے اکابر دین کو بدعت تنقید بناتے رہے اور ان کے اختلافات کو سیاسی اختلاف کہہ کر حکومت کو اسلامی حکومت کے نام سے پکارتے رہے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اور صحبت نبوی کا زمانہ پرانا ہوتا گیا اسلامی نقوش دلوں سے محو ہوتے گئے حکومتی مشینری کے پُرزے اقتدار کی ہوا اور دولت کی نمی سے رنگ آلود ہوتے گئے حتیٰ کہ کرسی اقتدار سے ہونے والی غلطیوں کی تاویل حامیان اقتدار کے بس سے بھی باہر ہو گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کے بھی خواہ بھی حکومت کو خلافت کا نام دیتے ہوئے شرمانے لگے پس مجبوراً اس کو ملکیت کا نام دے دیا حالانکہ ملکیت کی ابتداء سقیفہ فانی کیٹی کے فیصلے سے ہی ہو گئی تھی۔ حضرت علی علیہ السلام نے پہلے دن سے حکومت وقت کو متنبہ کر دیا تھا کہ یہ ہماری قائم کردہ حکومت ملکیت ہے نہ کہ خلافت اور آپ نے حاکم وقت کے لئے نہ خلیفہ رسول کا لقب جائز قرار دیا اور نہ امیر المومنین کہلانا جائز سمجھا جیسا کہ ابن قتیبہ دینوری کی کتاب الامامۃ والسیاستہ سے حوالہ دیا جا چکا ہے اور حضرت علی علیہ السلام نے جب اپنے متعلق

اپنے ذاتی کمالات اور علم و فضل و فہم و تہذیب و اوصاف کی بنا پر استحقاق خلافت کا دعویٰ کیا تو حکمران پارٹی میں سے کسی نے آپ کے استحقاق کی تردید نہ کی اور نہ آپ کے دلائل کا کسی کے پاس جواب تھا بلکہ سہ ہاری و کیل حضرت ابو عبیدہ بن جراح نے اتنا ہی کہا کہ یہ لوگ سن رسیدہ بزرگوار ہیں آپ ان کے خلاف قدم نہ اٹھائیں اگر زندگی باقی رہی تو اوصاف ذاتیہ و کمالات نفسیہ اور قرابت بنو یہ کے پیش نظر آپ کا زیادہ حقدار ہونا مسلم ہے۔ ابو عبیدہ کے اس قول میں دینی زبان سے انتخاب کی غلطی اور حضرت علی کے دعویٰ کی صداقت کا اعتراف موجود ہے۔ اور بقول ابن قتیبہ حضرت عمر کا یہ کہنا کہ اگر آپ نے بیعت نہ کی تو سر قلم کر دیا جائے گا حضرت علی کے استدلال کا اپنے پاس جواب نہ رکھنے کا کھلا اعتراف ہے۔

علامہ نقضانی نے شرح عقائد لسفیہ (مطبع مجتہبی ص ۱۱) میں وجوب نصب امام کی تین دلیلیں بیان کی ہیں (۱) حضور کا فرمان ہے مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ إِمَامًا زَمَانِهِ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً جو شخص امام زمان کی معرفت کے بغیر مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے (۲) امت کا اجماع ہے کہ وفات پیغمبر کے بعد سب واجبات میں سے اہم نصب امام ہے چنانچہ صحابہ نے دفن پیغمبر پر بھی نصب امام کو مقدم کیا (۳) بہت سے واجبات شرعیہ کی ادائیگی کا دار و مدار چونکہ امام پر ہے اس لئے اس کا نصب کرنا ضروری ہے اور متین عقائد میں ہے کہ مسلمانوں پر امام کا متعین کرنا واجب ہے تاکہ وہ ان میں احکام نافذ کرے اور حدیں قائم کرے وغیرہ اور بالعموم جنازہ رسول کو پس پشت ڈال کر نصب خلیفہ کی جلدی کا عذر یہی بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن مودودی صاحب نے ص ۲۵ پر امام ابو حنیفہ کا قول نقل کیا ہے جب کہ انہوں نے منصور خلیفہ عباسی کے انتخاب کو چیلنج کیا تھا۔

”آپ پر اہل فتویٰ لوگوں میں سے دو آدمیوں کا اجتماع بھی نہیں ہوا حالانکہ خلافت مسلمانوں کے

اجتماع اور مشورے سے ہوتی ہے۔ دیکھیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چھ مہینے تک فیصلے کرنے سے

رکے رہے جب تک کہ اہل مین کی بیعت نہ آگئی۔“

امام ابو حنیفہ کے اس قول سے نصب امام میں جلدی کرنے کے اس بہانے کی قلعی بھی کھل گئی کہ خلافت ابوبکر کو قائم کرنے کی جلدی اس لئے کی گئی کہ نظام امت درہم برہم نہ ہو۔ ان کے مقدمات و احکام میں نفاذ کی تاخیر نہ ہو پس بقول امام ابو حنیفہ اگر ایسا ہوتا تو مینیوں کی بیعت کی اطلاع پہنچنے تک حضرت ابوبکر نے پورے چھ ماہ تک خلافت کے کاموں کو معطل کس لئے رکھا تھا؟ پس خلافت میں جلدی کی وجہ وہی ہے جو مودودی صاحب نے حضرت عمر کی زبانی بیان کی ہے کہ ہم ایسا نہ کرتے تو اقتدار کسی اور کے ہاتھ میں چلا جاتا جس کو نہ ہم رو کر سکتے اور نہ قبول پس مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر ہم نے یہ کام کر دیا ہے لیکن اگر

کوئی اور کرے گا تو ناجائز ہوگا اور بایں ہمہ یہ دعویٰ بھی ہے کہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے بنی آدم کے تمام افراد کو اظہار رائے کا حق حاصل ہے۔ العجب۔

خلافتی الیکشن کا پس منظر

جناب علامہ مودودی صاحب نے تو حقائق کے چہرہ پر گرد ڈالتے ہوئے اپنی حق گوئی کا فریضہ ادا کر دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ”نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے لئے حضرت ابوبکر کو حضرت عمر نے تجویز کیا اور مدینے کے تمام لوگوں نے جو درحقیقت اس وقت پورے ملک میں عملاً نمائندہ حیثیت رکھتے تھے کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی“ خلافت و ملکیت ص ۸۳

اس میں شک نہیں کہ کورانہ تقلید کا عادی تو اس اعلان کو سن کر بالکل مطمئن ہو جائے گا لیکن تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی جس کے حساس دل میں حق طلبی کی شوق ہو وہ ایسی بے تکی ہانکنے والے کے منہ میں حقائق و واقعات کی لگہ نہ دینے سے گریز نہ کرے گا کیونکہ صحابہ کی ایک بہت بڑی جماعت نے دھونس اور دھاندلی سے منعقد ہونے والی خلافت کو سراسر ناجائز بلکہ ایک ڈھونگ قرار دیا ہے ان مقتدر صحابہ میں عشرہ مبشرہ کے چار افراد بھی شامل ہیں حضرت علی حضرت طلحہ حضرت زبیرؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص۔ حوالہ کے لئے تاریخ طبری۔

بسیرت بن ہشام و دیگر کتب تاریخ ملاحظہ ہوں

آل محمد کا منظر یہ

حضرت علی بن ابی طالبؓ۔ ابن قتیبہ دینوری کی مفصل رپورٹ سے حضرت علی علیہ السلام کی پوزیشن واضح ہے کہ آپ خلیفہ کے انتخاب کو جائز نہیں جانتے تھے ملاحظہ ہو کتاب ہذا از ص ۲۵ تا ص ۳۳ اور خلافت کے متعلق مزید تسلی کرنے کے لئے (منہج البلاغہ) میں آپ کا خطبہ شمشقیہ کافی ہے لَقَدْ تَقَمَّصَهَا ابْنُ أَبِي قُحَافَةَ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّ مَحَلَّهَا مَحَلُّ التَّوْبِ مِنَ الرَّحَىٰ یعنی بزور بن ابی قحافہ (ابوبکر) نے قمیص خلافت کو پہن لیا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ میری (مسیحی) نسبت خلافت سے وہی ہے جو مسیح آسیہ کو آسیہ سے ہے۔

يُنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ وَلَا يَرْفَعُنِي إِلَّا الطَّيْرُ مجھ سے علوم (سیداب بن کر جباری ہوتے ہیں اور میرے مناقب کی بندیوں تک پرندہ بھی پرواز کر کے نہیں پہنچ سکتا۔ سلسلہ کلام کو جباری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا فصاحت و فی الملتقى شجى وفى العين قدسى پس میں نے صبر سے کام لیا حالانکہ حلق میں سوزش اور آنکھ میں لگاؤ موجود تھا (منہج البلاغہ) اس کے بعد آپ کا یہ سارا خطبہ آپ کے نہایت کا آئینہ دار اور انصاف طلب آنکھوں کے لئے سہولت

سب باقی رہی آپ کی حکومت وقت سے رواداری اور ان سے حسب ضرورت تعاون تو وہ ان کی رہنمائی کی دلیل نہیں بلکہ ملک و ملت کے وسیع و عظیم تر مفاد کی خاطر آپ کی وسعت قلبی اور دیادگی کا مظاہرہ ہے۔
(۲) جناب خاتون جنت فاطمہ بنت محمدؑ خلافت مجبورہ کے انعقاد پر جناب فاطمہؑ کی مامی کا واقعہ ابن قتیبہ دینوری کی زبانی دھرایا جا چکا ہے۔

علاوہ ازیں جو صحابہ اس اچانک ہونے والے اور دھونس و دھاندلی سے جیتے ہوئے خلافتی الیکشن کو کالعدم قرار دیکر حضرت علیؑ کے لئے بیعت کے مطالبہ پر منہ تھے وہ اس الیکشن کا مکمل بائیکاٹ کر کے احتجاج کے طور پر حضرت علیؑ کے بیت الشرف میں جمع تھے کیونکہ باقی الیکشن میں حضرت ابو بکر کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت مرفوب خلافت کے لئے اپنا نام پیش کرنے کا موقع ہی نہ دیا گیا تھا اور حضرت عمرؓ نے اچانک حضرت ابو بکر کا نام تجویز کر کے ان کے حق میں بیعت طلب کر لی تھی۔ خلافت و حکومت متنازعہ تھی تاہم بلا مقابلہ الیکشن جیتنے کا سہرا ان کے سر پر باندھ کر ان کی مقبولیت و ہر دلعزیزی کا ڈھنڈورا پیٹا جا سکے اور یہ یاد رہے کہ آج کل کا ووٹ اور اس زمانہ کی بیعت دونوں ہم معنی چیزیں ہیں۔ وقت کی نزاکت کے باوجود حضرت سعد بن عبادہ انصاری خزرجی نے بھی امیدوار خلافت کی حیثیت سے اپنا نام پیش کر دیا لیکن قبیلہ اوس و خزرج کی پرانی قلبی رنجش حضرت عمرؓ کو اس آئی او قبیلہ اوس کی مکمل حمایت سے اُن کا دھڑا بھاری ہو گیا چنانچہ سعد بن عبادہ پر دباؤ ڈال کر اس کو اپنا نام لینے پر مجبور کر دیا گیا اس کے بعد اس کی عدائے احتجاج پر کسی نے کان دھرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ اچانک نامزدگی کی بنا پر چونکہ حضرت علیؑ کو اپنا نام پیش کرنے کا موقع نہ دیا گیا تھا تو حضرت ابو عبیدہ انصاری جو سرکاری وکیل ہونے کے علاوہ چیف الیکشن کمشنر کی انتھاری بھی رکھتے تھے آپ نے اس تک اپنی شکایت پہنچائی لیکن اس نے آپ کی شکایت کو جائز اور صحیح قرار دینے کے باوجود الیکشن مذکور کو کالعدم قرار دینے کی جرات نہ کی۔

پس صحابہ کے اس احتجاجی جلسے کو منتشر کرنے اور حضرت ابو بکر کے لئے زبردستی "یا بقول مودودی صاحب برضا و رغبت" بیعت لینے کے لئے حضرت عمرؓ نے مقامی پولیس کے ہمراہ حضرت علیؑ کے گھر کا محاصرہ کیا تو جناب فاطمہؑ کو مخاطب کر کے کہا "مَا أَحَبُّ إِلَيَّ أَبِيكَ مِنْكَ وَمَا ذَاكَ بِمَا نَعِيْ إِنَّ اجْتِمَاعَهُ هُوَ لَأَيُّ النَّفَرِ عِيْدِكَ إِنَّ أَمْرَهُمْ هَذَا يَحْرِقُكَ عَلَيْكَ الْبَابُ كَنَزَالِ الْمَالِ عَلَى قَارِي جِدِّ ۲ ص ۱۴ ترجمہ (میں جانتا ہوں) کہ تیرے باپ (رسول اللہ) کو تجھ سے زیادہ کوئی محبوب نہ تھا تاہم یہ بات مجھے اس امر سے نہیں روکتی کہ اگر یہ لوگ تیرے پاس جمع رہتے تو میں تیرے دروازہ کو جلانے کا حکم دے دوں گا اور اسی نوعیت کے الفاظ الیٰ بنی النضرہ ج ۱ ص ۱۶ اور مروج الذهب اور انساب الاشراف بلذری جلد ۵ ص ۵۸ سے بھی نقل کئے گئے ہیں نیز احراق باب فاطمہؑ کی روایت العقد الفرید ج ۲ ص ۱۶ میں بھی موجود ہے۔

ایک حدیث میں ہے: **وَأَلَّتْ قُلُوبُهُ أَنْ تَخْرُجَ إِلَّا لَاحِشَتَيْنِ شَعْرَتَيْنِ وَالْأَعْيُنُ إِلَى اللَّهِ فَخَرَجَا**
 اُنہی سے کوئی جملہ صحتاً علی ما نقل عندہ۔ ترجمہ: جنابِ نازل نے لوگوں کے چہرے سے فرمایا نکل جاؤ ورنہ میں تم کے بال
 پریشان کر کے بارگاہِ خداوندی میں گرگرا کر تمہارے اوپر برود عا کرونگی پس یہ دو نکل گئے ہوتے اسل و اُنہی شہرستانی بعد ازاں
 سے بی بی عاتقہ کے شکم میں پڑ پڑ کر حضرت عمن کی شہادت بھی منقول ہے۔

۱۱۔ حضرت عباسؓ۔ ان کا ابو بکر کی بیعت سے انکار کرنا تمام کتب تاریخ میں موجود ہے۔
صحابہ کا مزاج ۱۲۔ فضل بن عباسؓ تاریخ یعقوبی ج ۱ ص ۱۲۱ سے منقول ہے آپ نے گروہ قریشی سے
 خطاب کر کے فرمایا: اے قریشیو! یہ خلافت جس طریقہ سے تم نے حاصل کی تمہارے لئے قطعاً ناجائز ہے تمہاری نسبت
 ہم سے زیادہ حقدار ہیں اور ہمارا ساتھی (علی) تمہاری نسبت ان کا زیادہ حقدار ہے۔

۱۳۔ عبداللہ بن عباسؓ۔ ایک دن حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی رو برو گفتگو ہوئی تو حضرت عمرؓ نے کہا تم لوگ
 کہتے پھرتے ہو کہ ہم سے علم و ہدایت کی بنا پر خلافت چھین لی گئی ہے؟ ابن عباسؓ نے جواب دیا ظلم والی بات تو عالم
 و جاہل ہر ایک پر عیاں ہے اور حمد کے متعلق میں اتنا کہتا ہوں کہ ابلیس نے آدمؑ پر حمد کیا تھا اور ہم اس کی تسبیح
 اور داد دی۔ تاریخ طبری جلد ۲ ص ۲۸۹ اور وفات فاطمہؓ کہ کسی بھی ہاشمی نے ابو بکر کی بیعت نہیں کی (روایت الذہبی ج ۱ ص ۱۸۹)
 ۱۴۔ حضرت سلمان بن ابی العدیہ جلد ۲ ص ۱۳۱ سے منقول ہے خلافت کے جو متبادلیکیشن کے بعد آپ نے
 بیعت والی پارٹی کو خطاب کر کے کہا: **أَصْبَحْتُمْ الْخَيْرَ وَالْأَخْيَرُ وَالْمُعَدِّنَ** تم نے سہار دہنی کو پسند کر لیا اور اس
 ذات سے بھٹک گئے ہو جو علوم نبویہ اور فضائل و مناقب کی کان ہے۔

۱۵۔ حضرت ابو ذرؓ وہ صحابی ہے جس کے متعلق حضرت پیغمبرؐ کا ارشاد ہے کہ زمین کی پشت پر اور ننگ نیلوں
 کے سایہ میں ابو ذرؓ سے زیادہ سچی زبان رکھنے والا کوئی نہیں نہ فتنی الیکشن کا افسوسناک نتیجہ سن کر آپ نے فرمایا جو
 کچھ تم نے کیا سو کیا راب اس کے عہد ناک انجام کے لئے تیار ہو اور ظالموں کو اپنے ظلم کا بدلہ ضرور ملے گا۔ مروی از
 تاریخ یعقوبی ص ۱۱۱

۱۶۔ حضرت زبیرؓ جن صحابہ نے متفقہ طور پر الیکشن اور اس کی مبینہ کارروائی کو غلط قرار دیا تھا اور وہ الیکشن
 مذکور کو کالعدم قرار دینے کا ریزولوشن پاس کر کے حضرت علیؓ کے گھر میں جمع تھے۔ ان میں حضرت عباس بن عبد المطلبؓ
 حضرت زبیرؓ حضرت طلحہؓ حضرت سعدؓ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے جب حضرت عمرؓ نے ان کا محاصرہ کیا
 تو حضرت زبیرؓ نے ساف لفظوں میں اعلان کر دیا تھا کہ **لَا نَبَا يَحْ إِلَّا عَلِيًّا** یعنی ہم حضرت علیؓ کے علاوہ کسی کی
 بیعت نہیں کریں گے (تاریخ طبری) آپ گرفتاریاں ہوئیں اور ان کو اس وقت تک رہا نہ کیا گیا جب تک بقول مودودی
 صاحب وہ برضا و رغبت بغیر کسی دباؤ و دپ کے "حقہ بیعت میں شامل نہ ہوئے پس حضرت زبیرؓ کو ظاہر تو غامض کر لیا

گیا لیکن ان کے دل کی آواز کو دبایا نہ جاسکا چنانچہ وہ کسی مقام پر کہہ بیٹھے کہ جب عمر مرے گا تو میں حضرت علیؓ کا نام پیش کر کے ان کے لئے اُسی طریت سے بیعت لوں گا جس طریت سے حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے لئے لی تھی اور یہی الفاظ حضرت عمرؓ تک پہنچا دیئے گئے۔ پناچہ انساب الاشراف بلاذری جلد ۱ ص ۵۵ سے منقول ہے

إِنَّ عُمَرَ قَالَ لَوْ قَدَّمْتُ عُمَرَ بَايَعْنَا عَلِيًّا. حضرت عمرؓ نے اپنی تقریر میں "فرمایا کہ مجھے اللہ علیؓ ہے کہ زبیر کہتا ہے جب عمر مرے گا ہم حضرت علیؓ کی بیعت کر لیں گے اس کے لئے دھکی دیتے ہوئے فرمایا خبردار فَنُ بَايَعُ رَجُلًا عَلَى غَيْرِ مَشُورَةٍ فَإِنَّهَا أَهْلٌ أَنْ يُقْتَلَ ۝۴۰" جس نے بھی مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کی بیعت کی تو وہ دونوں اس لائق ہیں کہ ان کو قتل کیا جائے۔ جناب مودودی صاحب نے خلافت و لوکریٹ میں کسی مخصوص مسلمان کی بنا پر حضرت علیؓ و زبیرؓ کا نام نہیں لیا لیکن روایت مذکورہ کو کتاب کے ص ۸۴ پر بیان فرمادیا۔

اس سے صاف واضح ہے کہ خلافت نبویہ کے اس پہلے الیکشن میں مبینہ دھاندلی کا حضرت عمرؓ کو اعتراف تھا اور اس دھاندلی کو انہوں نے صرف ناجائز ہی نہیں کہا بلکہ اس کے ترکب کو واجب القتل بھی قرار دیا خواہ وہ علیؓ و زبیرؓ کیوں نہ ہوں البتہ اپنے لئے اسی دھاندلی کو جائز قرار دینے کی ایک شق نکال لی کہ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو راتوں رات فیصلہ ہماری منشا کے خلاف ہو جاتا بس کو ہم نہ قبول کر سکتے اور نہ ٹھکرا سکتے۔ جس طرح کہ حضرت علیؓ و زبیرؓ وغیرہ صحابہ کے لئے متذکرہ الیکشن کا نتیجہ کہ اس کو قبول کرنا بھی مشکل تھا اور اس کا ٹھکرا نا بھی مشکل۔

حضرت سعد بن عبادہ خزرجی انصاری۔ سقیۃ بنی ساعدہ جو خلافتی انتخاب کے لئے پہلا پولنگ اسٹیشن تھا جب وہاں انتخابی کاروائی کا رزلٹ (نتیجہ) مرتب ہوا اور حضرت ابوبکرؓ کے مقابل امیدوار حضرت سعد کو انتخاب کرنے سے جبراً روک دیا گیا اور اس کی آواز کو بھی دبا دیا گیا تو بلا متبادلہ حضرت ابوبکرؓ کے لئے رائے عامہ کو سہوار کرنے کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی پناچہ حضرت خاتون جنت کے گھر کا محاصرہ بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم گری تھی پس کرسی اقتدار کو جب قدرے استحکام نصیب ہوا تو دوبارہ سعد بن عبادہؓ کی طرف عنانِ توبہ مبذول کی گئی اور ان کے نام حاضر دربار ہو کر "رضاء و رغبت" شامل بیعت ہونے کا سرکاری فرمان جاری ہوا لیکن وہ اپنے سابق موقف پر نہایت پامردی سے ڈار رہا اور اس نے حکومت کی بانب سے باریحا کردہ حکم کو پاٹے استعمار سے ٹھکراتے ہوئے جواب دیا

أَمَّا وَاللَّهِ حَتَّىٰ أَرْمِيَكُمْ بِمَا فِي كُنَانِي مِنْ نَبْلِ
وَأَخْضِبُ سِنَانِي رُمْحِي وَأَضْرِبُكُمْ سَيْفِي
مَا مَلَكَتْهُ يَدِي وَأَقَاتِلُكُمْ بِأَهْلِ بَيْتِي وَ
مَنْ أَطَاعَنِي مِنْ قَوْمِي وَأَيُّمُ اللَّهُ لَوْ أَنَّ

خدا کی قسم میں اپنے ترکش کے تمام تیر تم پر برساؤں گا اور
اپنے نیزے کی آتی کو زمین کر دوں گا اور جنگ میرے ہاتھ میں
تکوار رہے گی تم پر چلتا رہوں گا اور اپنے خاندان اور اپنی قوم کے
وفا دار افراد کو ساتھ ملا کر تم سے مہر پر جنگ کروں گا اور بخدا اگر

الْحِجَابُ اجْتَمَعَتْ لَكُمْ مَعَ الْإِنْسِ مَا بَايَعْتُكُمْ
 حَتَّى أَغْرِضَ عَلَى رَأْيِي وَأَعْلَمَ مَا حِسَابِي. قَالَ
 عُمَرُ لَا نَدْعُهُ حَتَّى يُبَايِعَ. قَالَ بَشِيرُ ابْنُ
 سَعْدٍ إِنَّهُ لَجَبَّ وَأَبَى وَلَيْسَ بِمُبَايَعِكُمْ حَتَّى
 يُقْتَلَ وَلَيْسَ بِمَقْتُولٍ حَتَّى يُقْتَلَ مَعَهُ وَلَدُهُ
 وَأَهْلُ بَيْتِهِ وَطَائِفَةٌ مِنْ عَشِيرَتِهِ فَأَثَرُكُمْ
 فَلَيْسَ تَرْكُهُ بِضَارِّكُمْ إِنَّمَا هُوَ رَجُلٌ وَاحِدٌ
 فَكَانَ سَعْدٌ لَا يُصَلِّي بِصَلَاتِهِمْ
 وَلَا يَجْتَمِعُ مَعَهُمْ وَلَا يَحِجُّ وَلَا يَفِيضُ
 مَعَهُمْ بِإِقَاضَتِهِمْ فَلَمْ يَزَلْ كَذًا إِلَهُ حَتَّى
 تُوُفِّيَ أَبُو بَكْرٍ وَوُلِيَ عُمَرُ طَبْرِي حُدُودًا ۴۵۹ كُنْزُ الْأَعْمَالِ
 ج ۳ ص ۱۳۴

ہن بھی انسانوں کے ساتھ مل کر تمہاری بیعت کر لیں تو
 میں تمہاری بیعت نہ کروں گا یہاں تک کہ اپنے رب کے پیش ہو کر اپنا
 حساب سمجھ لوں گا۔ عمر نے کہا ہم اس کو بیعت کے بغیر نہ چھوڑیں گے
 تو بشیر بن سعد اسی نے کہا چھوڑیے اس نے خدا اور انکار کر دیا ہے وہ
 ہرگز تمہاری بیعت نہ کرے گا مگر یہ کہ قتل ہو جائے اور وہ تب قتل ہو گا کہ
 اس کے ساتھ اس کے بیٹے اور سارا خاندان اور اس کے قبیلہ کے چیدہ افراد
 بھی قتل ہو جائیں پس اس کو چھوڑیے کیونکہ اس فرد واحد کو چھوڑ دینا تمہیں
 نقصان نہیں پہنچاتا پس اس کے بعد سعد ان کی جماعت میں
 اور نہ ان کے ساتھ جمعہ میں شامل ہوتا تھا اور نہ حج و افاضہ ان کے
 ہمراہ کرتا تھا اور حضرت ابو بکر کی وفات اور حضرت عمر کی تخت
 نشینی تک وہ اسی دستور پر قائم رہا۔

مردی ہے کہ سعد نہ کو ترک وطن کر کے شام چلا گیا حضرت ابو بکر کی وفات کے بعد حضرت عمر نے اس کی طرف
 بیعت کا آرڈر بھیجا لیکن وہ مرد ابن اپنے انکار پر ڈرتا رہا۔ چنانچہ اس قاصد نے اس کو قتل کر ڈالا۔ العقد الفرید جلد ۲ ص ۶۴
 قَالَ الْمَسْعُودِيُّ خَرَجَ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ وَكَلَّمَ يُبَايِعُ فَصَارَ إِلَى الشَّامِ فَقُتِلَ هُنَالِكَ سَنَةَ دَامِنَ الْهَجْرَةِ
 مَرُوفُ الذَّيْبِ ج ۱ ص ۱۹۴ ترجمہ مسعودی نے ذکر کیا ہے کہ سعد نے بیعت نہ کی اور شام کی طرف چلا گیا اور ۱۵ھ
 میں اس کو قتل کر دیا گیا

اس مقام پر نہایت مناسب ہے کہ ایسے دو افراد کی شہادتیں بھی نقل کر دی جائیں جن کو عامۃ المسلمین
تائید مزید کے نزدیک بہت بلند مقام حاصل ہے تاکہ اس پہلے اسلامی الیکشن کے جواز کی قلعی کھل جائے
 جن کو نہایت غیر جانبدارانہ اور منصفانہ برائے انصاف کہتے ہیں متفق دوران تھکتے نہیں اور یہ دو افراد وہ ہیں جن کو شیعیت
 سے دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ ان کا دشمن علی بن ابی طالب بن ابی طالب ہے اور وہ ہیں ابوسفیان اور اس کا بیٹا
 معاویہ امیر شام۔

ابوسفیان۔ یہ شخص ابو بکر کی بیعت کا سخت انکار کرتا تھا اور اس کو کسی قیمت پر جائز نہ دینے تسلیم کرنے پر تیار
 نہ تھا اور الیکشن کے مثبت نتیجہ کے خلاف احتجاج کرنے والوں میں پیش پیش تھا بلکہ اس نے حضرت علیؑ کو سول
 نافرمانی کی طرف لانے کی کوشش میں اڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن حضرت علیؑ کی سابق اسلام دشمنی کے پیش نظر

جاتے تھے کہ یہ شخص مسلمانوں کی نانہ جنگی سے اسلام کو نقصان پہنچانے کی خاطر ہی یہ جتن کر رہا ہے لہذا آپ نے اسکی اس بارے میں ہر پیش کش کو پائے تحقیر سے ٹھکرا دیا۔ ابوسفیان نے ایکشن کا نتیجہ سنتے ہی پہلے دن کہہ دیا تھا اِنِّیْ لَا اَرٰی عَاجَاجَةً لَا یُطْفِئُهَا اِلَّا الدَّمُ۔ یعنی مجھے ایسی گرد نظر آرہی ہے جس کو خون کے سوا کوئی شئی نہ فرو کر سکے گی۔ تاریخ طبری جلد ۲ ص ۴۴۹۔ ابوسفیان کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

بَنِي هَاشِمٍ لَا تَطْمَعُوا النَّاسَ فِيكُمْ

وَلَا سَيِّئَاتِهِمْ

نَبِيٌّ مُّرَّةً أَوْ عَدِي

فَمَا الْأَمْرُ إِلَّا فِيكُمْ وَالْيَكْمُ

وَلَيْسَ لَهَا إِلَّا أَبُو حَسَنِ عَلِي

اے بنی ہاشم تم لوگوں سے بالعموم

اور بنی تیم اور بنی عدی سے بالخصوص بھلائی کی امید نہ رکھو

درحقیقت امر خلافت کو تم میں اور تمہاری طرف ہی پٹنا چاہئے

اور اسکا حق اصرار اے ابوالحسن علی اور

ان تمام باتوں کے باوجود مروی ہے۔ ثُمَّ اَنَّ التَّفَاهُ قَدْ تَمَّ بَيْنَهُمَا وَبَيْنَهُ بَعْدَ تَعْيِينِ

ابنہ یزید بن ابی سفیان امیراً عَلَى الْحَيْثِ الْغَازِي۔ یعنی اس کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے

ابوسفیان کے بیٹے یزید کو مجاہد فورس کا برنیل مقرر کر دیا اور اس سیاسی رشوت کی پیش کش کے بعد ابوسفیان اور ان دونوں

کے درمیان باہمی تعاون پر سمجھوتہ ہو گیا۔ تاریخ طبری جلد ۲ ص ۴۴۹ پس ابوسفیان بھی بقول علامہ مودودی صاحب برضا

ورغبت حلقہ بیعت میں شامل ہو گیا۔

معاویہ بن ابی سفیان۔ معاویہ نے محمد بن ابی بکر کو ایک خط لکھا۔

فَقَدْ كُنَّا وَابُوكَ فِينَا نَعْرِفُ فَضْلَ نَبِيٍّ

ابی طالب وَحَقَّهُ لَا زِمًا لَنَا مَبْرُورًا عَلَيْنَا

فَلَمَّا اخْتَارَ اللَّهُ لِنَبِيِّهِ مَا عِنْدَهُ وَاتَمَّلَ لَهُ

مَا وَعَدَهُ وَاطْهَرَ دَعْوَتَهُ وَابْلَجَ حُجَّتَهُ

وَقَبَضَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ۔ كَانَ أَبُوكَ وَفَارُوقَهُ

أَوَّلَ مَنْ ابْتَرَزَهُ حَقُّهُ وَخَالَفَهُ عَلَى

أَمْرِهِ۔ عَلَى ذَلِكَ اتَّفَقَا وَاتَّسَقَا ثُمَّ

اِتَّجَمَا دَعَاؤُهُ إِلَى بَيْعَتِهِمَا فَأَبْطَأَ

عَنْهُمَا وَتَلَكَّأَ عَلَيْهِمَا فَهَمَّا

بِهِ الْهُمُومُ وَارَادَا بِهِ الْعَظِيمَ۔

ثُمَّ أَنَّهُ بَايَعَهُ لهُمَا وَسَلَّمَهُمَا

ہم اور تیرا باپ ابوبکرؓ مل کر حضرت علیؓ کی فضیلت

کا اعتراف کرتے تھے اور ان کا حق اپنے اوپر واجب

لازم جانتے تھے جب اللہ اپنے نبی کے لئے پسند

فرمایا جو وہ چاہتا تھا اور اُس نے اپنے نبی کے ساتھ

کئے ہوئے وعدے پورے کر دیئے اس کی دعوت کو غالب

اور اسکی دلیل کو واضح کر دیا تو اس کو اپنی طرف بلایا

تیرا باپ اور اس کا ساتھی فاروقؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے

اس کا حق چھینا اور اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہوئے۔

اسی پر دونوں کا اتفاق و اتحاد تھا پھر ان دونوں نے اس کو

اپنی بیعت کی طرف بلایا تو اُس نے گریز کیا اور اپنے اختیاقی

موقف پر قائم رہا پھر انہوں نے اس کو سخت پریشان کیا اور

وَأَقَامَا لَا يُشْرِكَا فِيهِ فِي أَمْرِهِمَا
وَلَا يُطْلِعَا فِيهِ عَلَى سِرِّهِمَا حَتَّى
تَبْصُرَهُمَا اللَّهُ..... فَإِنْ يَكُ مَا نَحْنُ
فِيهِ صَوَابًا فَأَبُوكَ اسْتَبَدَّ بِهِ وَ
نَحْنُ شُرَكَائُهُ وَلَوْ لَا مَا فَعَلَ أَبُوكَ
مِنْ قَبْلُ مَا خَالَفْنَا ابْنَ أَبِيطَالِبٍ
وَلَسَمَّيْنَاهُ وَلَكِنَّا رَأَيْنَا أَبَاكَ فَعَلَّ
ذَلِكَ بِهِ مِنْ قَبْلِنَا فَأَخَذْنَا بِمِثْلِهِ
فَعَبَّ أَبَاكَ بِمَا بَدَا لَكَ أَوْ دَعَّ ذَا لِكَ
مروج الذهب مسعودی جلد ۲ ص ۳۱۶

اس کے متعلق ایک گناؤں نے اقدام کا ارادہ کیا تو اس نے
(بقول مروجہ دینی برضا و رغبت) ان کی بیعت کر لی اور ان سے
مصالحت کر لی تاہم وہ اس کو اپنے کسی معاملہ میں شریک نہ کرتے
تھے اور نہ اپنے رازوں کی اس کو اطلاع دیتے تھے یہاں تک
کہ دونوں کو اللہ نے سنبھال لیا..... پس ہم اب جس موقف پر قائم
ہیں درست ہے یا غلط تیرا باپ ہی اس کا موجب ہے اور ہم اس کے
شرکاء نہیں اگر اس سے پیشتر تیرے باپ نے یہ قدم نہ اٹھایا ہوتا تو
ہم قطعاً علی بن ابیطالب کی مخالفت نہ کرتے بلکہ اس کے سامنے
سر تسلیم خم کر لیتے لیکن ہم نے دیکھا کہ تیرا باپ ہم سے پہلے یہ کام
کر چکا ہے (تو ہمارے بھی حوصلے بڑھے) اور ہم اس کے نقش قدم پر چل پڑے
اب جو تمہارا جی چاہے بڑھلا (اپنے باپ (ابوبکر) کو کہہ دو ورنہ
خاموش رہو۔

معاویہ کے اس خط سے انکشاف ہوتا ہے کہ ایک نہایت گہری سازش کے ماتحت حضرت علیؓ کو منصب
خلافت سے پیچھے ہٹایا گیا پس انتخابی دھونگ بھی اسی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت تھا۔ جمہوری تو تاکید پیغمبر کے
بادہود اسامہ کے لشکر میں شرکت سے پہلو تہی کی گئی۔

شیعہ کش اور جمہور نواز حکومتوں کی کڑی نگرانی میں مرتب ہونیوالی اسلامی تاریخ کے
دعوتِ انصاف وسیع و عریض سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے بھی ڈھونڈنے والوں کو حقیقت و واقعیت
کے تاریخی انمول موتی مل جاتے ہیں جو باطل کی طمع سازی کو لاشٹ از باصم کرنے میں کافی معاون ثابت ہوتے ہیں
پس شیعہ کا جمہوری خلافت کے متعلق اختلافی نظریہ ان کے بے بنیاد جذبات کی پیداوار نہیں بلکہ نبی کریمؐ کی صحبت
سے مبرا دیار ہونیوالے متذکرہ بالاصحابہ کو اس میں اولیت حاصل ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ کڑی اقتدار کی تائید کرنے
والوں کی ہر دور میں بہتات ہوتی ہے اور النَّاسُ عَلَى دِينِ مُلُوكِهِمْ کا مقولہ سو فیصد نہیں تو پچانوے
فیصد یقیناً صحیح ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی دستور عام ہے کہ دھاندلی کرنے والے کسی بھی دور میں اپنی دھاندلی کو
دھاندلی نہیں کہا کرتے بلکہ اپنی منشاء کے مطابق اس کی ایسی تاویل کر لیا کرتے ہیں جس سے عوام کی آنکھوں میں
دھول جھونکی جاسکے۔

یہ یاد رہے کہ تاریخ نویسی اور احادیث کی ترتیب و تدوین اس دور میں ہوئی جب معاویہ کی قائم کردہ

سنت کے ماتحت لوگ علانیہ حضرت علیؑ اور شیعان علیؑ کو سب کرنا ثواب سمجھتے تھے اور انتہائی نفرت ان کے نزدیک دینی قیادت تھی۔ انہذا تلفار کے خلاف زبان کشائی کو گناہ عظیم بلکہ کفر تصور کیا جاتا تھا اور نسل در نسل یہ پروپیگنڈا جاری رہا کہ نہایت مبنی بر انصاف چناؤ ہوا۔ اور تمام لوگوں نے برضا و رغبت کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر ان کی بیعت کر لی تھی جیسا کہ مودودی صاحب نے بھی بدلا کہہ دیا ہے اگر تاریخ اسلام کی تدوین و تالیف کے دور میں شیعان علیؑ کی زبانیں تشدد و استبداد کے قفل سے آزاد ہوتیں تو خلافت الیکشن کے دوران ہونیوالے واقعات کا مزید انکشاف ہوتا۔ تاہم اموی و عباسی پر آشوب دور کے مصنفین کے قلم سے تذکرہ بالا اصحاب پیغمبر کے اختلافی نظریے کا منقول ہونا بھی حق و صداقت کا واضح معجزہ ہے جو مبنی الیکشن کے پوسٹ مارٹم کے لئے کافی دوائی ہے کیونکہ دور رس نگاہیں اس کی بدولت حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے کے لئے حقیقت کی تہ تک باسانی پہنچ سکتی ہیں بشرطیکہ تقلید سلف کا جوا گردن میں پڑا ہوا نہ ہو۔ حارثہ متذکرہ بالا اصحابہ میں سے بعض شیعہ بعض متوسط اور بعض حضرت علیؑ کے مشہور مخالف بھی ہیں

اور اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت عمرؓ خود بھی نظریاتی طور پر منعقدہ خلافت کے بزرگے قائل نہ تھے چنانچہ انہوں نے ایک مرتبہ فرمادیا کہ کَنتَ بِنِعَاةِ ابْنِ بَكْرٍ فَلْتَهُ وَ قِي اَمْلًا شَرَّهَا فَمَنْ عَادَ لِبَيْتِهَا فَاَقْتُلُوْهُ۔ کنز العمال ملا علی قاری جلد ۲ ص ۱۳۹ یعنی حضرت ابوبکرؓ کی بیعت غیر امینی تھی اللہ نے اس کے انجام بد سے بچالیا اگر اس کے بعد کوئی شخص ایسا قدم اٹھائے تو اس کو قتل کر دو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ان کے نزدیک حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کا طریق کار درست ہوتا تو بعد والوں کے لئے اتنا ہی حکم جاری نہ فرماتے یہ الگ بات ہے کہ ان کا ذاتی عمل ان کے نظریہ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ پس ہمارے اس بیان کے بعد ٹوہ لگانے والے افراد کے لئے حق و حقیقت پر پڑی ہوئی باطل کی تہوں کو تحقیق و تدقیق کے تیز ناخنوں سے کرید کر ہٹا لینے کے بعد حق و صداقت کا چہرہ دیکھ لینا نہایت آسان ہے اور کثرت کی ہاؤ ہو آزاد طبع محققین کو کبھی متاثر نہیں کیا کرتی۔ پس شیعان علیؑ کا نظریہ ایک تحقیقی نظریہ ہے جس کو دھونس و دھاندلی یا طمع و لالچ سے کسی دور میں نہیں دبایا جاسکا بلکہ انہوں نے اس نظریہ کے تحفظ کے لئے ہر دور میں بھاری سے بھاری قربانیاں دینے سے بھی کبھی گریز نہیں کیا۔

پس صاف ظاہر ہے کہ ملکیت (سیاسی حکومت) اور امامت (دینی حکومت) کے دو شعبے وفات پیغمبر کے فوراً بعد سے شروع ہو گئے جب کہ حضرت رسالت مآبؐ ان ہر دو شعبوں میں اللہ کی جانب سے حاکم مطلق کی حیثیت رکھتے تھے اور حضرت علیؑ علیہ السلام نے ابن قتیبہ دینوری کی حکایت کے مطابق اپنے دعویٰ میں ان ہر دو شعبوں میں اپنی اہلیت کا اعلان فرمایا تھا کہ دینی شعبہ کے لحاظ سے میں عالم

قرآن فقیہ اسلام اور سنت پیغمبر کا واقف کار ہوں اور سیاسی شعبہ کے لحاظ سے میں رعایا کا ہمدرد اور اُن کے مسائل سمجھنے سلجھانے کی اہلیت رکھنے والا اور ان کے حقوق میں عادلانہ و منصفانہ کردار ادا کرنے والا ہوں اور حضرت علی کے جواب میں سرکاری وکیل حضرت ابو عبیدہ نے جو تقریر کی اس میں اس نے حضرت ابوبکر و عمر کی سیاسی صلاحیتوں کا ذکر ضرور کیا کہ وہ دونوں بزرگوار آپ سے سن رسیدہ اور جہاں دیدہ ہیں لہذا نظام حکومت ان کے ہاتھ میں رہنے دیجئے اور خود دست بردار ہو جائیے اگر وقت نے مہلت دی تو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر آپ ہی اس منصب کے زیادہ سزاوار ہیں حضرت ابو عبیدہ نے حضرت ابوبکر کی دینی برتری کا قطعاً تذکرہ نہیں کیا صرف نظام حکومت میں تجربہ کار کہہ کر اس کے حق میں سفارش کر دی اور حضرت علی کی اعلیٰ قابلیت کا صاف لفظوں میں اعتراف کر کے اس بات کو واضح کر دیا کہ دینی اقتدار میں تو آپ سب سے زیادہ حقدار ہیں لہذا دینی حکومت تو آپ کی ہی ہے لیکن سیاسی حکومت اور ظاہری سلطنت فی الحال ابوبکر کے ہاتھ میں رہنے دیجئے اگر وقت نے ساتھ دیا تو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے پیش نظر آپ کی باری بھی آجائے گی۔

اس مختصر مگر جامع رواد کے بعد اس قدر اندازہ لگانا تو نہایت آسان ہو گیا کہ وفات پیغمبر کے فوراً بعد ہی مسلمانوں میں اختلاف و انتشار کا بیج بوسدیا گیا جس کے نتیجے میں مسلمان دو اہم گروپوں میں تقسیم ہو گئے ایک برسر اقتدار طبقہ اور ان کے ہم نوا وہی خواہ اور دوسرا وہ گروہ جنہوں نے اس انتخاب کو غیر قانونی اور غیر شرعی قرار دیا ان کے سربراہ حضرت علی علیہ السلام تھے۔ پہلا گروہ عامۃ المسلمین کا ہے اور دوسرا گروہ شیعان علی کا ہے چنانچہ مودودی صاحب فرماتے ہیں "حامیان علی کا گروہ ابتدا میں شیعان علی کہا جاتا تھا بعد میں اصطلاحاً انہیں صرف شیعہ کہا جانے لگا" ص ۲۱



نظراتی فرق کی وجہ

پہلا گروہ (عامۃ المسلمین) برسرِ اقتدار جماعت کا حامی تھا بنا بریں ان کی اکثریت متوقع اور فطری ہے
دوسرا گروہ (شیعان علی) جو برسرِ اقتدار طبقہ سے ذہنی طور سے برسرِ پیکار تھا ان کا قلیل ہونا بعید
از قیاس نہیں۔

چونکہ قرب پیغمبر کا زمانہ تھا اور لوگوں میں اسلامی و شرعی اقدار رچ چکے تھے اس لئے اگر برسرِ اقتدار
طبقہ اپنے اقتدار کو اسلامی اقتدار نہ ثابت کرتا تو یقیناً ان کی حکومت پائیدار نہ ہو سکتی لہذا انہوں نے
اپنے حاصل کردہ اقتدار کو نیابت پیغمبر خلافت رسول اور امارت مومنین (اسلامی جمہوریت) کا نام دے
دیا۔ پس ان کے واعظین و مقررین و خطباء نے بڑے زور شور سے اس کا پروپیگنڈہ کیا اور سرکاری جماعت کے
بعض اہم ارکان نے اگرچہ غیر شعوری طور پر بعض اوقات اپنے طریق کار کو غلط کہہ دیا جیسا کہ حضرت عمر کا قول
گذر چکا ہے لیکن اس کی تہ تک پہنچنے کی کسی نے جرات نہ کی اور نیابت پیغمبر اور خلافت اسلامیہ کے لیبل
سے مرعوب ہو کر عوام نے اس کے جواز و عدم جواز کی بحث کو چھڑنا ہی پسند نہ کیا۔

برسرِ اقتدار جماعت نے اپنی غلطی پر گہرا پردہ ڈالنے کے لئے ایک ایسا حربہ استعمال کیا جو اچھے بھلے
انسانوں کے لئے بھی حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے مستقل الجھن بن کر رہ گیا اور وہ یہ کہ حضور کی
طرف ایسی احادیث کی نسبت دے دی گئی جن کو عقلی طور پر کوئی ذی ہوش قبول کرنے کے لئے تیار نہیں
ہو سکتا البتہ اقتدار کی جڑیں ان سے خوب مضبوط ہوئیں۔ مثال کے طور پر چند کا تذکرہ ضروری ہے جو مشہور
بین المسلمین ہیں۔

(۱) اصْحَابِيْ كَالْجُحُوْمِ بِاَيِّهِمْ اَقْدَبْتُمْ
اَهْتَدَيْتُمْ۔

میرے اصحاب آسمانی ستاروں کی طرح ہیں ان میں
جس کی تم اقتدار کرو گے ہدایت پاؤ گے (اس میں نیک و

بد کی کوئی تیز نہیں ہے اور یہ چیز یقیناً خلاف عقل ہے لیکن اقتدار کے لئے بہت مفید ہے)

(۲) خَيْرُ الْقُرُونِ قُرُونِيْ۔ الخ میرا قرن سب قرون سے بہتر ہے۔ الخ۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا
کہ اس قرن کے تمام انسان خیر ہیں اور ان کا ہر اقدام خیر ہے لیکن عوام کے ذہن نشین یہی کر دیا گیا کہ اس قرن کے
انسانوں میں سے جو انسان جو کام بھی کرے خواہ اچھا یا بُرا اس پر تنقید نہ کی جائے۔

(۳) حضور کی طرف ایک حدیث منسوب کر دی گئی کہ میرے صحابہ کو برا نہ کہو اور شرح عقائد میں نقاظانی نے
کئی اور احادیث کا ذکر بھی کیا ہے۔

یہ اور اس قسم کی بہت سی حدیثیں بالعموم صحابہ کے حق میں پیش کی گئیں اور برسرِ اقتدار لوگوں کی شان میں بالخصوص جو احادیث منظرِ عام پر آئیں ان کا تو کوئی حساب و شمار ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام لوگوں میں اچھے و بُرے کی تمیز تک نہ رہی اور کرسیِ اقتدار کی طرف ناقدانہ انگشت نمائی ایک بہت بڑی جبارت قرار دے دی گئی اور انتقالِ اقتدار کی ترتیب کے لحاظ سے افضلیت کا عقیدہ جزوِ ایمان بنالیا گیا۔ حالانکہ اس پر نہ کوئی حدیث صحیح ناقل ہے اور نہ کوئی عقلی دلیل اس کی پشتِ پناہی کرتی ہے۔ حضرت ابوحنیفہ کے عقیدہ کی وضاحت مودودی صاحب نے یہی کی ہے۔ انہوں نے اجتماعی عقیدہ یہی قرار دیا کہ فضیلت کی ترتیب وہی ہے جو خلافت کی ترتیب ہے، ۲۳۲ اور اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کا اقتدار افضلیت کے تابع نہیں بلکہ ان کی افضلیت اقتدار کی تابع اور اس کی مرہونِ منت ہے یا دوسرے لفظوں میں ان کی حکومت پر فضیلت کا سایہ نہیں بلکہ ان کی فضیلت پر حکومت کا سایہ ہے۔ اور صحابہ کے متعلق عقیدہ طحاویہ سے تفصیل یہ نقل کی ہے کہ ”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب کو محبوب رکھتے ہیں ان میں سے کسی کی محبت میں حد سے نہیں گذرتے اور نہ کسی سے تبری کرتے ہیں ان سے بغض رکھنے والے اور بُرائی کے ساتھ ان کا ذکر کرنے والے کو ہم ناپسند کرتے ہیں اور ان کا ذکر بھلائی کے سوا کسی اور طرح نہیں کرتے“ ۲۳۳۔

ان عقائد و احادیث مذکورہ کے نتیجے میں صحابہ کو تنقید سے بالاتر کر دیا گیا۔ ان کے اقتدار کی جڑیں خوب مضبوط ہوئیں اور سیاسی برسرِ اقتدار جماعت مذہبی پیشروں کی حیثیت اختیار کر گئی اور ان کے نظریات و اقوال جزوِ مذہب قرار پا گئے اور صحابہ کی غلطی کو غلطی کہنا ناجائز سمجھا گیا۔ جتنی کہ ایک صحابی اگر دوسرے صحابی کا قاتل ہو گیا تو قاتل و مقتول دونوں کو رضی اللہ عنہ کہہ کر عقیدہ کی لاج رکھ لی گئی۔ جنگِ جمل میں ہزاروں کی تعداد میں صحابہ مارے گئے تو عقیدہ یہی رہا کہ مارے جانے والے شہید بھی رضی اللہ عنہم اور مارنے والے مجاہد بھی رضی اللہ عنہم۔ ہم کسی کو بُرا نہیں کہتے جنگِ صفین میں ہزاروں کی تعداد میں مارے جانے والے بھی شہید رضی اللہ عنہم اور مارنے والے بھی رضی اللہ عنہم ہو گئے۔ جنگِ صفین میں حضرت عمار بن یاسر صحابی رسول کا سر کاٹ کر معاویہ کے پاس لے جایا گیا لیکن ہیں دونوں رضی اللہ عنہما ۱۶۴۔ حضرت جبر بن عدی عابد و زاہد صحابی رسول کو معاویہ نے قتل کر دیا لیکن دونوں رضی اللہ عنہما رہے اسی طرح معاویہ اعظمیہ منبروں پر کھائے بندوں حضرت علی پر سب و لعنت کرتا اور کرواتا رہا لیکن دونوں رضی اللہ عنہما ہیں ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ جناب فائز بہت رسول کو ابوبکر نے حق نہ دیا اور وہ بقول بخاری شریف ناراض ہو کر پائے میں تادمِ زلیت ان سے قطعِ تعلقی جاری رکھی اور بقول ابن قتیبہ دینوری ہر نماز کے بعد ان پر نفرین کرتی رہی

لیکن دونو عقیدہ کے لحاظ سے رضی اللہ عنہما ہیں۔ اسی طرح حضرت عمر بن حنظلہ غزالی جو صحابی رسول تھا حضرت عثمان کے قاتلوں میں ہے اور اُس کا سر کاٹ کر دمشق میں معاویہ کے پاس بھیج دیا گیا لیکن چونکہ سب کے سب صحابی ہیں لہذا ان سب کے متعلق عقیدہ اچھا رکھنا ہے اور ان میں سے کسی پر ناقدانہ زبان کھولنا حرام ہے اور اسی اندھا دھند آبائی تقلید ہی کا نتیجہ ہے کہ مودودی صاحب کی محققانہ جستجو بھی اسی عقیدہ سے جا بجا مرعوب ہے چنانچہ وہ تاریخی دستاویزات میں سے صرف اسی قدر مواد کو نقل کرتے ہیں جو ان کے مقلدانہ عقیدہ سے متصادم نہ ہو اور اسی بنا پر دیدہ و دانستہ انعقادِ خلافت کی دھاندلیوں اور غیر آئینی و غیر شرعی کاروائیوں سے چشم پوشی کرتے رہے ہیں اور اسے شرعی و اسلامی جمہوریت قرار دے کر آبائی تقلید کی لاج رکھتے رہے ہیں لیکن خلفاء کی بے قاعدگیوں اور خلافتِ شرح کارستانیوں کو دیکھ کر آخر ان کا پانیہ صبر جب لبریز ہوا تو عثمان و معاویہ کی اکثر و بیشتر اغلاط پر پردہ ڈالنے کے باوجود بعض کی نشان دہی کردی اور آبائی تقلید کو اپنی تحقیق کی شہ پر ٹھکراتے ہوئے ان کو غلط کار کہہ دیا ^{۱۵۳} تو پورے ملک میں عامۃ المسلمین کی طرف سے مودودی کا فر ہے، کے نعرے بلند ہوئے حتیٰ کہ شہروں میں دیواروں پر جابجا موٹی قلم سے لکھا ہوا یہ فقرہ ہر ایک نے دیکھا حالانکہ مودودی صاحب آبائی تقلید کے پیش نظر اس امر میں پورے محتاط ہیں کہ معاویہ کی لاتعداد غلطیاں نقل کرنے کے باوجود اُس کے احترام سے منحرف نہیں ہیں۔

بقول مودودی صاحب معاویہ کی غلط کاریاں

آبائی تقلید کے ماتحت کافی احتیاط بلکہ جنبہ داری کو ملحوظ رکھنے کے باوجود معاویہ کی جن غلطیوں کا خلافت و ملوکیت میں ذکر ہوا ہم ان کا سرسری جائزہ لیتے ہیں اور ان غلطیوں کے باوجود عامۃ المسلمین کا ان کے متعلق نظریہ بیان کرتے ہیں۔

(۱) حضرت عثمان کی شہادت (۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ) کے بعد حضرت نعمان بن بشیر ان کا خون سے

بھرا ہوا قمیص اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں حضرت معاویہ کے پاس دمشق لے

ئے اور اس تقلید کا نتیجہ ہے کہ دو مختار بادشاہوں یا گروہوں میں سے ایک کو برقی کئے کے باوجود دوسرے کو ناحق کہنے سے گریز

کرتے ہیں چنانچہ امام ابو حنیفہ کا عقیدہ صحابہ کی خانہ جنگی میں یہ نقل کیا ہے "چنانچہ وہ صاف طور پر یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کی جن لوگوں

سے بھی جنگ ہوئی (اور ظاہر ہے کہ اس میں جنگِ جمل و صفین کے شرکاء شامل ہیں) ان کے مقابلہ میں علی زیادہ برسرِ حق تھے لیکن وہ

دوسرے فریق کو مطعون کرنے سے قطعی پرہیز کرتے ہیں" اور یہ واضح رہے کہ جنگِ جمل میں حضرت علی کے مقابل شکست خوردہ فریق

کی اصل قائد حضرت عائشہ تھیں ^{۱۵۴} طلحہ و زبیر دونو حضرت عائشہ کے ہمراہ تھے اور دونو جنگِ جمل میں مارے گئے ^{۱۵۵}۔

گئے اور انہوں نے یہ چیزیں منظر عام پر لٹکا دیں تاکہ اہل شام کے جذبات بھڑک اٹھیں یہ اس بات کی کھلی علامت تھی کہ حضرت معاویہ خون عثمان کا بدلہ قانون کے راستہ سے نہیں بلکہ غیر قانونی طریقہ سے لینا چاہتے ہیں۔ الخ ص ۱۳۲۔

۱۲ گورنر ہونے کی حیثیت سے انہیں کوئی حق نہ تھا کہ جس خلیفہ کے ہاتھ پر باقاعدہ آئینی طریقے سے بیعت ہو چکی تھی جس کی خلافت کو ان کے زیر انتظام صوبے کے سوا باقی پوری مملکت تسلیم کر چکی تھی اس کی اطاعت سے انکار کرتے ص ۱۳۶۔

۱۳ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جو حضرت علی کی فوج میں شامل تھے حضرت معاویہ کی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے حضرت عمار کے متعلق نبی کا یہ ارشاد صحابہ میں مشہور و معروف تھا اور بہت سے صحابیوں نے اس کو حضور کی زبان مبارک سے سنا تھا کہ تَقْتُلُكَ الْفِئَةُ الْبَاغِيَّةُ (تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا ص ۱۳۷) متعدد صحابہ و تابعین جو حضرت علی اور حضرت معاویہ کی جنگ میں مذبذب تھے حضرت عمار کی شہادت کو یہ معلوم کرنے کے لئے ایک علامت قرار دے لیا تھا کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون؟ ص ۱۳۸ قتل عمار کے بعد یہ بات ظاہر ہو گئی کہ حق حضرت علی کے ساتھ تھا اور اہل سنت اس بات پر متفق ہو گئے ص ۱۳۹ اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ حضرت علی حق پر ہیں اور حضرت معاویہ باغی ہیں ص ۱۴۰ (البداية)

۱۴ جنگ صفین میں معاویہ کی فوج کا حضرت علی کو دھوکہ دینے کے لئے قرآن گونیزوں پر چڑھانے کے متعلق کہتے ہیں یہ ایک ان کی جنگی چال تھی قرآن کو حکم بنانا سرے سے مقصود ہی نہ تھا ص ۱۴۱ جن لوگوں نے اس غلطی کو خطا اجتہادی قرار دیا ان کی تردید میں لکھتے ہیں "شبه ہمارے لئے رسول اللہ کے تمام صحابہ واجب الاحترام ہیں اور بڑا ظلم کرتا ہے وہ شخص ان کی غلطی کی وجہ سے ان کی ساری خدمات پر پانی پھیر دیتا ہے اور ان کے مرتبہ کو بھول کر گایاں دے پڑتا آتا ہے مگر یہ بھی کچھ کم زیادتی نہیں ہے کہ اگر ان میں سے کسی نے کوئی غلط کام کیا ہو تو ہم محض صحابیت کی رعایت سے اس کو اجتہاد قرار دینے کی کوشش کریں آگے چل کر رقمطراز ہیں "لیکن جان بوجھ کر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق غلط کام کرنے کا نام اجتہاد ہرگز نہیں ہو سکتا" پھر فرماتے ہیں "کوئی غلط کام محض شرف صحابیت کی وجہ سے مشرف نہیں ہو جاتا بلکہ صحابی کے مرتبہ بلند کی وجہ سے وہ غلطی اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے" ص ۱۴۲۔

۱۵ معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے لئے خوف و طمع کے ذرائع سے بیعت لی ص ۱۴۸۔

یزید کی ولی عہدی کے لئے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک بزرگ (مغیرہ بن شعبہ) نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے دوسرے بزرگ (معاویہ) کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا۔ اسی ضمن میں آگے چل کر لکھتے ہیں: حضرت معاویہ کے مفاد و مناقب اپنی جگہ پر ہیں ان کا شرف صحابیت بھی واجب الاتمام ہے۔ ان کی یہ خدمت بھی ناقابل انکار ہے کہ انہوں نے پھر سے دنیائے اسلام کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا۔۔۔۔۔ اُن پر جو شخص لعن طعن کرتا ہے وہ بلاشبہ زیادتی کرتا ہے لیکن ان کے غلط کام کو تو غلط کہنا ہی ہو گا۔ ص ۱۵۳

(۶) وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے اور جب وہ خلیفہ بن گئے تو لوگوں کے لئے بیعت کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں: ”جس کا مطلب یہ ہے کہ امام حسن کی دست برداری کے بعد خوزیری اور بنو ظلمی کے خوف سے تمام صحابہ و تابعین و صلحائے اُمت نے ان کی بیعت پر اتفاق کیا اور اس کو ”عام الجماعت“ اس بنا پر قرار دیا کہ کم از کم باہمی خانہ جنگی تو ختم ہوئی۔“ ص ۱۵۸۔

نوٹ۔ محقق دوران کے اس تہافت کو دیکھیے کہ زور سے اس کا خلیفہ بن جانا اس کی غلطی شمار کی ہے اور چونکہ اس کی اس غلطی کے نتیجے میں لوگ ڈر کے مارے اس کی بیعت کر کے ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئے بنا بریں اسی غلطی کو ص ۱۵۳ پر اس کی اسلامی خدمت قرار دیا ہے۔

(۷) زاید و متقی و صالح اُمت اور صحابی رسول حضرت حجر بن عدی کا قتل اور دیگر ان لوگوں کا قتل جو علی سے برأت کا اظہار نہ کرتے تھے ص ۱۶۵۔

حسن لبرری فرماتے ہیں حضرت معاویہ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب بھی کرے تو وہ اس کے حق میں مہلک ہو (موجب جہنم ہو) ایک ان کا اس اُمت پر تلوار سنت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا درالخالیکہ اُمت میں بقایائے صحابہ موجود تھے دوسرے ان کا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا حالانکہ وہ شرابی اور نشہ باز تھا۔ ریشم ہنپتا اور طنبورے بجاتا تھا۔ تیسرے ان کا زیاد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا۔ چوتھے ان کا حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دینا ص ۱۶۶۔

(۸) ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب دشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے حتیٰ کہ مسجد نبوی میں منبر رسول پر عین روضہ نبوی کے سامنے حضور کے محبوب ترین عزیز (علی) کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علی کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار

اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ ص ۱۷۱۔

(۹) مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہ نے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی ص ۱۷۲۔

(۱۰) زیاد بن سمیہ کا اشتقاق بھی حضرت معاویہ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔۔۔ حضرت معاویہ کے والد جناب ابوسفیان نے اس لوٹڈمی (سمیہ نامی) سے زنا کا ارتکاب کیا تھا اور اسی زیاد سے وہ حاملہ ہوئی۔۔۔ زیاد انہی کے لطف سے ہے۔۔۔ حضرت معاویہ نے اس کو اپنا حامی و مددگار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زنا کاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچا یا کہ زیاد انہی کا ولد الحرام ہے پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ ص ۱۷۵۔

(۱۱) حضرت معاویہ نے اپنے گورزوں کو قانون سے بالاتر قرار دے دیا۔ ص ۱۷۵۔

(۱۲) معاویہ کے ایک گورز نے ہمدان کو فتح کر کے (جو علی کے قبضہ میں تھا) وہاں کی مسلمان عورتوں کو لوٹڈیاں بنالیا حالانکہ شریعت میں اس کا کوئی جواز نہ تھا ص ۱۷۶، ص ۱۷۷۔

(۱۳) صحابی رسول عمار بن یاسر اور عمرو بن حمق غزاعی صحابی کے سر کاٹ کر معاویہ کی طرف بھیجے گئے۔ ص ۱۷۷۔

(۱۴) حضرت معاویہ کے عہد میں سیاست کو دین پر بالا رکھنے اور سیاسی اغراض کے لئے شریعت کی حدیں توڑنے کی ابتدا ہوئی ص ۱۷۹۔

(۱۵) حضرت معاویہ کا جب مصر پر قبضہ ہوا تو انہیں (محمد بن ابی بکر کو) گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا اور پھر ان کی لاش ایک مردہ گدھے کی کھال میں رکھ کر جلانی گئی۔ ص ۱۷۸۔

دعوتِ فکر
قارئین کرام! اپنے قلب و جگر پر ہاتھ رکھ کر ان غلطیوں کو پڑھیں اور مودودی صاحب کی اس دریا دلی کی بھی داد دیں کہ باوجود ان سنگین جرائم کے اس کے محامد و مناقب کے قائل بھی ہیں اور شرفِ صحابیت کی بنا پر اسے واجب الاحترام بھی قرار دیتے ہیں اور یہ اصرار بھی ساتھ ہے کہ اس کے غلط کام کو بہر حال غلط کہنا ہوگا۔ ص ۱۷۵۔

اندازہ کیجئے ایک شخص اپنی ہوس پرستی و جاہ طلبی کی خاطر اسلامی حکومت کا حلیہ بدلتا ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے اُمتِ اسلامیہ کو ملکیت کی الجھنوں میں ڈالنے کا مرتکب ہے۔ آئینی اسلامی خلیفہ کا منکر ہے اور حضرت عمار بن یاسر اور حجر بن عدی ایسے متقی صحابہ کا عہدِ قاتل ہے اور بایں ہمہ وہ واجب الاحترام صحابی ہے اور اپنی عمدی خطا سے جنگِ صفین کے موقع پر ہزاروں مسلمانوں کے قتل کا موجب ہے جن میں

اکابر صحابہ بھی تھے اور بقول مودودی یہ غلطی خطا اجتہادی نہیں بلکہ عمدی غلطی ہے لیکن پھر بھی وہ واجب الاحترام ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ اسی آباؤی اندھی تقلید کی کرم فرمائی ہے کہ تحقیق کے ناخن اس کے وحشیانہ ضمیر اور منافقانہ خمیر پر پڑے ہوئے صحابیت کے وقار کی خوشنما چادر کو تار تار کرنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں لیکن آباؤی تقلید فوراً تحقیقی فیصلہ پر تغافل عالمانہ اور تجاہل عارفانہ کی گرد و ال کر اسے محفوظ کر لیتی ہے۔ دیکھئے ابلیس نے ہزاروں برس عبادت کی لیکن نافرمانی کے بعد یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی غلطی بہر حال غلطی ہے لیکن اس کے تقدس و عبادت کا احترام باقی رہنا چاہیے کیونکہ فرشتوں کا صحابی بن کر بلکہ بقول مشہور معلم الملائکہ ہو کر کافی عرصہ تک تسبیح و تقدیس اور تکبیر و تہلیل میں رطب اللسان رہا۔ مودودی صاحب حجاج بن یوسف کے متعلق لکھتے ہیں۔ "قرآن پر اعراب لگوانا اس کی وہ نیکی ہے جس کی تعریف رمتی دنیا تک کی جائے گی۔ مگر کسی کی ساری نیکیاں بھی ایک مومن کے قتل ناحق کی ہموزن نہیں ہو سکتیں" ص ۱۸۵۔ نہ معلوم ہزار ہا مومنوں کے قتل کے باوجود معاویہ کے مجاہد و مناقب میں کیوں کمی نہ ہوئی کہ مودودی صاحب اس کو پھر بھی واجب الاحترام سمجھنے پر مصر ہیں حالانکہ جنگ صفین کے معاملہ میں اس کی غلطی کو خطائے اجتہادی کہنے کو بھی تیار نہیں اور اس کو عمدی غلطی کہنے کی جسارت کرتے ہیں اور اس نظریہ میں تمام معاصر اہل سنت علماء کی تکفیر کی بھی پرواہ نہیں کرتے پس مجبوراً ماننا پڑتا ہے کہ یہ آفت آباؤی کو رازہ تقلید کا ہی نتیجہ ہے علاوہ ازیں حسن بصری کے قول کے مطابق اس سے مہلک غلطیوں کا سرزد ہونا یزید کو ولی عہد بنانا علی پر سب و شتم کرنا اور سنت رسول کی خلافت ورزی کرنا سب کچھ تسلیم ہے لیکن احترام پھر بھی بحال ہے۔ ذرا اور آگے چلئے حیا کا جنازہ نکال دیا اور غیرت کا ستیاناس کر دیا جب کہ اس نے اپنے والد کی زنا کاری پر مجمع عام میں گواہ طلب کر کے زیاد کو اپنا ولد الحرام بھائی ثابت کر دیا میرے خیال میں بڑا ظالم ہے وہ شخص جو اس قدر محققانہ بحث و محیس میں پڑنے کے بعد بھی اسلام کش ایمان فروش اور دین دشمن انسان کو واجب الاحترام سمجھنے پر مصر ہو۔ خود مودودی صاحب کا اعتراف ہے کہ شرف صحابیت کی وجہ سے کوئی غلط کام شرف نہیں ہو جاتا بلکہ صحابی کے مرتبہ بلند کی وجہ سے وہ غلطی اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے ص ۱۲۳ اگر تحقیق و انصاف کا تقاضا یہی ہے تو جس طرح حجاج بن یوسف کی تمام نیکیاں ایک قتل ناحق کے برابر نہیں حالانکہ وہ صحابی بھی نہیں ہے تو صحابی ہونے کے بعد معاویہ کی نیکیاں ہزار ہا صحابیوں کے قتل کے برابر کس طرح ہوں گی؟ اللہ کا توصاف فرمان ہے مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فِجْزَاءُ ۖ جَهَنَّمَ۔ جو مومن کو عمدہ قتل کرے اس کی جزا جہنم ہے۔ اور سنت کو مٹانے اور بدعات کو جاری کرنے والے صحابہ کے متعلق جناب رسالت مآب کا فرمان بلا حلف فرمائیے صرف دو حدیثوں کا ترجمہ ذکر کرتا ہوں۔

۱۔ صحیح بخاری ترجمہ مزاحیرت دہلوی حدیث ۱۲۸۱ ابن عباس سے اسی حدیث کے ذیل میں ہے کہ آپ نے فرمایا سب سے پہلے ابراہیم کو کپڑے پہنائے جائیں گے اور جو شیار جو کہ چند آدمی میری امت کے لائے جائیں گے اور فرشتے ان کو دوزخ کی طرف لے جائیں گے اس وقت میں کہوں گا اے رب یہ تو میرے صحابی ہیں اللہ کی جانب سے ندا آئے گی تو نہیں جانتا انہوں نے تیرے بعد کیا کیا؟ یہاں تک کہ فرمایا پھر اللہ کی طرف سے ندا آئے گی کہ یہ لوگ تیرے محمد کے ابدال ہونے کے بعد ہی مرتد ہو گئے تھے۔

۲۔ ترجمہ بخاری مزاحیرت دہلوی ج ۳ حدیث ۱۹۳۲ عبد اللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں عرض کوثر پر تمہارا پیش خیمہ ہوں گا اور تم میں سے چند لوگ میرے سامنے لائے جائیں گے یہاں تک کہ جب میں ان کو (کوثر کا پیالہ) دینا چاہوں گا تو وہ لوگ میرے پاس سے کھینچ لے جائیں گے۔ میں عرض کروں گا اے میرے پروردگار! یہ لوگ تو میرے اصحاب ہیں۔ خدا تعالیٰ فرمانے کا تم نہیں جانتے کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا بدعتیں کی ہیں؟

۱۔ قاتل مومن ہونے کے بعد کسی شخص کا خدا کے نزدیک کوئی احترام نہیں بلکہ وہ بکا دوزخی ہے (قرآن)

۲۔ جہنمی ہونے کی صورت میں اللہ کے نزدیک صحابیت کا کوئی احترام نہیں اور قاتل مومن جہنمی ہے (بخاری)

۳۔ بدعتی ہونے کے بعد وہ کوثر کا مستحق نہیں خواہ صحابی رسول ہی کیوں نہ ہو۔ (بخاری شریف)

اور بقول مودودی صاحب سنت معاویہ ایک دو نہیں بلکہ نہ بار بار کا جن میں کافی تعدد صحابہ مومنین کی بھی ہے قاتل ہے اور بدعات کے جاری کرنے کا تکب بھی ہے پس آیت وحدیث کی روت سے جب اس کی صحابیت کا احترام نہ رہا تو مودودی صاحب نہ معلوم آبا فی تخلید سے کیوں اس قدر مدعوب ہیں کہ دلیل و برہان سے صلح شدہ نتائج کو چھوڑ کر ایک ہی رٹ لگانے جا رہے ہیں کہ ہم ان کو غلط کار کہیں گے لیکن ان کے محامد و مناقب اور صحابیت کے پیش نظر ان کو واجب الاحترام بھی مانیں گے۔

نیز مزید بن معاویہ کے متعلق شرابی و نشہ باز ہونا اور ناجائز سخت حکومت پر قابض ہو کر شرعی تقاضوں کو اس کا پامال کرنا مودودی صاحب کے نزدیک مستحکم ہے مثلاً یہ قتل حسین میں وہ سخت مجرم ہے ساری کاروائی جو میدان کربلا سے لے کر کوفے اور دمشق کے درباروں تک کی گئی اس کا ایک ایک جزو قطعاً حرام اور سخت ظلم تھا جو لوگ ابن زیاد کو اس کا مدد و قار دے کر مزید کو برمی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے جواب میں مودودی صاحب لکھتے ہیں یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے کہ اس ظالم عظیم پر اس نے اپنے اس سرچرے کو زکوٰۃ کیا سزا دی؟ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس نے ابن زیاد کو نہ کوئی سزا دی نہ اسے معذرت کیا نہ اسے ملامت ہی کا کوئی خط لکھا۔ اس کے بعد مزید نبوی کی توہین کی ایسی سیاہ کاری ہے جس کو اسلام

کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ تین دنوں میں شہر کے اندر ہر طرف لوٹ مار کی گئی شہر کے باشندوں کا قتل عام کیا گیا جس میں امام زہری کی روایت کے مطابق سات سو معززین اور دس ہزار کے قریب عوام مارے گئے اور غضب یہ کہ وحشی فوجیوں نے گھروں میں گھس گھس کر بے دریغ عورتوں کی عصمت درمی کی حافظ ابن کثیر کہتا ہے (ترجمہ عربی) (کہا جاتا ہے کہ ان دنوں میں ایک ہزار عورتیں زنا سے حاملہ ہوئیں ص ۱۸۲) اسی بنا پر امام احمد بن حنبل کے نزدیک یزید پر لعنت کرنا جائز ہے ص ۱۸۳ علامہ نقی زانی (اہل سنت کے مشہور عالم) اپنی کتاب شرح عقائد النسیفہ مطبوعہ دہلی ص ۱۸۲ پر فرماتے ہیں "حق یہ ہے کہ یزید کا قتل حسینؑ پر راضی اور خوش ہونا اور اہل بیت نبیؐ کی توہین کرنا معنوی تو اتر رکھتا ہے اگرچہ اس کی نقل بذریعہ احاد کے ہے۔ پس ہم اس کی شان و ایمان کے متعلق کوئی شک نہیں رکھتے کہ اس پر اور اس کے مددگاروں اور ساتھیوں پر اللہ کی لعنت ہے اور معاویہ کے متعلق لکھا ہے کہ گذشتہ بزرگوں نے چونکہ معاویہ پر لعنت کرنا جائز نہیں کیا اس لئے ہم بھی جائز نہیں کہتے یہ ہے کورائہ تقلید العیاذ باللہ حالانکہ معاویہ کے اپنے ناقابل عنوجرائم کے علاوہ یزید کی سب برائیوں کا سرچشمہ بھی وہی خود ہے لیکن برسر اقتدار جماعت نے جو صحابہ کے محامد و مناقب کی فرضی احادیث اپنے اقتدار کی پائیداری کی خاطر نشر کی تھیں (جو منطوق و مفہوم قرآن کے بھی مخالف ہیں اور عقلاً ان کا پیغمبر کی زبان سے صادر ہونا بھی ممکن ہے) ان کی رو سے ان تمام لرزہ خیز اسلام کش بلکہ انسانیت سوز مظالم کو اسلام میں برداشت کرنے کا جواز پیدا کیا جاتا ہے اور ہر دور کے محقق بھی کورائہ تقلید سے متاثر ہو کر آنکھیں بند کر کے سلف کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنی تحقیق کے منہ پر پتھر باندھ لینے کی جبارت کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے اور یزید کے متعلق مودودی صاحب آخری نظریہ یہی پیش کرتے ہیں۔

"ہمیں ایسے لوگوں کے غلط کاموں کو غلط کہنے پر اکتفا کرنا چاہیے اور لعنت سے پرہیز کرنا اولیٰ ہے ص ۱۸۳

بریں عقل و دانش بباید گر لست

یہ مسلک ہے جمہور مسلمین اور اسلامی سواد اعظم کا جو حضرت پیغمبرؐ کے بعد برسر اقتدار جماعت کے حامی و محافظ و مبلغ و پیرو رہے اور ان کا اقتدار ابتدا سے ہی بادشاہت و ملوکیت کے رنگ میں ظاہر ہوا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں البتہ اس کی ابتداء اور انتہا میں فرق ہے کہ ابتداً قرب زمانہ پیغمبرؐ کی وجہ سے لوگ اسلامی تمدن کے دلدادہ اور اس سے بہت متاثر تھے حتیٰ کہ حکمران طبقہ بھی لہذا آئین اسلام کی کافی حد تک پاسداری کی جاتی رہی اور رفتہ رفتہ زمانے کے مرور کے ساتھ نقوش اسلامی کہنے ہوتے اور مٹتے گئے اور ملوکیت اپنے اصلی خدو خال میں نمایاں ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ افسوسناک نتائج تک پہنچی اور مودودی صاحب نے اس کو ابتداء تو خلافت کا نام دیا لیکن جب سر سے پانی اوچھا ہونا شروع

والتو اس کو ملکیت کا نام دے دیا اور سکمرانوں کے برہمن کے مظالم کو ہر دو صورتوں میں اسلام کے وسیع و
رضی دامن میں چھپا کر مٹھ گئے۔ حالانکہ اقتدار و فوات پیپر کے بعد ہی سے دو شعبوں میں بٹ گیا ایک
نسبت (بادشاہت) اور اس کی سربراہی حضرت ابوبکر کو حاصل ہوئی اور سیاسی طریقہ کار سے اس کا سلسلہ
بعد میں چلتا رہا اور دوسری خلافت (امامت) اس کی سربراہی کا شرف بلا فصل حضرت علی کو حاصل ہوا
اور انہی کو تم غدیر کے موقع پر حضور نے نامزد فرمایا تھا ان کے بعد یکے بعد دیگرے بارہ امام ہوئے ملکیت
کو کچھ دنوں تک خلافت کا لباس پہنایا جاتا رہا لیکن اپنے کرتوتوں کی وجہ سے کچھ عرصہ کے بعد وہ عریاں ہو گئی
اس ساری تفصیل کے بعد شیعہ مسلک کی توضیح کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ چونکہ

شیعہ مسلک جناب رسالت مآب دنیاوی قائد اور دینی پیشرو بھی تھے لہذا وہ نبی صاحب
شرعیت اور سلطان وقت صاحب اقتدار بیک وقت تھے لہذا ان کے بعد ان کی جانشینی کا صحیح حقدار وہی
ہے جو ان دونوں مرحلوں میں ان کی نیابت کے تمام فرائض ادا کر سکنے کا اہل ہو اور ان تمام ذمہ داریوں سے
عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ حضرت علی علیہ السلام نے ابن قتیبہ دینوری کی نقل کے مطابق ہر دو
مرحلوں میں اپنے اہق ہونے کا دعویٰ کیا جیسا کہ سابق میں بیان ہو چکا ہے اور حکمران پارٹی کے وکیل
ابو عبیدہ جراح نے حضرت علی کی تردید نہ کی بلکہ ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ابوبکر کی
تجربہ کاری کہن سالی اور بزرگی کا واسطہ دے کر حضرت علی سے دست برداری کی درخواست کی جس کو
حضرت علی نے قبول نہ کیا اور اپنے مطالبہ پر ڈٹے رہے لیکن اقتدار حکومت کے سامنے خاموش رہے۔
اور حضرت علی کی خاموشی بعینہ اسی طرح تھی جس طرح مودودی صاحب نے لکھا ہے۔ دوسرا ملکیت
کا طریقہ اگر جائز ہے تو قابل برداشت ہونے کی حیثیت سے ہے نہ کہ پسندیدہ اور مطلوب ہونے کی
حیثیت سے ص ۱۶

مذہب شیعہ کی انفرادی حیثیت کی ابتداء اسی دن سے ہوئی جس دن سے حضرت علی نے اقتدار
کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا تھا اور ان کی حکومت کی شرعی حیثیت کو چیلنج کیا تھا اور ہر حیثیت
نے اپنے استحقاق پر ناقابل تردید دلائل پیش کئے تھے یہ الگ بات ہے کہ حکومت وقت نے دلائل
کا جواب نہ دے سکے کے باوجود اپنی روش کو بدلنے کی جرات نہ کی۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں
”حمایین علی کا کردہ ابتداء میں شیعان علی کہا جاتا تھا بعد میں اصطلاحاً انہیں صرف شیعہ کہا جانے لگا“
حضرت علی اور شیعان علی ابتداء سے ہی حکومت وقت سے رواداری اور ملک و ملت کی فلاح و
بقا کے لئے ان سے بھرپور تعاون ان کا شیوہ تھا اور کسی بھی ملک میں بسنے والے شیعہ ملک کے بقا و استحکام

اور فلاں و ارقا میں حکومت وقت کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے ہوئے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کبھی بخل نہیں کیا کرتے جس طرح کہ حضرت علی اور ان کی جماعت نے اپنے دور کے سلاطین و خلفائے ثلاثہ کے ساتھ اس کی بلند مثال پیش فرمائی۔ جس سے بعض کم سمجھ لوگوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ آپ نے خلفاء کی بیعت کی تھی۔ بے شک آپ نے ان کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک میں مثالی کردار ادا کیا جو آپ کے شایان شان تھا اور نہایت بلند نظری اور اعلیٰ دھمکی سے ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے زیریں مشوروں سے بھی بخل نہ فرمایا اور مشکلات علیہ اور معناتِ فقیہہ میں آپ کا حلال مشکلات ہونا تو اظہر من الشمس ہے حتیٰ کہ شہنشاہ وقت (خلیفہ دوم) حضرت عمر نے بھی اس کا اعتراف کیا چنانچہ (لَوْلَا عَلِيٌّ لَهْلَكْتُ عُمَرُ) (اگر علی نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتا) علامہ سبط بن جوزی نے امام احمد حنبل سے نقل کیا اور کتبِ نحویہ میں نحویوں کو نولا کے استعمال کے لئے اس کے علاوہ اور مثال ہی اچھی نہیں لگتی گویا یہ فقرہ ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے بہر حال مقامِ علم میں قیادت اور مسائلِ دینیہ و مطالبِ فقیہیہ میں رہنمائی آپ ہی کا ستہ تھا اور اس بارے میں آپ مقامِ نبوت کے صحیح جانشین تھے اور مسلمانانِ عالم کے لئے اسلامیات میں مرکزی حیثیت آپ ہی کو حاصل رہی اور تمام صحابہ علمی خیرات حاصل کرنے میں ان کے دستِ نگر رہے۔

شیعانِ علی حکومتِ وقت کے ماتحت پُر امن شہر لوں کی حیثیت سے خاموش زندگی بسر کرتے رہے یہاں تک کہ وفاتِ عثمان کے بعد حضرت علی کی ظاہری حکومت کا دور آیا تو آپ کو اگرچہ پُر امن خدمتِ دین و مذہب کا موقع نہ دیا گیا اور آپ کا پورا پچاسالہ دور جمل صغین و نہروان کی جنگوں کی نذر ہو گیا تاہم جب کبھی موقع ملا آپ نے سابق حکومتوں اور اپنی حکومت کے نظریہ حیات میں واضح فرق بیان کیا اور نہج البلاغہ کے خطبہ شقشقیہ میں سابق حکومتوں کی شرعی اور جمہوری حیثیت پر سخت تنقید کی لیکن باوجود اس کے اپنے دورِ اقتدار میں کبھی اپنی مذہبی انفرادیت کو بزورِ حکومت منوانے کی کوشش نہ فرمائی۔ البتہ ادلہ و براہین کے سایہ میں ملت کی ان خصوصیات کو جو جز و مذہب اصولا یا فردِ خاص ہیں بیان کرنے سے دریغ نہ فرمایا اور جو چیزیں سابق حکومتوں کے دورِ اقتدار میں غلط طور پر رائج ہو گئی تھیں ان کی بھی نشاندہی کی۔ معاویہ کے حکم سے اموی منبروں پر اگرچہ بر ملا آپ پر سب و شتم کا دروازہ کھل چکا تھا لیکن آپ نے کبھی جوابی کارروائی کی طرف قدم نہ اٹھایا اور نہ اٹھانے دیا۔ اور ایک دفعہ کسی کی بدکلامی سن کر جب بعض آپ کے ہم نشینوں کے جذبات میں جوش پیدا ہوا تو ان کے چہروں کی کیفیات کو مہانپ کر ان کی زبان کھلنے سے پہلے ارشاد فرمایا۔ برتن سے وہی چیز نکلتی ہے جو اس

کے اندر جوتی ہے۔ اس کے اندر جو کچھ تھا وہ برآمد ہوا اور تمہارے اندر جو کچھ ہے اسے برآمد ہونا چاہیے وہ جاہل تھا اور اس کی زبان جہالت کی ترجمان تھی تم اگر عارف ہو تو تمہاری زبان علم و عرفان کی ترجمان ہونی چاہیے کیونکہ وہ معاویہ کا صاحب ہے اور تم علی کے شاگرد ہو۔ (معاویہ) مروج الذهب ج ۲ ص ۳۴۷

شیعان علی پر نازک دور

خلافت ثلاثہ کا دور شیعان علی کا خاموشی کا دور تھا چونکہ حضرت علی کو شہ عزالت میں زندگی گزار رہے تھے پس شیعان علی بھی ان کی تاسی میں خاموش رہے نہ حکومت وقت سے ان کو ملازمتوں اور عہدوں کی توقع تھی اور نہ یہ لوگ مناصب کے خواہش مند بنے جب کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے آقا و مولا حضرت علی علیہ السلام باوجود کی اعلیٰ جنگی صلاحیتیں نظامی حوصلے اور فطرتی تجربے رکھتے ہیں اور سب مسلمان معرکہ ہائے احد بدر خندق وغیرہ میں ان کی نیر و آزمائیوں سے واقف ہیں اور ساتھ ساتھ ان پر اعتماد کلی ہونا بھی کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن حکومت وقت منحوس مصالح کی بنا پر ان کی استعداد قابلیت ذاتی اور اوصاف خلقیہ و خلقیہ کو بروئے کار لانے کے بجائے ان کے نام و نمود کو پردہ خفا میں رکھنا چاہتی ہے یہ اور بات ہے کہ ان کا علمی فقاہرہ نازک و مشکل مرحلہ میں ان پر پھیل گیا رہا۔

بہر حال حضرت علی کے دور اقتدار میں اگرچہ ذہنی المجنوں میں عامۃ الناس گرفتار رہے لیکن عقل سلیم و فہم مستقیم رکھنے والوں نے سابق حکمرانوں اور علی کے اندر فرق واضح محسوس کر لیا لہذا فطری طور پر عقیدہ منوں کا دائرہ پہلے کی نسبت وسیع تر ہو گیا لیکن حضرت امام حسن کی صلح کے بعد معاویہ کے دل میں قدیمی حسد و بغض کی آگ بھڑک اٹھی اور اس کی خاموش چنکاریاں یکبارہ سلگنے لگیں اور اس نے شیعان علی سے انتقام لینے کے لئے نڈر بے باک اور خوف خدا سے آزاد گورنر تلاش کر کے ان کے خون سے تسکین قلب کا سامان مہیا کیا اور بے دریغ ان کو قتل کروایا۔ اسی سلسلہ میں زیاد کو جو زیاد بن ابیہ کے نام سے مشہور تھا زیاد بن ابی سفیان بنا کر اپنا بھائی بنایا (خلافت و ملکیت کے مسئلہ پر دیکھئے) اور اسے شاہی خاندان کے ایک فرد کی حیثیت دے کر کوفہ کا گورنر مقرر کیا جہاں شیعان علی کی زیادہ تعداد موجود تھی۔ اس لئے کہ حضرت علی کا دار السلطنت تھا۔ اس ظالم ولد الحرام نے کوفہ میں شیعوں پر وہ ظلم کے پھاڑ گرائے کہ الامان کافی احتیاط سے کام لینے کے باوجود خلافت و ملکیت میں اس ظلم کی روداد پر رنسی بخش خدنگ روشنی ڈالی گئی ہے حضرت عمر بن عبدیہ جو شیعان کوفہ میں بہت بلند مقام رکھتے تھے اور حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے خاص مصاحبوں اور رازدانوں میں سے تھے اور باعتراف مودودی صاحب

ایک نابود و ماریٹا کی طرف سے اسے اُست میں ایک اُوپے مرتبے کے شخص تھے۔ ماریٹا۔ ان کو اور ان کے ساتھیوں کو موت اس لئے قتل کرا دیا گیا کہ وہ حضرت علی پر سب نہیں کرتے تھے۔

حضرت مغیرہ و جب تک کو فو کے گورنر بنے وہ ان اشیعان علی کے ساتھ حمایت برتتے رہے۔ ان کے بعد جب زیاد کی گورنری میں انہو کے ساتھ کو فو بھی شامل ہو گیا تو اس کے اور ان اشیعان علی کے درمیان کش مکش برپا ہو گئی۔ وہ خطبے میں حضرت علی کو گالیاں دیتا تھا اور یہ کہہ کر اس کا جواب دیتے گئے تھے اسی دوران میں ایک مرتبہ انہوں نے نماز جمعہ میں تانیر پر بھی اُس کو ٹوکا۔ اس نے انہیں تخریب دہی کو اور اس کے بارہ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور ان کے خلاف بہت سے لوگوں کی شہادتیں اس فروغ پر پہنچی کہ انہوں نے ایک جھٹا بنا لیا ہے خلیفہ کو اعلان یہ گالیاں دیتے ہیں امیر المؤمنین معاویہ کے خلاف لڑنے کی دعوت دیتے ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ خلافت آل ابی طالب کے سوا کسی کے لئے دست نہیں ہے۔ انہوں نے شہر میں فساد پکایا اور امیر المؤمنین کے عامل کو نکال باہر کیا۔ یہ ابتراب و حضرت علی کی حمایت کرتے ہیں اور ان پر دست جھپٹتے ہیں اور ان کے مخالفین سے اظہارِ برکت کرتے ہیں۔ ماریٹا۔ اس طرح یہ لازم حضرت معاویہ کے پاس بھیجے گئے اور انہوں نے ان کے قتل کا حکم دیا۔ اس سے دیر یا قتل سے پہلے ہلاک ہونے لگے ان کے سامنے جو بات پیش کی وہ یہ تھی کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم علی سے بات کا انکار کرو اور ان پر لعنت جیجو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے ورنہ قتل کرو یا جائے۔ ان لوگوں نے اس بات کے ماننے سے انکار کر دیا اور نکرانے کہا۔ میں زبان سے وہ بات نہیں نکال سکتا جو دست کو ناراض کرے۔ آخر نابود اور ان کے سات ساتھ قتل کر دئے گئے ان میں سے ایک شخص عبد الرحمن بن حسان کو حضرت معاویہ نے زیاد کے پاس واپس بھیج دیا اور اس کو لکھا کہ انہیں بدترین طریقہ سے قتل کرو۔ چنانچہ اس نے انہیں زندہ دفن کرا دیا۔

معاویہ کے ایک دور سے فوجی سپہ سالار کی شیعہ کش پامیسی کی داستان سننے جس کا نام اب بھی اطلاق اس شخص ابھی اطلاق اسے یمن میں حضرت علی کے گورنر عبد اللہ بن عباس کے وہ چھوٹے بیٹے تھے جو ان کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ ان بچوں کی ماں اس معاملے سے دیوانی ہو گئی۔ بنی کنانہ کی ایک موت جو یہ غلام دیکھ رہی تھی چیخ اٹھی کہ وہ لوگوں کو تم نے قتل کر دیا اب ان بچوں کو کس لئے قتل کر دئے جو وہ بچے تو جاہلیت میں ہی نہیں مائے جہان تھے۔ اسے ابن اطلاق ہونا بہت بچوں اور بڑوں کے قتل اور بے رحمی و براہ کشتی کے بغیر قائم نہ ہو سکتی جو اس سے کہنی کوئی خدمت نہیں اس کے بعد ان نکال شخص کو حضرت معاویہ نے جہان پر حملہ کرنے

کے لئے بھیجا جو اس وقت حنت علی کے قبضہ میں تھا۔ ہاں اس نے دوسری نیا دنیوں کے
ساتھ ایک ظلم عظیم یہ کیا کہ جنگ میں جو مسلمان عورتیں کپڑے لٹی تھیں انہیں لوثیاں بنایا سالانہ
شرعیات میں اس کا کوئی جواز نہیں یہ ساری تاریکیاں گویا اس بات کا عملاً اعلان تھیں
کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے۔ مثلاً

کتاب سیر و تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ظلم کی اس طویل داستان کو سن کر نگارینہ کو آہا ہے اس
استبداد و جور کی جس پٹی میں شیعیان علی کو پیسا لیا اور جس شکنجے میں ان کو جکڑ کر ان کا خون پوسا لیا تاریخ اسلام
کے صفحات پر اس کی سرخ لکیریں قیامت تک قائم رہیں گی لیکن معاویہ کو قدرت کے اس قانون
کا پتہ نہ تھا کہ صداقت ظلم سے نہیں مٹا کرتی اور حق کو طاقت سے نہیں دبایا جاسکتا بلکہ قربانیاں
حق و صداقت کا ساتھ دینے والوں کے ایمانی دلوں کو اور تیز کرتی ہیں اور ان کے ثبات قدم میں
مزید استحکام پیدا کرتی ہیں پس جو مارے گئے وہ یقیناً جنت کو راہی ہوئے لیکن آنے والے شیعیان علی
کو ایک اساسی دستور بتا گئے اور ان کا کردار آنے والے شیعیان علی کے لئے شعل راہ کا کام دے گیا کہ
مر جاؤ مٹ جاؤ لٹ جاؤ اور کٹ جاؤ لیکن طوفان باطل کے دھارے کے سامنے انجام سے بے نیاز ہو کر پوری
طرح ڈٹ جاؤ۔ آخر کار ظلم تک گیا تشدد کے جذبات ڈھیلے پڑ گئے ظلم کی تلوار کند ہو گئی مارنے والے
مر مٹ گئے لیکن حق کے علمبردار شیعیان علی اسی کو فہم میں نہ رکھ کر معاویہ کے بعد اس کے بیٹے یزید کے مقابلہ
میں کوہ گراں کی طرح ڈٹ گئے ظلم سب سبہ کر ان کے سینوں میں ایمان اس طرح راسخ ہو گیا تھا کہ اب وہ
موت کو موت ہی نہ سمجھتے تھے پس حضرت امام حسین علیہ السلام کی قیادت میں منظم طور پر باطل کی استبداد ہی
قوتوں سے اعلانیہ ٹکرا گئے اور اگرچہ میدان کارزار میں جامِ شہادت نوش کر کے راسی جنت ہوئے لیکن
آنے والی نسلوں کے لئے حق و باطل میں امتیاز کی راہیں ہموار کر گئے۔ اب تک جو لوگ خلافتِ راشدہ
جمہوریت کو مذہب اور دین کا نام دینے کی غلط فہمیوں میں مبتلا تھے واقعہ کر بلا نے اس کی تہی کھول دی
اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ دور رسالت کے فوراً بعد جو دو لائیں نکلی تھیں ایک وہ جس پر
برسر اقتدار پارٹی گامزن تھی اور جس کو سوادِ اعظم کی تائید حاصل تھی اور دوسری وہ لائن جس پر حضرت علی اور ان
کے حامی لوگ گامزن تھے ان دونوں میں سے برحق کونسی ہے اور باطل کونسی؟

مردودی صاحب تحریر فرماتے ہیں "باقاعدہ مخصوص نظریات کے ساتھ ایک پارٹی کے وجود کا
آغاز ان لڑائیوں کے زمانہ میں ہوا جو حضرت طلحہ و زبیر کے ساتھ معرکہ جمل میں، حضرت معاویہ
کے ساتھ صفین میں، اور خوارج کے ساتھ نردان میں حضرت علی کو پیش آئیں۔ پھر حضرت حسین

کی شہادت نے ان لوگوں کی صفوں کو مجتمع کیا ان کے جذبات میں شدت پیدا کی اور ان کے نظریات کو ایک واضح شکل دے دی۔ علاوہ بریں بنو امیہ کے خلاف ان کے طرز حکومت کی وجہ سے عام مسلمانوں میں جو نفرت پھیلی اور اموی و عباسی دور میں اولاد علی اور ان کے حامیوں پر ظلم و ستم کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں ہمدردی کے جو جذبات پیدا ہوئے انہوں نے شیعہ دعوت کو غیر معمولی طاقت بخش دی۔ ص ۲۱۱۔

ان حقائق کا اعتراف کرنے کے باوجود حکمران طبقہ کی حمایت اور لپ پوت کر کے ان کی اغلاط سے درگزر کرنا اور انہیں بزرگان دین میں سے شمار کرنا آبائی عقیدہ کی جزو لاینفک ہے اور یزید جیسے علانیہ فاسق و فاجر پر لعنت کرنے سے اس لئے گریز کیا جاتا ہے کہ کہیں اس طرح اس کے والد یا صحابہ میں سے کسی اور پر لعنت کرنے کا دروازہ نہ کھل جائے۔ (خلافت و ملوکیت ص ۱۸۳)

راست گوئی اور راست بازی

مودودی صاحب کے نزدیک ان دونوں لفظوں کے معانی و مفہیم میں کوئی فرق نہیں وہ راست بازی کا معنی راست گوئی سمجھتے ہیں حالانکہ کہنے اور کرنے میں فرق نہ کرنے والے کو داعی مرضی ہی سمجھنا چاہیئے چنانچہ خلافت و ملوکیت کے ص ۳۰۳ پر ارشاد فرماتے ہیں۔

لیکن میں ”الصحابۃ کلہم عدول“ (صحابہ سب راست باز ہیں) کا مطلب یہ نہیں

لیتا کہ تمام صحابہ بے خطا تھے۔ اور ان میں کا ہر ایک ہر قسم کی بشری کمزوریوں سے بالاتر تھا اور ان

میں سے کسی نے بھی کوئی غلطی نہیں کی ہے بلکہ میں اس کا مطلب یہ لیتا ہوں کہ رسول اللہؐ سے

روایت کرنے یا آپ کی طرف کوئی بات منسوب کرنے میں کسی صحابیؓ نے کبھی راستی سے ہرگز

تجاوز نہیں کیا ہے پہلا مطلب اگر لیا جائے تو تاریخ ہی نہیں حدیث کی مستند اور قوی روایات

مبھی اس کی تائید نہ کریں گی اور دوسرا مطلب لیا جائے تو وہ قطعی طور پر ثابت ہے۔ الخ۔

دیکھئے صحابہ کے عدول ہونے کا معنی راست باز ہونا بیان کیا ہے لیکن راست باز کا معنی راست گو

ہے راست گو نہیں ہے اور فرماتے ہیں اگر اس کا معنی راست خولیا جائے تو تاریخ و حدیث کی مستند

روایات اس کی تائید نہیں کرتیں لیکن ان کا راست گو ہونا قطعی طور پر ثابت ہے گویا ان کا حق گو ہونا

یقینی ہے لیکن حق گو ہونا ثابت نہیں۔

انہوں نے اپنے اس نظریہ کے ماتحت راست باز کو اپنا طمع نظر اور مال تھقیق قرار دیا ہے جس کا

معنی راست گوئی تک ہی محدود ہے چنانچہ ماخذ کی بحث میں قاضی ابوبکر ابن تیمیہ اور شاہ عبدالعزیز کی کتابوں پر انحصار نہ کرنے کی وجہ یہ لکھی ہے

لیکن جس وجہ سے اس مسئلہ میں میں نے ان پر انحصار کرنے کے بجائے براہ راست اصل ماخذ سے خود تحقیق کرنے اور اپنی آزادانہ رائے قائم کرنے کا راستہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان تینوں حضرات نے دراصل اپنی کتابیں تاریخ کی حیثیت سے بیان واقعات کے لئے نہیں بلکہ شیعوں کے شدید الزامات اور ان کی افراط و تفریط کے رد میں لکھی ہیں جس کی وجہ سے عملاً ان کی حیثیت وکیل صفائی کی سی ہو گئی ہے اور وکالت خواہ الزام کی ہو یا صفائی کی اس کی عین فطرت یہ ہوتی ہے کہ اس میں آدمی اسی مواد کی طرف رجوع کرتا ہے جس سے اس کا مقصد مضبوط ہوتا ہو اور اس مواد کو نظر انداز کر دیتا ہے جس سے اس کا مقصد کمزور ہو جائے ۳۲

اس میں شک نہیں کہ انہوں نے بڑے پتے کی بات کی ہے اور وکیل صفائی کے کردار کی صحیح نشاندہی کی ہے لیکن ان کی اس تحقیق اور کاوش کا نتیجہ صرف حق جوئی و حق گوئی تک ہی محدود ہے۔ اس کا حق خوئی سے دور کا واسطہ بھی نہیں کیونکہ خلافت و ملکیت کا اول سے آخر تک مطالعہ کیجئے اور اس کے معانی و مطالب کو خوب سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ آپ یقیناً اس نتیجہ تک پہنچے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ پوری کتاب میں وکیل صفائی کا ہی انہوں نے پاٹ ادا کیا ہے اور جمہوری مسلک اور جمہوری اسلامی نظام کو شرعی حیثیت دینے کے لئے انہوں نے جس قدر اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارے ہیں اس کے نتیجہ میں ہر ماخذ سے صرف اپنے مطلب کا مواد لیا ہے اور ایسے مواد کو نظر انداز کرتے رہے ہیں جس سے ان کا مقصد کمزور ہوتا تھا جیسا کہ وکیل صفائی کا نظریہ انہوں نے خود واضح کیا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کے سامنے دو نظریے تھے (۱) قائم شدہ حکومت سے رواداری اور ملک و ملت کی فلاح و بقا کے لئے حکومت سے پورا تعاون (۲) شرعی لحاظ سے اور آئین اسلام کی رو سے طریق انتخاب پر تنقید اور مکمل اختلاف رائے۔ جہاں تک پہلے نظریے کا تعلق ہے مودودی صاحب اس کے نشانہ زد کرنے میں ذرا بھر سبب بخل نہیں کرتے لیکن حضرت علی کا دوسرا نظریہ چونکہ ان کے قصہ جمہوریت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتا ہے۔ اور اسلام کے جمہوری عقیدے کو چیلنج کرتا ہے اس لئے کہیں بھی اس کے نقل کرنے کی زحمت ادا نہیں کی حالانکہ ابن قیمیہ و بیہقی نے الامامہ و السیاستہ میں صاف لکھا ہے کہ حضرت علی کے نزدیک ان کا خلیفہ رسول کہلانا اور امیہ المومنین کہلانا شرعی لحاظ سے ناجائز تھا اور ابن قیمیہ کے مذہب کے متعلق لکھتے ہیں۔

ابن قتیبہ کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ شیعہ تھا وہ ابو حاتم سبختانی اور اسحاق بن راہویہ جیسے ائمہ کاشاگرد اور دینور کا قاضی تھا۔ ابن کثیر اس کے متعلق کہتے ہیں (ترجمہ) وہ ثقہ اور صاحب فضل و شرف آدمی تھا، حافظ ابن حجر کہتے ہیں "صدوق" (نہایت سچا آدمی) خطیب بغدادی کہتے ہیں (ترجمہ) وہ ثقہ دیندار اور فاضل تھا، ابن حزم کہتے ہیں (ترجمہ) اپنے دین و علم میں بھروسے کے قابل، ابن حجر اس کے مذہب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں (ترجمہ) السلفی کہتے ہیں کہ ابن قتیبہ ثقہ اور اہل سنت میں سے تھا مگر بنائے مذہب اس کے مخالف تھے۔ میرا خیال یہ ہے کہ مذہب سے سلفی کی مراد ناصیت ہے کیونکہ ابن قتیبہ میں اہل بیت سے انحراف پایا جاتا تھا اور حاکم اس کے برعکس تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیعہ ہونا تو درکنار ابن قتیبہ پر تو الثنا ناصبی ہونے کا الزام تھا۔ ص ۳۰۹

اسی کتاب کی کتاب الامامۃ والسیاستہ اس کے متعلق یقین کے ساتھ کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ وہ ابن قتیبہ کی نہیں ہے (اگے چل کر لکھتے ہیں) میں نے خود یہ پوری کتاب پڑھی ہے اور اس کی چند روایتوں کو میں بھی الحاقی سمجھتا ہوں مگر ان کی بنا پر پوری کتاب کو رد کر دینا میرے نزدیک زیادتی ہے اس میں بہت سی کام کی باتیں ہیں۔ ص ۳۱۰

بقول خودش وکیل صفائی والی ہیرا پھیری ہے۔ ابن قتیبہ کا سنی ہونا مسلم ہے بلکہ اس کے ناصبی ہونے کا احتمال بھی ہے کیونکہ وہ اہل بیت سے منحرف تھا اور پھر اس کی کتاب الامامۃ والسیاستہ کی اس کی طرف نسبت بھی غلط نہیں بائیں سمجھ اس کی بعض روایتوں کو الحاقی کہہ دینا اور بعض کو کام کی باتیں کہنا وکیل صفائی والا کردار نہیں تو اور کیا ہے یعنی جو اپنے مطلب کی بات ہے وہ کام کی بات ہے اور جو آبائی تقلیدی عقیدہ کی اساس کو کمزور ثابت کرتی ہے وہ الحاقی ہے۔

موردی صاحب ایک طرف تو اپنے آبائی جمہوری عقیدہ کی لاج رکھنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں اور روایات میں قطع و برید کر کے صرف "کام کی باتیں" صحیح ماخذوں سے نقل کرنے میں

لے موردی صاحب کے نزدیک صحیح اور معتد ترین ماخذ وہی ہیں جن کے مصنفین شیعوں کے سخت دشمن اور متعصب ترین لوگ ہوں چنانچہ فرماتے ہیں "میں نے خاص طور پر ان (حافظ ابن کثیر) کی تاریخ پر زیادہ تراعتماد و وجود سے کیا ہے ایک یہ کہ وہ تشیع کی طرف میلان تو درکنار اس کے سخت مخالف ہیں شیعہ روایات کی بڑے زور شور سے تردید کرتے ہیں صحابہ میں سے کسی پر اپنی حد و وسع تک آنچ نہیں آنے دیتے اور دور افتہ کی تاریخ بیان (باقی ص ۴۶ پر)

بڑے محتاط ہیں لیکن دوسری طرف محققین کے زمرہ میں شامل ہو کر اپنی شان اجتہادی سے ایسے نظریوں تک پہنچ جاتے ہیں جو ان کے آبائی عقیدہ سے متصادم ہونے کے علاوہ ان کی تضاد بیانی کو منظر عام پر ظاہر کرتے ہیں چنانچہ حضرت عثمان کے قتل کے متعلق رقمطراز ہیں۔

”آخر کار ان لوگوں نے ہجوم کر کے سخت ظلم کے ساتھ حضرت عثمان کو شہید کر دیا۔ تین دن تک ان کا جسد مبارک تدفین سے محروم رہا اور قتل کرنے کے بعد ظالموں نے ان کا گھر بھی لوٹ لیا۔ اُس (شکایت) کو رفع کرانے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہو سکتی تھی کہ یہ لوگ مدینہ طیبہ کے انصار و مہاجرین اور خصوصاً اکابر صحابہ سے مل کر ان کے ذریعے سے حضرت عثمان کو اصلاح پر آمادہ کرتے الخ“ ص ۸۵ آگے چل کر لکھتے ہیں۔ اس مقام پر کسی شخص کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ اہل مدینہ ان لوگوں کے اس فعل پر راضی تھے واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ اچانک مدینہ پہنچ گئے تھے اور انہوں نے اہم ناکوں پر قبضہ کر کے ایک حد تک اہل شہر کو بے بس کر دیا تھا۔ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔ مدینے کے مہاجر و انصار بھی جو دراصل اس وقت مملکت اسلامیہ میں اہل حل و عقد کی حیثیت رکھتے تھے ان کے ممبرانہ کے لئے تیار نہ ہوئے مگر یہ لوگ (شورش) اپنی ضد پر قائم رہے اور بالآخر انہوں نے مدینہ میں گھس کر حضرت عثمان کو گھیر لیا۔ ص ۸۵

یہ بیان ان کے آبائی تقلیدی جمہوری مسلک پر لپ پوت کے لئے ہے۔ اس کے بعد ان کا تحقیقی بیان سینے جو پہلے تقلیدی بیان کے بالکل متضاد ہے۔

حضرت عثمان کے خلاف جو شورش برپا ہوئی اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی سبب کے بغیر محض سبائیوں کی سازش کی وجہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی یا وہ محض اہل عراق کی شورش پسندی کا نتیجہ تھی تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں ہے اگر لوگوں میں ناراضی پیدا ہونے کے واقعی اسباب موجود نہ ہوتے اور ناراضی فی الواقع موجود نہ ہوتی تو کوئی سازشی گروہ شورش برپا کرنے اور صحابیوں اور صحابی زادوں تک کو اس کے اندر شامل کر لینے میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا ان لوگوں کو اپنی شرارت میں کامیابی صرف اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ اپنے اقرباء کے معاملہ میں حضرت عثمان نے جو طرز عمل اختیار فرمایا تھا اس پر عام لوگوں میں ہی نہیں بلکہ اکابر صحابہ تک میں ناراضی پائی جاتی تھی۔ الخ“ ص ۸۶ و ص ۸۷۔

بقیہ حاشیہ ص ۷۳

کرتے ہوئے انہوں نے حضرت معاویہ ہی نہیں یہ تک کی صفائی پیش کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی ہے الخ“ ص ۸۷۔

مدینے میں جب حضرت عثمان پر ہر طرف نکتہ چیںیاں ہونے لگیں اور حالت یہ ہو گئی کہ چند صحابہ
 (زید بن ثابت، ابواسید ساعدی، کعب بن مالک اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم کے سوا
 شہر میں کوئی صحابی ایسا نہ رہا جو حضرت والا کی حمایت میں زبان کھولتا تھا۔^{۳۳۳}

حضرت طلحہ و زبیر اور حضرت عائشہ کے متعلق بھی ابن جریر نے روایات نقل کی ہیں کہ یہ حضرات
 بھی اس صورت حال سے ناراض تھے۔^{۳۳۲} اور جب حضرت عائشہ نے خون عثمان کا بدلہ طلب
 کرنے کا ارادہ کیا تو ایک شخص عبد بن ام کلاب نے کہہ دیا "خدا کی قسم سب سے پہلے تو آپ ہی
 نے ان کی مخالفت کی تھی،" ص ۳۳۲

باہر سے آئے ہوئے دو ہزار شورش دار المخلافہ پر مسلط تھے خلیفہ وقت کو قتل تک کر گذرے
 تھے۔ خود دار المخلافہ میں بھی ایک اچھی خاصی تعداد ان کی ہم خیال موجود تھی، ص ۳۳۵۔

اب ذرا بنظر انصاف مودودی صاحب کے پہلے بیان میں اور ان بیانات میں تقابل کیجئے
 ان کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ حضرت عثمان کی غلط کاریوں کی بدولت سب مسلمان حتیٰ کہ چار آدمیوں کے علاوہ
 پورے مدینے میں اکابر صحابہ تک ان کی حمایت میں زبان کوئی نہیں کھولتا تھا۔ اور ان کا مقلدانہ رویہ یہ
 کہتا ہے کہ سازشی لوگ اچانک مدینہ میں گھس آئے تھے اور انہوں نے شہر کی ناکہ بندی کر لی تھی۔ حتیٰ کہ
 اہل شہر کو انہوں نے بے بس کر دیا تھا۔^۹ بے شک تاریخ کا منہ چڑانا اسی کو ہی کہا جاتا ہے۔ ایک
 جگہ وکیل صفائی کی حیثیت سے کہہ دیا کہ شورش یوں کو چاہیے تھا کہ مدینہ طیبہ کے انصار و مہاجرین اور خصوصاً
 اکابر صحابہ سے مل کر حضرت عثمان کو اصلاح پر آمادہ کرتے۔^۸ اور دوسری جگہ اپنے تحقیق کے قلم سے
 لکھتے ہیں کہ صحابہ میں سے چار آدمیوں کے سوا کوئی بھی ان کی حمایت میں زبان نہیں کھولتا تھا (گویا شورش یوں
 کے مؤید تھے) ص ۳۳۱۔ صحابی و صحابی زادے شورش میں شامل تھے۔^{۳۲۹} اکابر صحابہ بھی عثمان سے ناراض تھے
^{۳۲۹} حتیٰ کہ حضرت طلحہ و زبیر و عائشہ بھی اس سے ناراض تھے۔^{۳۳۲} دارالمخلافہ میں اچھی خاصی تعداد اور
 (شورش یوں) کے ہم خیال تھی۔^{۳۳۵} اب ذرا گریبان میں جھانک کر فیصلہ کیجئے کہ جب صحابی صحابی زادے

۱۔ جب شورش یوں نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا تو حضرت عائشہ لوگوں کو بھڑکاتی تھیں اُتُّلُوا نَعْتَلًا وَبِأَدَا
 كَفَرُوا اس نسل کو قتل کرو کہ یہ کافر ہو گیا ہے (نسل ایک یہودی کا نام تھا جس سے ان کو تشبیہ دی گئی) تذکرۃ الخواص سبط بن الجوزی
 مودودی صاحب نے حضرت عثمان کے متعلق اپنی عقیدتمندی کی لاج رکھتے ہوئے لیب پوت سے کام لیا۔
 کہ حضرت عائشہ کے نظریے کو قطع و برید سے پیش کیا ہے تاکہ صورت حال پر حتی الامکان پردہ ڈال جائے حقیقت
 یہ ہے کہ مدینہ کی اکثریت حضرت عثمان کے رویے سے نالاں تھی اور سوائے چند آدمیوں کے اس میں کوئی نہ تھا جیسے

اکابر صحابہ طلحہ زبیر و عائشہ اور دارالخلافہ یعنی مدینہ میں ان کی اچھی خاصی تعداد تھی بلکہ چار آدمیوں کے سوا تمام اہل نبیہ شیشیوں کے ہم خیال تھے یا کم از کم شورشیوں کے فعل پر راضی تھے کیونکہ ان کی حمایت میں زبان کھولنے والا کوئی نہ تھا تو ایسی صورت میں حضرت عثمان کی اصلاح کون کر داتا؟ واقعات تاریخ یہ بتلاتے ہیں

مودودی صاحب نے باوجود کافی پردہ ڈالنے کے اس امر کا انکشاف کر ہی دیا اور حضرت عائشہ بھی بلوائیوں اور شورشیوں کی ابتدائی کاروائی کے دوران میں مدینے میں تھی اور ان کے اس فعل پر راضی تھی ورنہ ان کو اگر روکتی تو کسی تاریخ میں اس کا کہیں نشان ہوتا اور بلوائیوں کا سرکردہ اس کا سگا بھائی محمد بن ابوبکر تھا جو سن و سال میں اس سے چھوٹا تھا اور اپنی بڑی بہن کا بہت احترام کرتا تھا اور تو اگر اپنے بھائی کو بلا کر اس شورش سے باز رہنے کی اس کو فمائش کرتی تو یقیناً وہ مان لیتا اور اگر نہ بھی مانا تو کم از کم حضرت عثمان کے ساتھ ان کی خیر خواہی تو منظر عام پر آجاتی۔ بہر کیف مورخین کا نکتہ نگاہ یہ ہے کہ لوگوں کو حضرت عثمان کے قتل پر اکسا بھڑکا کر خود جج کے لئے مکہ چلی گئی اور جب اس کو عثمان کے قتل کی خبر ملی اور یہ کہ حضرت علی کو لوگوں نے چوتھا خلیفہ بنا لیا ہے تو اس نے عثمان کے خون کا بدلہ لینے کا اعلان کیا۔ اس موقع پر عبد بن ام کلاب نے کہا خدا کی قسم تو ہی تو لوگوں کو اس کے قتل پر اکساتی تھی اور کتنی تھی اُقتُلُوا نَعْتَلُ قَاتِلَهُ اللّٰهُ اِنَّہٗ قَدْ کَفَرَ اس نعل عثمان کو قتل کرو خدا اس کو مارے تحقیق یہ کافر ہے (مودودی صاحب نے لیپ پوت سے کام لے کر اس جملہ کو نرم کر کے پیش کیا ہے) حضرت عائشہ نے جواب دیا "ان لوگوں نے حضرت عثمان سے توبہ کرا لی تھی پھر ان کو قتل کر ڈالا، خدا جانے حضرت عثمان کی توبہ کا جناب عائشہ کو غائبانہ کیسے پتہ چل گیا۔ حالانکہ اگر حضرت عثمان نے اپنی ان غلطیوں سے توبہ کی ہوتی جو تمام مسلمانوں کے لئے ناراضگی کا باعث بنی ہوئی تھیں تو یقیناً ان کو قتل نہ کیا جاتا اور قاتلین میں حضرت عمرو بن الحمق خزاعی بھی تھے جو صحابی رسول تھے اور صحابیت کے شرف اور بلند مرتبہ کے پیش نظر ناممکن ہے کہ توبہ کر لینے کے بعد بھی وہ اپنے اقدام سے باز نہ آئے۔ ان کے متعلق خود مودودی صاحب رقمطراز ہیں "عمرو بن الحمق رسول اللہ کے صحابیوں میں سے تھے مگر حضرت عثمان کے قتل میں انہوں نے بھی حصہ لیا تھا،" مگر اور جب حضرت عائشہ نے حضرت عثمان کی توبہ کا بہانہ پیش کیا تو عبد بن ام کلاب نے اس کو تسلیم نہ کیا بلکہ جواب میں یہ اشعار پڑھے۔

اب رونا اور دوا دلا کرنا تجھ سے ظاہر ہے

حالانکہ یہ آندھیاں اور بارش تجھ سے ہی ہوئی

اور تو نے ہی امام (عثمان) کے قتل کا حکم دیا تھا

اور تو نے کہا تھا کہ وہ کافر ہو چکا ہے۔

مِنْكَ الْبُكَاءُ وَمِنْكَ الْعَوْدِيلُ

وَمِنْكَ الرِّيحُ وَمِنْكَ الْمَطَرُ

وَ أَنْتَ أَمَرْتَ بِقَتْلِ الْإِمَامِ

وَقُلْتَ لَنَا إِنَّہٗ تَدْکُفَرُ

کہ اصلاحی اقدامات سے بالکل مایوسی ہو گئی تھی تب یہ آخری قدم اٹھایا گیا۔ اور خود مودودی صاحب نے وہ بے لفظوں میں اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے کہ حضرت علی صلح و صفائی میں آخر تک کوشاں رہے اور شورشی لوگ بھی حضرت علی کے فیصلے کو مان جاتے تھے لیکن حضرت عثمان آخر تک اپنی پالیسی کو نہیں بدل سکے تھے۔ ملاحظہ ہو۔

”لوگوں نے حضرت علی سے کہا کہ آپ حضرت عثمان سے مل کر ان معاملات پر بات کریں چنانچہ وہ ان کی خدمت میں تشریف لے گئے اور ان کو وہ پالیسی بدل دینے کا مشورہ دیا جس پر اعتراضات ہو رہے تھے۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ جن لوگوں کو میں نے عہدے دئے ہیں انہیں آخر عمر بن الخطاب نے بھی تو عہدوں پر مامور کیا تھا پھر میرے ہی اوپر لوگ کیوں معترض ہیں؟ حضرت علی نے جواب دیا ”عمر جس کو کسی جگہ کا حاکم مقرر کرتے تھے اس کے متعلق اگر انہیں کوئی قابل اعتراض بات پہنچ جاتی تھی تو وہ بُری طرح اس کی خبر لے ڈالتے تھے مگر آپ ایسا نہیں کرتے آپ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نرمی برتتے ہیں حضرت عثمان نے فرمایا ”وہ آپ کے بھی تو رشتہ دار ہیں“ حضرت علی نے جواب دیا (ترجمہ) بے شک میرا بھی اُن سے قریبی رشتہ ہے لیکن دوسرے لوگ اُن سے افضل ہیں“ حضرت عثمان نے کہا ”کیا عمر نے معاویہ کو گورنر نہیں بنایا تھا“ حضرت علی نے جواب دیا عمر کا غلام ریفاء بھی ان سے اتنا نہ ڈرتا تھا جتنے معاویہ ان سے ڈرتے تھے اور اب حال یہ ہے کہ معاویہ آپ سے پوچھے بغیر جو چاہتے ہیں گزر رہے ہیں اور کہتے ہیں یہ عثمان کا حکم ہے مگر آپ انہیں کچھ نہیں کہتے۔“ ۳۳۱

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی کی باتوں کا اس پر ذرہ بھرا اثر نہ ہوتا تھا بلکہ وہ اپنی غلط پالیسیوں کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا۔

یہ سب کچھ مروان بن الحکم، سعید بن العاص، عبداللہ بن عامر اور معاویہ کی بدولت ہو رہا ہے آپ ان لوگوں کی بات مانتے ہیں اور میری نہیں مانتے“ حضرت عثمان نے فرمایا ”اچھا اب میں تمہاری بات مانوں گا“ اس پر حضرت علی انصار و مہاجرین کے ایک گروہ کو ساتھ لے کر

بقیہ حاشیہ ص ۷۸

فَهَبْنَا اطْعَانِكَ فِي قَتْلِهِ - پس سمجھ لیجئے کہ ہم نے تو اس کے قتل میں تیرے حکم کی اطاعت کی ہے
وَقَاتِلُهُ عِنْدَنَا مِنْ اَمْرٍ اور درحقیقت اس کا قاتل وہی ہے جس نے حکم دیا تھا (یعنی تو ہی اسکی قاتل ہے)

الح (تذکرۃ الخواص سبط بن الجوزی) تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۷۱

مصر سے آنے والے شورشیدوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو واپس جانے کے لئے راضی کیا۔ ص ۳۳۲۔

اس سے مودودی صاحب کی اس ایپ پوٹ کا پردہ بھی چاک ہو گیا کہ سازشی لوگ مدینہ میں اچانک گھس آئے تھے اور انہوں نے شہر کی ناکہ بندی کر لی تھی اور اہل شہر کو بے بس کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے یہ لوگ شورش کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ اپنے مظالم کی فریاد لے کر پہنچے تھے جو بنی امیہ کے ناخدا تریس ظالم حکام کی طرف سے ان پر ڈھائے جاتے تھے اور حضرت عثمان ان لوگوں کی شکایات پر کان دھرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے اور مودودی صاحب خود اس کے معترف ہیں چنانچہ الریاض النضرہ سے سعید بن مسیب کا قول نقل کرتے ہیں: آپ عثمان اسے ان احکام کی شکایت کی جاتی مگر آپ ان کی شکایت کو دور فرماتے ص ۳۳۳ الاصابہ ابن حجر اسے قتل کرتے ہیں (حضرت عثمان) اپنے بعض امراء کو تبدیل کر کے لوگوں کو راضی کر دیتے اور پھر انہیں دوبارہ مقرر کر دیتے تھے ص ۳۳۴ اور فیض الباری سے النور شاہ صاحب کا قول نقل کیا ہے۔

پھر ان فتنوں کے بھڑکنے کا سبب یہ ہوا کہ امیر المومنین عثمان اپنے رشتہ داروں کو مناصب حکومت پر مقرر کرتے تھے اور ان میں سے بعض کا طرز عمل اچھا نہ تھا اس پر لوگ معترض ہوتے اور ان کی شکایات لوگوں نے حضرت عثمان تک پہنچائیں مگر حضرت نے ان کو سچ نہ سمجھا اور خیال کیا کہ یہ لوگ میرے رشتہ داروں سے خواہ مخواہ جلتے ہیں اور شاید انہیں میرے رشتہ داروں کا مناصب پر مقرر کیا جانا ناگوار ہے اس لئے یہ ان کی شکایتیں کرتے ہیں۔۔۔۔۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ حضرت عثمان نے اگرچہ اپنے رشتہ داروں کو لوگوں کی شکایتوں پر معزول نہیں کیا مگر آپ نے ان کی حمایت بھی نہیں کی۔ ص ۳۳۵

خدا اس اندھنی تقلید کا امتیاز ناس کرے۔ جب ان ظالم حکمرانوں کو معزول نہیں کیا جاتا، بلکہ ویسے کا ویسا ان کو ان کی گردنوں پر سوار رکھا جاتا ہے اور عہدہ گورنری پر ان کو برقرار کیا جاتا ہے وہ جس طرح چاہیں ان کا خون چوستے رہیں تو یہ ان ظالم گورنروں کی حمایت نہیں تو اور کیا ہے؟ حضرت عثمان خویش نوازمی اور کنبہ پروری میں اس قدر از خود رفته ہو گئے کہ حضرت علی کے سمجھانے پر ان سے بھی کنبہ لگے تھے کہ وہ آپ کے بھی تو رشتہ دار ہیں ص ۳۳۱۔ یہ فقرہ صرف اپنی غلط پالیسی پر تائید حاصل کرنے کے لئے انہوں نے کہا تھا تا کہ کنبہ پروری میں وہ اس بہانہ سے ان کی حمایت کریں لیکن حضرت علی علیہ السلام نے رشتہ داری کا اعتنا ان کرتے ہوئے فرمایا ”دوسرے لوگ

اُن سے افضل ہیں، اور وہ ان مناصب کے زیادہ سزاوار ہیں۔

بہر حال یہ لوگ اچانک مدینہ میں نہیں گھسے تھے بلکہ اصلاح طلبی کی خاطر آئے تھے اور کافی دیر تک انصار و مہاجرین کے ذریعے سے کوششیں جاری رہیں جس کا مودودی صاحب کو اعتراف ہے ^{۳۳۱}۔
لیکن حضرت عثمان نے آخر تک اپنی پالیسی نہ بدلی جس کے نتیجے میں سوائے چار آدمیوں کے حضرت عثمان کا پورے مدینے میں کوئی بھی حامی نہ رہا۔ اور حضرت علی علیہ السلام نے بھی ان اصلاحی کوششوں کی ناکامی کا شکوہ کیا ہے چنانچہ خلافت و ملوکیت میں اس کا اعتراف موجود ہے حضرت علی علیہ السلام عثمان سے بات چیت کرنے کے بعد مہاجرین و انصار کی ایک جماعت لے کر شورشیدوں کے پاس گئے اور ان کو واپس جانے پر رضامند کیا لیکن عثمان پھر بھی اپنی سابق پالیسی پر برقرار رہا۔ ملاحظہ ہو۔

اسی زمانہ فتنہ میں ایک اور موقع پر حضرت علی سخت شکایت کرتے ہیں کہ میں معاملات کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں اور مردان ان کو پھر بگاڑ دیتا ہے آپ خود منبر رسول پر کھڑے ہو کر لوگوں کو مطمئن کر دیتے ہیں اور آپ کے جانے کے بعد آپ ہی کے دروازے پر کھڑا ہو کر مردان لوگوں کو گالیاں دیتا ہے اور آگ پھر بھڑک اٹھتی ہے۔ ^{۳۳۲}

اب ان حقائق کا اعتراف کر لینے کے بعد بھی یہ کہنا کہ شورشید اچانک گھس آئے تھے الخ لیب پوت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور یہ دعویٰ کہ ”چاروں خلفاء حکومت کے انتظام اور قانون سازی کے معاملے میں قوم کے اہل الرائے لوگوں سے مشورہ کئے بغیر کام نہیں کرتے تھے“ ^{۳۳۳} صرف مقلدانہ عقیدہ کو آنکھیں بند کر کے قائم رکھنے کے لئے ہی ہے۔

لیب پوت کی مذمت

”بزرگوں کے کام پر تنقید کا صحیح طریقہ“ کے عنوان سے رقمطراز ہیں۔

تمام بزرگان دین کے معاملہ میں عموماً اور صحابہ کرام کے معاملہ میں خصوصاً میرا طرز عمل یہ ہے کہ جہاں تک کسی معقول تاویل سے یا کسی معتبر روایت کی مدد سے ان کے کسی قول یا عمل کی صحیح تعبیر ممکن ہو اسی کو اختیار کیا جائے اور اس کو غلط قرار دینے کی جسارت اُس وقت تک نہ کی جائے جب تک کہ اس کے سوا چارہ نہ رہے لیکن دوسری طرف میرے نزدیک معقول تاویل کی حدود سے تجاوز کر کے اور لیب پوت کر کے غلطی کو چھپانا یا غلط کو صحیح بنانے کی کوشش کرنا نہ صرف انصاف اور علمی تحقیق کے خلاف ہے بلکہ میں اسے نقصان دہ بھی سمجھتا ہوں کیونکہ اس طرح

کی کمزور و کالت کسی کو مطمئن نہیں کر سکتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صحابہ اور دوسرے بزرگوں کی اصل خبروں کے بارے میں جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ بھی مشکوک ہو جاتا ہے اس لئے جہاں صاف صاف دن کی روشنی میں ایک چیز علانیہ غلط نظر آرہی ہو وہاں بات بنانے کی بجائے یہ سے نزدیک سیدھی طرح یہ کہنا چاہیے کہ فلاں بزرگ کا یہ قول یا فعل غلط تھا غلطیاں بڑے بڑے انسانوں سے ہو جاتی ہیں اور ان سے ان کی بڑائی میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ ان کا مرتبہ ان کے عظیم کاموں کی بنا پر متعین ہوتا ہے نہ کہ ان کی کسی ایک یا دو چار غلطیوں کی بنا پر نہ (خداوند و ملکیت) یہ نظریہ مقلدانہ ذہنیت کی پیداوار ہے اس کا تحقیق و انصاف سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے کیونکہ بزرگی کا تعین اعمال سے ہوا کرتا ہے اور بزرگ وہی ہوتا ہے جس کا کردار اس کی بزرگی کا علمبردار ہو ایسا بزرگ نہیں کہ بزرگی پہلے مان لی جائے اور بعد میں اس کے ہر عمل کو اس کی تسلیم کر دہ بزرگی کے ماتحت صحیح کرنے کی کوشش کی جائے۔ نیز اگر کردار کے لحاظ سے کسی کی بزرگی مستحکم ہو جائے تو اس کی بزرگی کی بقا کردار کی بقا سے وابستہ رہے گی۔ اسی لئے انسان کے خاتمے کی اچھائی ہی اس کی نجات کا پیش خیمہ قرار دی جاتی ہے۔ پس جس طرح نیک کردار سے انسان بلند مرتبہ اور بزرگ بن جاتا ہے اسی طرح غلط کاریوں اور بد کرداریوں سے وہی انسان پست مرتبہ کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے۔

سیاست کے میدان میں پھر بھی اس لیپ پوت کی گنجائش ہے کہ جو شخص سیاسی میدان میں ایک دفعہ اپنا نام پیدا کرے وہ بعد میں سیاسی غلطیوں کی بدولت اپنے بلند منی مقام اور عظیم المرتبہ ہونے سے نہیں گرتا اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ غلطیاں بڑے بڑوں سے ہو جایا کرتی ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ ایسے لوگ عمداً ایسی غلطیاں نہیں کیا کرتے بلکہ وہ اپنی طرف سے اچھا اقدام کرتے ہیں لیکن سیاسی داؤ پیچ یا بد مقابل کے رد عمل کی بدولت ان کا وہ اقدام غلط قرار پاتا ہے۔ دین اور شریعت کے واضح اور صحیح مسلک میں اس قسم کے لیپ پوت سے حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں اگر کسی نے نیک کام کرنے کے بعد مقام عظیم پیدا کر لیا لیکن انجام کار بد کاریوں اور بد عملیوں میں منہمک ہو گیا تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی بزرگی مسلم ہے اور اس کا مرتبہ اس کے عظیم کاموں کی بنا پر متعین ہے لہذا ان سیہ کاریوں سے اس کے مرتبہ اور بزرگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ قرآن مجید نے صاف اعلان فرمایا ہے کہ جن لوگوں کا انجام غلط ہو ان کے اعمال جھٹ بولائے۔ جَبَطْتُ أَعْمَالَهُمْ پس بزرگی ختم ہوئی۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ صحابی ہو یا کوئی دوسرا۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

میں کسی بزرگ کے کسی کام کو غلط صرف اس وقت کہتا ہوں جب وہ قابل اعتماد ذرائع سے ثابت ہو

اور کسی معقول دلیل سے اس کی تاویل نہ کی جاسکتی ہو مگر جب اس شرط کے ساتھ میں جان لیتا ہوں کہ ایک کام غلط ہوا ہے تو میں اسے غلط مان لیتا ہوں پھر اس کام کی حد تک ہی اپنی تنقید کو محدود رکھتا ہوں اور اس غلطی کی وجہ سے میری نگاہ میں نہ اُن بزرگ کی بزرگی میں کوئی فرق آتا ہے نہ اُن کے احترام میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے۔ مجھے اس بات کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ جن کو میں بزرگ مانتا ہوں ان کی کھل کھلی غلطیوں کا انکار کروں۔ لیپ پوت کر کے ان کو چھپاؤں یا غیر معقول تاویلیں کر کے ان کو صحیح ثابت کروں۔ غلط کو صحیح کہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے معیار بدل جائیں گے اور جو غلطیاں بزرگوں نے اپنی اپنی جگہ الگ الگ کی ہیں وہ سب اکٹھی ہمارے اندر جمع ہو جائیں گی اور لیپ پوت کرنے یا علانیہ نظر آنے والی چیزوں پر پردہ ڈالنے سے میرے نزدیک بات نہیں بنتی بلکہ اور بگڑ جاتی ہے۔ اس سے تو لوگ اس شبہ میں پڑ جائیں گے کہ ہم اپنے بزرگوں کے جو کمالات بیان کرتے ہیں وہ بھی شاید بناوٹی ہوں گے۔ ص ۳۰

بے شک منصف مزاج حقیقت طلب تحقیق پسند اور حق جو ارباب عقل و دانش کا نظریہ یہی ہونا چاہیے جو مودودی صاحب نے ذکر فرمایا ہے لیکن جب مذہب کی بنیاد ہی لیپ پوت کے اصولوں پر قائم ہو اور تحقیق کی آنکھوں پر ابتداء سے پٹی باندھ دی گئی ہو اور چودہ سو برس سے ایک نظریہ کو بلا چون و چرا تسلیم کر کے آنکھیں بند کر لینے کی عادت پڑ چکی ہو۔ ایسی صورت میں راست بازی سے مراد راست گوئی لے کر راست باز کہلانے والے خود فریبی کے جال میں پھنسے ہوئے دانشوروں کو صحیح مشورہ دینا بہت مشکل ہوتا ہے یہ ایسا ہے جس طرح کسی اندرونی مہلک بیماری میں مبتلا مریض جو اپنے حسن ظن یا خود فریبی کے خیال میں پھنس کر اپنے آپ کو سونی صدی تندرست خیال کرتا ہو اُسے کوئی اپنے مرض کے علاج کی دعوت دے وہ بیشک بیماری کا شکوہ کرے گا اور دوسرے بیمار لوگوں کو پُر زور علاج کرانے کا مشورہ دے گا لیکن اپنے علاج کی طرف وہ ملتفت ہی نہ ہوگا بلکہ بیماری کئے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ سے چپ کرانے کی کوشش کرے گا اور اپنے اندر کی خطرناک بیماری کے علائم کو بھی بعض اوقات چھپانے کی کوشش کرے گا بھلا جو بیمار اپنی بیماری کو بیماری نہیں سمجھتا وہ علاج کی طرف متوجہ کیوں ہو۔ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ جاہل بسیط (جو اپنی جمالت سے خبردار ہوا کی جمالت رفع ہو سکتی ہے لیکن جاہل مرکب (جو اپنی جمالت سے بے خبر ہوا کی جمالت کا دور ہونا ناممکن ہے۔ مذہب جمہور کی بنیاد ہی لیپ پوت پر ہے اور پہلے دن سے اس کے واجب العمل اصولوں میں سے یہ طے شدہ بات ہے کہ شیعہ کی بات نہ سنو اور نہ مانو صحابہ کے متعلق جرح و قدح نہ سنو اور نہ مانو اور جن کو بزرگ کہا جا چکا ہے اُن کو بر ممکن طریقہ سے بزرگ ثابت کرو اور اس پر

کئے جانے والے اعتراضات نہ سُنو اور نہ مانو، چنانچہ خلافت و ملکیت کے معاملے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ صحابہ کے متعلق عقیدہ ص ۳۲ تا ص ۳۳ پر ہے۔ اسی طرح حضرت ابوبکر سے لے کر یزید بن معاویہ تک کے جمہوری حکمرانوں کے متعلق مودودی صاحب کے پیش کردہ مواد کا منظر غائب جائزہ لیجئے۔ آپ کو یقیناً تحقیق و اجتہاد کے خوشمالیاس میں لیب پوت کا بد صورت بھوت ڈھانپا ہوا نظیر آئے گا۔ سب سے پہلے حضرت ابوبکر کی خلیفہ سازی کے متعلق حضرت عمر کا طرز عمل ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ کی مجلس میں اچانک اٹھ کر حضرت ابوبکر کا نام تجویز کیا اور ہاتھ بڑھا کر فوراً ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ان کو خلیفہ بنانے کے معاملے میں پہلے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا ص ۸۲ حاشیہ ۱ اور اپنے اس فعل کے جواز کی تاویل انہوں نے یہ بتائی کہ اس وقت مخصوص حالات تھے جن میں اچانک حضرت ابوبکر کا نام تجویز کر کے میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اگر میں ایسا نہ کرتا اور خلافت کا تصفیہ کئے بغیر ہم لوگ مجلس سے اٹھ جاتے تو اندیشہ تھا کہ راتوں رات لوگ کہیں کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں اور ہمارے لئے اس پر راضی ہونا بھی مشکل ہو اور بدلنا بھی مشکل۔ یہ فعل اگر کامیاب ہوا تو اسے آئندہ کے لئے نظیر نہیں بنایا جاسکتا ص ۸۲ لیجئے اپنے آخری فقرے میں اپنے طرز انتخاب کے غلط ہونے کی طرف اشارہ بھی کر دیا کہ ہم نے اگرچہ غلط طریقہ سے خلیفہ بنالیا اور کامیاب ہو گئے لیکن آئندہ والوں کے لئے یہ طریقہ ناجائز ہے گویا آپ نے دھونس اور دھاندلی سے منتخب ہونے والے ہر سربراہ مملکت کے لئے عذر بارود کی ایک راہ کھول دی کہ ہر الکیشن جتنے والا کہہ سکتا ہے ہم نے مخصوص حالات کی بنا پر یہ کھیل کھیلا ہے جو دوسروں کے لئے ناجائز ہے اور حضرت عمر کو جن حالات کا خطرہ تھا کہ راتوں رات کہیں کوئی ایسا قدم اٹھ جاتا جو ہماری نظروں میں غلط ہوتا وہ یہ کہ یا تو سعد بن عبادہ انصاری اپنی جمعیت بڑھا کر اقتدار سنبھال لیتا چنانچہ بقول صاحب تذکرۃ الخواص سقیفہ کے جھگڑے میں انصار نے اسے اپنی طرف سے چُن بھی لیا تھا یا حضرت علی بطور اُمیدوار کھڑے ہو جاتے اور ان کے ذاتی شرف و منزلت کی وجہ سے اکثریت ان کی طرف جھک جاتی جیسا کہ بشیر بن سعد انصاری کا قول قبل ازیں الامامۃ السیاستہ سے نقل کیا جا چکا ہے۔

خلافت کے صحیح انعقاد کے لئے حضرت عمر کے نزدیک طریقہ کاری یہ ہے کہ اس کو تمام مسلمانوں کے مشورہ سے انتخاب کیا جائے۔ جس شخص نے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی امیر کی بیعت کی اس کی کوئی بیعت نہیں اور نہ اس شخص کی کوئی بیعت ہے جس سے اس نے بیعت کی ایک اور روایت ہے حضرت عمر کے الفاظ یہ بھی آئے ہیں کہ جس شخص کو مسلمانوں کے مشورے کے بغیر امارت دی جائے

اس کے لئے اس کا قبول کرنا حلال نہیں ہے (ص ۱۵۱ حاشیہ)

پس حضرت عمر کے نظریۂ اعتقادِ خلافت اور ان کے ذاتی فعل میں صاف تضاد ہے ان کے اپنے نظریے کے ماتحت نہ ان کی بیعت بیعت ہے اور نہ اس کا قبول کرنا حضرت ابوبکر کے لئے حلال۔ اسی طرح مودودی صاحب نے بھی جمہوری خلافت کا یہی نظریہ پیش کیا ہے کہ یہ ایک انتخابی منصب ہے جسے مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آزادانہ رضامندی سے قائم ہونا چاہیئے۔ پس ان کے اپنے تجویز کردہ قانون کے رُو سے خلافت کی عالی شان عمارت دھڑم سے نیچے گر گئی۔ باقی رہی دھکاشاہی اور دھینگا مستی تو اس کو کون روک سکتا ہے اور اقتدار قائم ہو جانے کے بعد متدین صحابہ رسول کا خاموشی اختیار کر لینا یا ہاں میں ہاں ملا لینا وہ اسلامی وقار کے پیش نظر تھا اور اسی بنا پر حضرت علی علیہ السلام اپنی پوری جماعت کے ساتھ قائم شدہ حکومت کے ماتحت وفادار شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے رہے۔ اور اسلام کے وقار کے پیش نظر حکومتِ وقت سے (جو اسلامی حکومت کے نام سے موسوم تھی) پورا پورا تعاون کرتے رہے۔

اور مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ ”مدینے کے تمام لوگوں نے کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی“۔ یہ حق و انصاف کا خون ہے۔ اور حقائق و واقعات سے روگردانی ہے بلکہ یہ وہی لپ و پوت کا ناگزیر حربہ ہے جسے ہر کامیاب ہونیوالا الیکشن جیتنے کے بعد اختیار کر لیا کرتا ہے۔ ”گذشتہ صفحہ میں خلافتی الیکشن میں دھاندلیوں کا انکشاف کیا جا چکا ہے“

علامہ اختلاف کرنے والوں میں سے حضرت زبیر ہیں جنہوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ میں سوائے علی کے کسی اور کی بیعت نہ کروں گا حضرت عباس نے بھی یہی اعلان کیا تھا۔ سعد نے الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا۔ اور حضرت عمر نے ان کے متعلق کہہ دیا تھا کہ اس کو قتل کر دو۔ خدا اس کو قتل کرے۔ حضرت سلمان فارسی نے انکار کیا تو اس کی گردن پر گھونٹے مارے گئے ابوسفیان نے صاف انکار کیا اور بنی ہاشم نے چھ ماہ تک بیعت نہ کی (تذکرۃ الخواص سبط بن الجوزی) سعد بن عبادہ انصاری اور ابوسفیان کے انکار کو مودودی صاحب قبائلی عصبيت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ حضرت علیؑ نے بیعت سے صاف انکار کیا اور جناب فاطمہ بنت رسولؐ نے بھی صاف انکار کے علاوہ قطع تعلقی اور قطع کلامی بھی کر لی (الامامة والسياسة) اور مودودی صاحب نے ان تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ان میں سے کسی بزرگ کے اختلاف کا نام تک نہیں لیا تاکہ لپ و پوت سے کام نہ کالاجا سکے۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر نے مسلمانوں سے مشورہ کئے بغیر حضرت عمر کو نامزد کر لیا اور لوگوں کو

بعت کے لئے حکم دے دیا۔ اور مودودی صاحب کے طے کردہ منشور خلافت کی رو سے یہ بات آئینی نہیں تھی۔
 کیونکہ کسی ایک شخص کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تمام امت کے اختیارات کو اپنے اندر مرکوز کر کے کسی کو
 نامزد کر دے چنانچہ مودودی صاحب نے ص ۸۲ پر حضرت عمر کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے ایک شخص
 سے اس قسم کی بات سنی کہ ان کے مرنے کے بعد میں فلاں کو نامزد کر کے بعت کر لوں گا، تو حضرت عمر
 نے واپس مدینہ میں پہنچ کر برسرِ عام اس طرزِ عمل کی تردید کی لیکن ہر مقام پر راست بازی راست گوئی
 کے معنی تک ہی محدود ہے۔ حضرت ابو بکر نے نامزد کر دیا اور ان کے اقتدار کے ہوتے ہوئے کس کو
 مجال انکار تھی پس بعت ہو گئی اور جمہوری خلافت کی راہ میں دوسرا سنگ میل نصب کر دیا گیا۔

اس کے بعد حضرت عمر نے پوری امت کے اختیارات خلافت اپنے اندر جذب کر کے اپنی
 منشا کے چھ آدمیوں میں بند کر دیئے حالانکہ آئینی طور پر ان کو اس امر کا کوئی اختیار حاصل نہ تھا اور اس کے
 بعد حضرت عثمان کے متعلق ان کو پورا خدشہ تھا کہ اگر میں ان کو اپنا جانشین تجویز کروں تو وہ بنی امیہ کو
 لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانی کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں نے ایسا
 کیا تو عثمان ہی کریں گے، ص ۹۹۔ نیز سعد بن ابی وقاص کے متعلق بھی ان کو یہی خطرہ لاحق تھا تاہم شوری میں
 بعض مسلمات کی بنا پر ان کو شامل کرنا ضروری سمجھا گیا اور چھ آدمیوں کے ذہنی نتیجہ کو لاکھوں بلکہ کروڑوں
 فرزندِ اسلام کے لئے واجب العمل قرار دیا گیا۔

حضرت عثمان نے اپنے پہلے خطبے میں بیان دیا تھا۔

ایک یہ کہ میری خلافت سے پہلے تم نے باہمی اتفاق سے جو قاعدے اور طریقے مقرر کئے تھے
 ان کی پیروی کروں گا۔ دوسرے یہ کہ میں معاملات میں پہلے کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہوا ہے
 ان میں سب کے مشورے سے اہلِ نبیہ کا طریقہ مقرر کروں گا۔ ص ۹۳

چھ آدمیوں کی انتخابی شوری کے لئے انہوں نے حضرت عمرؓ نے جو ہدایات چھڑیں، ان میں
 دوسری باتوں کے ساتھ ایک بات یہ بھی شامل تھی کہ منتخب خلیفہ اس امر کا پابند رہے کہ وہ
 اپنے قبیلے کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہ کرے مگر بد قسمتی سے خلیفہ ثالث حضرت عثمان
 اس معاملہ میں معیارِ مطالب کو قائم نہ کر سکے۔ ص ۹۹۔

اب جمہورِ اہلِ اسلام جمہور میں کہ ازاد عقل و نقل خلافت کی جو راہ متعین کرتے ہیں ان کے
 تجویز کردہ خلفائے قبلہ سے ہی اس راہ سے نفرت ہیں پس ایسا پوت سے کام لے کر ایک طرف
 ان کی خواہش کو اسلامی حکومت کا نام دینا ہے اور دوسری طرف مذہب کی تشکیل میں انہی مطالب پر

کرنی ہے جو ان کے نزدیک ان کے اسلامی خلیفوں نے تجویز کئے ہیں لہذا لیب پوت کر کے متصف و افکار کو نہ اپنائیں تو کیا کریں؟ اور صحابہ کے متعلق خلافت و ملکیت کے صفت و صفت پر جس نظریے کا اظہار کیا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ ان کی غلطیوں کو اس وقت تک ہم غلطی نہ کہیں گے جب تک ان کی کوئی تاویل کی جاسکتی ہو اور جہاں دن کی روشنی میں ان کی غلطی نظر آرہی ہو تو اس کو غلط کہے بغیر چارہ نہیں اس کا دوسرے لفظوں میں معنی یہ ہوا کہ ان کی غلطیوں کو اولاً تو ہم لیب پوت کے غلاف میں چھپانے کی کوشش کریں گے اور جہاں لیب پوت کا دروازہ بند ہو جائے کہ ان کی غلطی روز روشن کی طرح واضح ہو جائے تو ہم لیب پوت کی بجائے ان کی غلطی کو غلطی کہہ دیں گے۔ اس تحقیق کے صدقے اور اس حبرأت کے قربان کہ جب غلطی اس قدر واضح ہو کہ تاویل کا امکان نہ رہے تو ہم لیب پوت نہیں کرتے بلکہ علانیہ اس کو غلط کہہ دیتے ہیں اور لطف یہ کہ حضرت عثمان کی جن غلطیوں کو وہ تاویل اور لیب پوت کے دامن میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ "خولیش نوازی" نہ تھی بلکہ "صلہ رحمی" تھی، یہ نسبت کی غلطی نہ تھی بلکہ رائے کی غلطی یا بالفاظ دیگر اجتہادی غلطی تھی، ص ۳۲۱ صحابیوں، صحابی زادوں، اکابر صحابہ حتیٰ کہ طلحہ و زبیر و عائشہ بلکہ چار آدمیوں کے علاوہ تمام اہل مدینہ کے نزدیک حضرت عثمان کی غلطیاں اس طرح روز روشن کی طرح عیاں تھیں کہ ان کے لئے لیب پوت کی گنجائش تک نہ رہی ورنہ وہ ضرور ان کی جائز تاویل کر کے خلیفہ مقتول کی حمایت میں زبان کھولتے جس طرح کہ ص ۳۲۹ تا ص ۳۳۲ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے اور اگر ان غلطیوں کے لئے کوئی صحیح راستہ تجویز کیا جاسکتا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرب زمانہ پیغمبر کے مسلمانوں میں اس قدر ایمانی اور دینی کمزوری پیدا ہو گئی تھی کہ وہ تاویل کئے بغیر شورشیوں کے ہمہوا ہو گئے حتیٰ کہ مدینہ منورہ میں اچھی خاصی تعداد ان کے ہم خیالوں کی ہو گئی ص ۳۳۵۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان کی غلطیاں تو اس قدر واضح تھیں کہ اور تو اور اس کی بیوی نائلہ کے لئے بھی تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی جس کا مودودی صاحب نے ص ۱۱۶ پر اعتراف کیا ہے۔

مذہب جمہوری میں تو اس لیب پوت کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ وہ مودودی صاحب کے عثمان کی طرف اجتہادی غلطی کو منسوب کرنے پر بھی سخت خفا ہیں حالانکہ انہوں نے اپنی جانب سے کافی بچ بچاؤ کر کے لکھا ہے۔

اور عثمان کے بعد والے لوگوں کے متعلق لیب پوت کر کے ان کی اغلاط کی پردہ پوشی مذہب جمہور میں ایک فرض سے کم حیثیت نہیں رکھتی اگرچہ وہ اپنے مقام پر صرف بعد از عقل ہی نہیں بلکہ منہکہ خیر بھی ہیں لیکن جب مذہب کی بنیاد ہی اسی لیب پوت پر ہے تو اس کے علاوہ اور چارہ ہی کیا ہے؟ دیکھئے

حضرت عائشہ جنگ جمل میں حضرت علی کے مخالف گروپ کی اصل قائد ہیں ۱۲۹؎ و ۱۳۰؎ اسی طرح طلحہ و زبیر
حضرت علی کے مخالف گروپ کے صرف سامی ہی نہیں بلکہ قباہیہ اور ان میں سے ہیں اور معاویہ ساری زندگی حضرت
علی سے نبرد آزما رہا اور عمرو عاص اس کا دست راست بنا رہا۔ اسی طرح بہت سے صحابہ کی یہی حالت ہے
مذہب جمہور کی رو سے علی حق پر بھی ہے لیکن دوسرے فریق کو بھی برا کہنا گوارا نہیں جناب مودودی صاحب
عقیدہ طلحہ و زبیر سے مسلک جمہور اہل سنت یہ نقل کرتے ہیں۔

ہم رسول اللہ کے تمام اصحاب کو محبوب رکھتے ہیں ان میں سے کسی کی مہلت میں سے نہیں
گزرتے اور نہ کسی سے تبری کرتے ہیں ان سے بغض رکھنے والے اور بُرائی کے ساتھ ان کا ذکر کرنے
والے کو ہم ناپسند کرتے ہیں اور ان کا ذکر بھلائی کے سوا اور کسی طرح نہیں کرتے اگرچہ صحابہ کی غائبی
کے بارے میں امام ابوحنیفہ نے اپنی رائے ظاہر کرنے سے دریغ نہیں کیا ہے چنانچہ وہ صاف
طور پر یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کی جن لوگوں سے بھی جنگ ہوئی (اور ظاہر ہے کہ اس میں جنگ
جمل و صفین کے مشرکاء شامل ہیں) ان کے مقابلہ میں علی زیادہ برسر حق تھے۔ لیکن وہ دوسرے
فریق کو مطعون کرنے سے قطعی پرہیز کرتے ہیں۔ ۲۳۳۔

یہ بھی امر واقعہ ہے کہ تمام فقہاء و محدثین و مفسرین نے بالاتفاق حضرت علی کی ان لڑائیوں کو جو آپ
نے اصحاب جمل اصحاب صفین اور خوارج سے لڑیں قرآن مجید کی آیت فَإِنْ بَغْتُمْ إِيَّاهُمْ فَلَا يَكُنْ فِيكُمْ جُنْدٌ مِّنْهُمْ
الْأَخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِي إِلَى أَمْرِ اللَّهِ کے تحت حق بجانب ٹھہرایا ہے کیونکہ ان
کے نزدیک آپ امام اہل عدل تھے اور آپ کے خلاف خروج جائز نہ تھا۔ میرے خیال میں کوئی ایک
بھی فقیہ یا محدث یا مفسر الیہ نہیں ہے جس نے اس سے مختلف کوئی رائے ظاہر کی ہو خصوصیت کے ساتھ
علمائے حنفیہ نے تو بالاتفاق یہ کہا ہے کہ ان ساری لڑائیوں میں حق حضرت علی کے ساتھ تھا اور ان کیخلاف
جنگ کرنے والے بغاوت کے مرتکب تھے ۳۲۸۔

انہوں نے ذکر کیا ہے کہ صاحب ہدایہ نے معاویہ کو سلطان جائز قرار دیا ہے چنانچہ وہ سلطان جور کی
طرف سے عہدہ قبول کرنے کے جواز میں بطور استدلال لکھتے ہیں۔

سلطان جائز سے عہدہ قضا قبول کرنا اسی طرح جائز ہے جس طرح سلطان عادل سے قبول کرنا
جائز ہے کیونکہ صحابہؓ نے حضرت معاویہؓ کی طرف سے عہدہ قضا قبول کیا تھا حالانکہ اپنی خلافت
کی نوبت آنے پر حق حضرت علی کے ہاتھ میں تھا۔ ۳۳۵۔

علامہ ابن ہمام کا قول اس بارے میں فتح القدیر سے یہ نقل کیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ حق حضرت علی ہی کے ساتھ تھا کیونکہ اپنی نوبت آنے پر وہ صحیح بیعت سے خلیفہ مقرر ہوئے تھے اور ان کی خلافت منعقد ہو چکی تھی۔ لہذا اہل جبل کے خلاف اور صفین کے مقام پر حضرت معاویہ کے خلاف لڑائی میں وہ حق پر تھے مزید برآں رسول اللہ کا حضرت عمارؓ کے بارے میں یہ ارشاد کہ تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ اس معاملہ میں بالکل صریح ہے کہ حضرت معاویہ کے ساتھی باغی تھے کیونکہ حضرت عمار کو انہی نے قتل کیا تھا ۳۳۹

اب جمہور کے اس مسلمہ عقیدہ (کہ ہم رسول اللہ کے تمام اصحاب کو محبوب رکھتے ہیں) نے متناظر نظریوں کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ تحقیق کی رو سے علی کو حق پر کہنا ضروری ہے اُن کے مخالف کو باطل پر بھی کہنا ہے لیکن تقلید کی رو سے اہل حق سے بھی محبت کرنی ہے اور اہل باطل سے بھی محبت کرنی ہے بنا بریں لیپ پوت کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ پس جنگ جبل میں طلحہ وزبیر و عائشہ کی مخالفت کو اجتہاد ہی غلطی قرار دے دیا ۳۴۰ معاویہ کی غلطی کو غلطی قرار دیا لیکن اس کو موجب فتنہ نہیں سمجھا اس لئے کہ انہوں نے تاویل کی بنا پر کیا تھا ۳۴۱ اور عمرو عاص کی غلطی کو محض غلطی تسلیم کیا۔ بہر حال تمام صحابہ سے محبت کے فریضے نے جمہور اہل اسلام کے لئے مستقل الجھن پیدا کر دی۔

بنا بریں حضرت عثمان سے محبت ہے کیونکہ صحابی رسول ہے اور عمرو بن الحمق (جو عثمان کے قاتلین میں سے ہے) سے بھی صحابی رسول ہونے کی بنا پر محبت واجب ہے۔

طلحہ وزبیر و عائشہ سے عقیدہ مندی بھی ضروری ہے اگرچہ وہ خلاف حق تھے اور حضرت علی سے بھی محبت ہے کیونکہ وہ برحق چوتھے مقام پر خلیفہ تھے۔

طرفین سے جو ہزاروں کی تعداد میں قتل ہو گئے (جن میں صحابہ بھی تھے اور غیر صحابہ بھی تھے) وہ بھی جنت کے مستحق ہیں اور حق و ناحق کی دو طرفی فوجیں بھی جنت کی مستحق ہیں جن کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

لطف یہ کہ غصہ حضرت علی پر تھا جنہوں نے قتل عثمان کے بعد اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی یا اُن شورشوں پر جنہوں نے مدینہ میں عثمان کو قتل کر دیا تھا لیکن طلحہ وزبیر و عائشہ نے فوجیں اکٹھی کر کے انتقام لے لیا۔ بصرہ کے بے گناہ مسلمانوں سے جنہوں نے قتل عثمان کا نام ہی ان ہی لوگوں کی زبانی سنا تھا نہ وہ شریک قتل اور نہ سازش میں ان کا حصہ تھا۔ حضرت عائشہ جو فوج کی کمان کر رہی تھی (خلافت و ملکیت ۱۳۱) نے بصرہ کے حاکم عثمان بن حنیف صحابی رسول کو بے گناہ قید کر لیا اور اس کو چالیس کوڑوں کی سزا دی اور اس کی ڈاڑھی کے بال نوچواڈالے اور ستر بے گناہ مسلمانوں کو قتل کر دیا (تذکرۃ الخواص سبط ابن الجوزی) لیکن جمہوری عقیدہ کی رو سے قاتل و مقتول دونوں کو جنتی بھی ماننا ہے اور دونوں (حق و باطل) سے محبت بھی

کرنا ضروری ہے۔

حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر کے متعلق یہ بہانا سادہ لیا جاتا ہے کہ انہوں نے توبہ کر لی تھی۔ مگر
لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ کیا قتل جیسے سنگین جرم کے لئے زبان سے توبہ کر لینا کافی ہے۔ اور پھر ایک دو
نہیں ہزاروں مومنوں بلکہ صحابیوں کا بے گناہ قتل۔ اسی طرح جنگ صفین میں حق (حضرت علی) اور باقی اصحاب
و عمر و عباس ابہر دو طرف سے ہزاروں جانیں تلف ہوئیں اور عمار بن یاسر اور اویس قرنی جیسے محبوب
رسول مارے گئے لیکن قاتل و مقتول دونوں سے محبت میں فرق نہیں آتا۔ اور نہ ان بے گناہ ہزاروں مومنین
کے قتل سے ان کی بزرگی میں کوئی کمی آتی ہے اور نہ احترام میں فرق آتا ہے۔ حجر بن عدی جیسے عابد و زاہد
صحابی کو قتل کیا گیا تھا لیکن نہ بزرگی ٹوٹی اور نہ احترام میں کمی ہوئی اور پھر منبروں پر حضرت علی اور اولاد علی کو
سب و شتم کیا اور کرایا گیا تھا۔ لیکن ہر دو فریق (حق و ناحق) کے احترام و بزرگی میں قطعاً فرق نمودار نہیں
ہوا۔ سیاسی اغراض کی خاطر شریعت کی حدیں توڑنے کی ابتدا معاویہ سے ہوئی لیکن شریعت سے بھی
محبت ہے اور شریعت کی حدوں کو توڑنے والے کی محبت و احترام میں بھی کمی نہیں یہ ہے لیسپ پوت
کے سائے میں تحقیق کا مال۔

مذہب جمہور کی پالیسی

جہاں مذہب جمہور چونکہ ابتداء سے برسر اقتدار طبقہ سے متعلق ہے لہذا حکمران جماعت کے زیر اثر
مذہب کی داغ بیل ایسی مہارت سے ڈالی گئی کہ آنے والی نسلیں نہ اسے ٹھکرا سکیں اور نہ قبول کر سکیں۔
بس لیسپ پوت کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے آبائی تقلید پر قائم رہیں۔ اگر ذرا بھر کسی نے تنقیدی قدم اٹھایا
تو فوراً اس پر شیعیت کا الزام لگا کر اسے تحقیقی میدان میں قدم رکھنے کی جرات سے محروم کر دیا گیا۔ بے چارے
مودودی صاحب نے رکھ رکھاؤ اور کافی لیسپ پوت کے باوجود جب کبھی تقلیدی نظریے سے نکلنے کی
بعض جگہ جرات کی تو اسے اکثریت اور جمہوریت کی لاج رکھنے کی دہائی دی گئی اور فوراً ملک بھر سے
اُسے شیعہ نواز اور حضرت علی کا وکیل قرار دیا گیا۔

مسند اقتدار کی طرف سے شروع ہی سے یہ حربہ استعمال کیا جانے لگا ہے چنانچہ پہلی تین حکومتوں
میں تو اس قدر شدت نہیں تھی لیکن معاویہ نے تو ہر جمعہ و عید کے خطبات میں اور دوسری عام تقاریر
میں مقررین و واعظین کے لئے لازم قرار دیا تھا کہ حضرت علی اور اولاد علی اور ان کے ماننے والوں پر
سب و شتم کی بوچھاڑ کی جائے اور ان کے متعلق ہر ممکن طریقہ سے لوگوں کو متنفر کرنے کی کوشش کی

میں لے لیا پھر حضرت عمرؓ نے اس کو بنی تغلب کا عامل مقرر کر دیا اور عثمانؓ نے اس کو کوفہ کا گورنر بنا دیا وہاں یہ راز فاش ہوا کہ یہ شراب نوشی کے عادی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک روز انہوں نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھائی اور پھر لیٹ کر لوگوں سے پوچھا "اور پڑھاؤں؟" صبح ۱۱ بجے مودودی صاحب فرماتے ہیں ہم لیب پوت سے کسی کی روز روشن کی طرح واضح ہونے والی غلطی کو نہیں چھپاتے۔ بھلا جس شخص کو قرآن مجید نے فاسق کہا ہے کیا وہ روز روشن کی طرح واضح طور پر فاسق نہیں جب قرآن نے اس پر اعتماد کرنے سے روکا ہے اور رسول اللہؐ نے عملاً اس کے اعتماد سے دست کشی کی ہے۔ تو اس شخص پر اعتماد کرنا کہاں تک روا تھا؟ لیکن چونکہ حکمرانوں کا عمل صریح طور پر قرآن و رسول کے خلاف تھا اس لئے لیب پوت کے ذریعے سے مودودی صاحب نے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ دیتے تو نیک اور قابل اعتماد تھا عامل اور گورنر بننے کی صلاحیت رکھتا تھا البتہ کوفہ کی گورنری کے دوران میں اس کے متعلق شراب نوشی کے عادی ہونے کا راز منکشف ہوا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی بے شک محبوث بولتا ہو شراب کا عادی ہو۔ لیکن ہم عدول کے مفروضہ کے ماتحت اس کو راست باز بھی ماننا ہے بزرگ بھی کہنا ہے اور اس کے احترام میں باوجود کذاب و شرابی ہونے کے کہی کرنا بھی مہموری آباء عقیدے کے منافی ہے۔ آئیے مسعودی سے حضرت طلحہ وزیر کی راست بازی سنئے (مسعودی بقول مودودی شیعہ نہیں بلکہ سنی معتزلہ سے منسلک) البصرہ کی طرف جنگ قبل کا فتنہ برپا کرنے کے لئے جب جا رہے تھے تو راستہ میں ایک مقام سے گزریے اور وہاں کے کتے ان کی طرف بھونکے (حضرت عائشہؓ نے رسول اللہؐ سے سنا تھا کہ میری بیویوں میں سے ایک علی کے ساتھ جنگ کرے گی حالانکہ وہ ناحق ہوگی اور علی حق پر ہوں گے اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کو مقام ہواب کے کتے بھونکیں گے) حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا کہ اس مقام کا نام کیا ہے تو بتایا گیا کہ یہ ہواب ہے۔ تو عائشہؓ نے آگے جانے سے انکار کر دیا چونکہ طلحہ وزیر کے لئے اپنے سوچے سمجھے منصوبے میں کامیابی حضرت عائشہؓ کے بغیر ناممکن تھی پس انہوں نے اپنی والدہ سے کہلوایا کہ یہ جواب نہیں ہے پس وہاں کے کچھ اس معززہ نے قسم کھائی کہ اگر اس کو جواب نہ ملے گا تو عائشہؓ کے پاس جاؤں گے۔ یہاں تک کہ اس نے جواب دیا کہ اس مقام کا نام ہواب ہے۔

اس قسم کی قصہ سنا کر حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب ہیں جو لیب پوت کے جواز کی تردید ہی ہوتی ہیں۔

یہ سب سچے سچے ہیں ۱۰

۱۲۱ صحابی کا لفظ جو ہم نے میرے معاصران سما کی طرح ہیں جس کی اقتدار کے

ہدایت پاؤ گے۔

شرح عقائد نسفی میں علامہ نقازانی نے اسی ضمن میں کئی احادیث نقل کی ہیں۔ ص ۱۱۶ مطبع مجتہائی دہلی۔

(۳) لَا تَسْبُوا أَصْحَابِي - میرے صحابہ کو سب نہ کرو کیونکہ تم میں سے کوئی شخص کوہِ احد کے برابر سونا راہِ خدا میں خرچ کر دے تو ایک صحابی کا مرتبہ نہیں پاسکتا۔

(۴) اَكْرِمُوا أَصْحَابِي فَإِنَّهُمْ خَيْرُكُمْ - میرے تمام صحابہ کا اکرام کرو کہ یہ تم سے بہتر ہیں۔

(۵) لَا تَحْذَرُوا غَرْصًا - لا۔ ان کو تنقید کا نشانہ نہ بناؤ میرے بعد کیونکہ جس نے ان سے محبت کی وہ میری محبت سے ہے اور جس نے ان سے عداوت کی وہ میری عداوت سے ہے جس نے ان کو تکلیف دی اُس نے مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف پہنچائی اُس نے اللہ کو اذیت دی اور خدا اس کی گرفت کرے گا۔

اور ان عمومی روایات کے علاوہ حکمرانوں کے حق میں تو اس قدر فضائل و مناقب کی بھرمار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور کو سوائے ان لوگوں کی تعریف و خوشامد کے اور کوئی کام ہی نہ تھا ذرا انہی پیش کردہ حدیثوں کو ملاحظہ فرمائیے۔ یہ سب لپ پوت کی سند نہیں تو اور کیا ہے؟ اور ان کا مقصد یہ ہے کہ حضور کے صحابہ اچھا کریں یا بُرا وہ ہر قسم کی تنقید سے بالاتر ہیں اور ہر حال میں لائقِ احترام اور واجبِ اطاعت ہیں۔ کیا دنیا کا کوئی معقول آدمی منصف انسان یا کوئی مہذب معاشرہ کسی ملت کے ان بنیادی اصولوں کو دیکھ کر اُسے معقولیت کی سند دے سکتا ہے اور پھر صحابہ کے درمیان سجد و حساب منازعات و مشاجرات بلکہ بعض ہوشیار انسانیت سوز واقعات پر نظر ڈالنے سے تو ان مفروضہ حدیثوں کی بالکل قلعی کھل جاتی ہے۔ اور صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کھیل صرف برسرِ اقتدار طبقہ کی حکومت کو شرعی حیثیت دینے کے لئے کیا گیا ہے تاکہ مذہبِ جمہور کو بلا سند و قرار دیا جاسکے۔ پس اسی قسم کی احادیث کو نشر کرنے والے لوگ حکمِ ان طبقہ کے محبوب بنتے رہے۔ اور وہ عطیات و جوائز اور انعام و اکرام کے مستحق قرار پاتے رہے۔ اور ان کے خلاف جس نے زبان کھولی یا تنقید کا پہلو جس نے اختیار کیا اُسے اسلام دشمنی کی سند دی گئی اور ہر قسم کے عذاب میں اس کو مبتلا کیا گیا۔ جانیں نالغ کی گئیں۔ قید و بند کی صعوبتوں میں انہیں رکھا گیا۔ گھر لوٹے گئے اور ان کے بچوں اور عورتوں تک کو معاف نہ کیا گیا اور شیعیان علی پر اس ظلم کی باقاعدہ ابتداء معاویہ کے دور سے ہوئی۔ اور کافی عرصہ تک یہ صورتِ حال باقی رہی جس کا مختصر سا اشارہ خلافت و

ملوکیت میں ہوا ہے۔ حصہ ۱۶ اور معاویہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کا مرتکب تھا لیکن یہودی مذہب میں لیب پوت کر کے اس کے احترام اور بزرگی کو برقرار رکھنا ضروری سمجھا گیا اور جو بھی اس کے خلاف زبان کھولے وہ اسلام کا دشمن اور گردن زدنی قرار دیا گیا۔ حدیث سازی کی مہم اور حضرت معاویہ کا طرز عمل ہماری کتاب اسلامی سیاست میں ملاحظہ ہو۔

تیسرا اور چوتھا طریقہ چنانچہ معاویہ صاحب خود اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

ایک اور نہایت مکروہ بدعت جو حضرت معاویہ کے عہد میں شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب دشمن کی ہوجھاڑ کرتے تھے جیسا کہ مسجد نبوی میں منبر رسول پر صحنہ نبوی کے سامنے حضور کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علی کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے گالیاں سنتے تھے۔

عمر بن عبد العزیز جب تخت حکومت پر مسکن ہوا تو اس نے جہاں اور کافی اصلاحات نافذ کیں وہاں سنت میں تغیر بنایا بدعت بھی ختم کرائی اور تذکرۃ الخوارج میں علامہ سبط بن الجوزی نے خلافت علی کے باب میں ذکر کیا ہے کہ ایک ہزار بیسے تک منبر پر حضرت علی پر لعنت کی گئی اور یہ معاویہ کے حکم سے ہی تھا۔ اور معاویہ کی اسلام دشمنی تو اس قدر واضح تھی کہ سنت رسول اللہ کا قطعاً اس کے دل میں کوئی تقار نہ تھا۔ چنانچہ جنگ صفین کی طرف روانہ ہوتے ہوئے اس نے نماز عید پیشگی بند کر دی پٹھا ڈالی اور کسی نے اعتراض کرنے کی جرأت نہ کی اور جنگ صفین سے واپسی پر حضرت علی کی رعایا میں سے ایک شخص اونٹ پر سوار دشمنی باپنچا تو کسی شامی نے اسے پکڑ لیا اور کہا یہ میری اونٹنی ہے جو تو نے جنگ صفین کے دوران حاصل کی تھی۔ آخر معاویہ کے پیش ہوا تو شامی نے پیاس گواہ پیش کر دی جنہوں نے شہادت دی کہ یہ اونٹنی اسی شامی کی ہے پس اس کے حق میں فیصلہ ہو گیا اور اونٹ کے مالک کو خارج کیا گیا۔ اس نے لاکھ گھایا کہ جناب عالی کہ از کم آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ آیا یہ اونٹ ہے یا اونٹنی؟ تو معاویہ نے کہا کہ ہاں جو فیصلہ ہونا تھا ہوا گیا۔ اس کے بعد اس شخص کو بیت المال سے اونٹ کی قیمت خریدا لی اور حضرت علی کی طرف پیغام دیا کہ میرے پاس ایک لاکھ ایسے لاکھ ہاتھ بادل تو مجھے لڑائی کے لئے تیار ہیں جو میری خاطر ہی اور محبت میں اونٹ اور اونٹنی میں بھی فرق کرنے کو آمادہ نہیں ہوتے (لہذا یہ خلافت کے معاملہ میں حق و باطل کو کیا کہیں گے) مروجہ مذہب چاہے۔

پس معاویہ نے اپنے سیاسی وقار اور اقتدار کا پورا کرنا کمالی اور جمہوری اسلامی حکمرانوں کی
 شرعی حیثیت کو مزید مضبوط کرنے کے لئے حضرت علیؓ کی اولاد انجاد اور ان کے اتباع پر لعنت
 اور سب و شتم کا سلسلہ شروع کیا اور اس طرح قانونی طور پر شیعیان علی حکومت وقت کے مستقل
 طور پر معتوب بن گئے۔ مشہور روایت کی بنا پر ستر سال تک یعنی پورے ساٹھ سال اور دوسرے
 روایت کے مطابق ایک ہزار مہینہ یعنی ۸۳ سال چار ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا اور یہ مگر ہی یا المیسر
 تھی کہ اس وقت تک یہ بدعت جاری رہے کہ بڑے سے مرہائیں اور بچے اسی فضا میں مل کر بڑے اور
 بڑے جو بائیں پس لگے ساٹھ سال والی روایت ہی صحیح مانی جاسے تو اس سال بچے اس سلسلہ کے سب
 بولنے کے وقت ستر سال بڑے ہوں گے پس اس فضا و ماحول میں ملی پڑی ہوئی شرق سے غرب
 تک تمام امت اسلامیہ کے لئے علی پر سب و لعن کا باعث ہوا۔ اہل بیت علیہ السلام کی طرف
 سے سرکاری امتناعی حکم کے نافذ ہونے پر تمام لوگ بحیرت اور دریائے قنوج میں ایک بار غرق
 ہو گئے ہیں کہ اس قادیانہ ہی سنت کو کیوں مٹا دیا گیا۔

اب اگر اس گھنڈے کے فعل کا پس پیش تلاش کیا جائے اور اس کے بیان پندوں کو زیر بحث
 لیا جائے تو یہ بات کوئی جہنمی نہیں معلوم ہوتی کہ حسب مقررین خطباء واعلیٰین اور سلفین اپنی تقاریر
 میں اس کا اظہار کرتے ہوں گے تو میں تحریر کے دوران یا اس کے قبل و بعد یہ تذکرہ بھی پیش کرتا ہوں گا کہ
 آخر ایک غلامان کو سلسل سب و شتم کا انشاء کیوں بنایا جاتا ہے اور اس تصادمیت کے ساتھ
 کہ کوئی جہنمی ہے نہ عید اور کوئی غلام اس سے خالی ہے نہ خلل۔ آخر وہ کون تھے اور کس پادشہ
 میں یہ سزا ان کو دی جا رہی ہے؟

پس اس فعل کے جملہ فکر باجم ثابت کرنے کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد
 انجاد کے نقائص و عیوب بیان کریں اور سلسل خدا ان میں شرعی و دینی توہینا کوئی عیب تھا میر
 پس لہذا اس سلسلہ کے روایت ساز اور بتان تلاش و شمار ہی لوگ غلط سلسلہ باتیں بنا کر اس سلسلہ
 کا مواد اکٹھا کرتے ہوں گے جس پر انہوں نے اپنے اس بدترین طرح کی خیال و استوار کی ہوئی تھی۔
 اور جہاں حضرت علیؓ اور ان کے غلامان کے لئے اس قسم کا جھڑا مواد پیش کیا جاتا ہو گا اس
 کا یہ پس منظر بھی لازمی ہے کہ یہ اقتدار اور جمہوری اسلامی خلافت کے تابع اور ان کی خدمت
 پارٹی کے حق میں فضائل و منام کی حدیں بھی کڑی بنائی ہوں گی پس اس سیاست کے ماتحت
 شیعیان علی کو جس بھی طرح گرفتار و سب کیا جاتا ہے گا اور جس طرح قانونی شکنجوں میں پکڑ کر

پر مقدمات چلائے جاتے ہوں گے اس کا نمونہ خلافت و ملوکیت ص ۱۶۴ پر آپ دیکھ چکے ہیں اور حجاج بن یوسف سفاک کی تو پوری تاریخ شیعہ ناحق خون سے رنگین ہے۔

حضرت علی علیہ السلام پر مسلسل سب و شتم کے نتیجے میں جو تاثر پیدا ہوا اور ہونا بھی چاہیے تھا وہ یہ تھا ایک دفعہ اہل شام کے زعماء و شرفاء و دانشور طبقہ کے ایک دانا سے کسی نے یہ سوال کر ڈالا کہ وہ ابو تراب کون ہے؟ جس کو امام مسجد مسلسل منبر پر گالیاں دیتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ زمانہ فتنہ کے چوروں میں سے ایک چور تھا اسی طرح مروج الذہب مسعودی ج ۳ پر یہ بھی ہے کہ عباسی تحریک کے سلسلہ میں عبداللہ بن علی وارد شام ہوا۔ تو اس نے ابو العباس سفاک کی طرف شام کے بعض اکابر تحقیق کے لئے بھیجے جو اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے سفاک کے سامنے قسمیہ بیان دے کر کہا کہ ہمیں تمہارے اقتدار سنبھالنے تک کوئی علم نہ تھا کہ بنی امیہ کے علاوہ رسول اللہ کا کوئی اور رشتہ دار یا وارث بھی ہے۔

اندازہ کیجئے جب خراسان سے لے کر الجزائر تک شرقاً و غرباً اور عین سے لے کر اندلس تک شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی امت اسلامیہ میں ہر مجلس و وعظ اور ہر تقریر و خطبہ میں ایک خاندان اور اس کے اطاعت گزاروں یا عقیدت مندوں پر بے تحاشا سب و شتم ہوا اور ان کو ہر قسم کی بدگوئیوں سے یاد کیا جاتا ہو ان پر ہر قسم کا گند کیچڑ اچھالا جاتا ہو۔ ان کو ہر ممکن طریق سے ذلیل و خوار کر کے گرفتار مصیبت کیا جاتا ہو اور یہ سلسلہ پورے ساٹھ سال تک بلا وقفہ قائم رہے اور کرنے والے والی حکومت وقت ہوجن کی زبان سے نکلا ہوا ہر فقرہ قانون اسلامی کا لباس پہننا جارا ہوا اور ماحول اتنا بگڑ چکا ہو کہ حضرت علی کے متعلق سیانے اور سلجھے ہوئے لوگوں کا تاثر یہ ہو کہ وہ ایک چور تھے تو شیعیان علی کے متعلق جو تاثر ہو گا وہ ظاہر ہے۔ نتیجہ ہے کہ کسی کو شیعہ کہہ دینا اس کو ماں و بہن کی گالی سے بھی سخت برا لگتا ہے اور جب یہ طوفانی و ظمانی دور ختم ہوا تو یہ نہیں کہ حضرت علی اور اس کے ماننے والے لوگوں کی کسی وقت حکومت وقت کی طرف سے محبت افزائی کی گئی ہو بلکہ شیعیان علی بنی امیہ کے زندانوں سے آزاد ہوئے تو بنی عباس کے شکنجوں میں نہیں گئے اور اس کے نتیجہ میں ائمہ شیعہ اپنے گھروں کے گوشوں میں خاموش اور کس مہر سی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔

اب اگر دل میں کچھ انصاف ہو تو اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ایسے طوفانی اور سے شیعیت کا بچ بچانا اور روز افزوں ترقی کی طرف گامزن ہونا واجب کہ اقتدار نے ہر دور میں ان کو کچلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوا ان کی حق پرستی اور راست بازی کا کھلا ہوا نشان ہے۔

اور جس زمانہ میں حضرت علی اور شیعان علی کو منہ وں پر اعلانیہ سب و شتم کا نشانہ بنایا جاتا تھا اور انہیں ہر قسم کے مظالم کا تختہ مشق قرار دیا جاتا تھا اسی زمانہ میں روایت حدیث و تفسیر پیدا ہوئے پھولے و پھیلے۔ اگرچہ باقاعدہ تدوین کا سلسلہ بعد میں ہوا۔ لیکن راویان حدیث مستتران قرآن اور موخین اسلام کی زیادہ تر نشو و نما اسی ہی دور میں ہوئی اور بعد والے انہی لوگوں کے شاگرد و خوشترچین تھے۔ پس عقل و غم کا تقاضا یہ ہے اور فطرت انسانیہ کا ردِ عمل بھی ایسا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے سرکاری امتناعی حکم کے بعد حضرت علی پر سب و شتم کا سلسلہ تو بند ہوا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی اور شیعان علی کے متعلق محامد و مناقب راویان حدیث نے کہاں سے لئے جب کہ بچپن سے بڑھاپے تک ان کے کان سب و شتم ہی سنتے رہے؟

سچی بات یہ ہے حضرت علی علیہ السلام کے فضائل و مناقب اور محامد و محاسن روز روشن کی طرح اس قدر واضح تھے کہ اگرچہ ہر دور کا حکمران طبقہ انہیں پردہ خفایں رکھنے کے لئے بے تاب رہا۔ لیکن حضرت علی آسمان فضیلت پر مثل آفتاب بلند رہے حتیٰ کہ حسد و کدورت کی آگ میں جل بھن کر معاویہ نے آرڈی منس کے ذریعے سرکاری حکم جاری کیا کہ اس آفتابِ خِضبت چھو کا جاتا رہے اور کم از کم ساٹھ سال تک انہوں نے ایسا کیا بھی لیکن ان کا اپنا منہ گندا و کالا رہا اور روز افزوں حق کا بول بالا رہا۔ اور اسی دور پر فتن سے گذر کر جب زبانوں سے قفل کھلے تو حضرت علی کے فضائل اس قدر منظرِ عالم پر آگئے کہ تعصب آمیز قلمیں بھی انہیں اپنے منہ پر لانے کے لئے مجبور ہو گئیں حتیٰ کہ جمہوری اسلامی حکمرانوں کے حق میں (باوجود انعامات و اکرامات کے سائے میں لکھے جانے کے) کتب احادیث کے اوراق میں اس قدر فضائل نہیں ملتے جس قدر (نشر و اشاعت پر کڑی پابندیوں اور حکومت و وقت کی سخت گیرلوں کے باوجود) حضرت علی کے مناقب و محامد انہی کے راویوں کی زبانی انہی کی کتب احادیث میں موجود ہیں۔ اور یقین جانیے کہ حکمران جماعت کے حق میں ان ہی کی کتابوں میں جس قدر فضائل موجود ہیں۔ ان سب کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا جاسکتا ہے کیونکہ داد و دہش اور انعام و اکرام اور جائزہ و عطیہ کے طمع میں خوشامدانہ طریقہ سے ان کا بناوٹی اور موضوع ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے لیکن حضرت علی کے فضائل و مناقب پر شک و شبہ کا یہ غبار نہیں ڈالا جاسکتا۔ اور یہ حضرت علی اور ان کے شیعان کے حق بجانب ہونے کی اٹل اور ناقابلِ تردید دلیل ہے اور حق کا یہ واضح معجزہ ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نمود کی پیش بندلوں کے باوجود آکے رہے اور حضرت موسیٰؑ فرعون کی چالوں کو فیل کرتے ہوئے پیدا ہو کر رہے اور سلطنت پر چھا کے رہے۔ اسی طرح حضرت علی و شیعان

علی کے فضائل تمام اموی سرکاری و غیر سرکاری سازشوں چالوں اور سیاستوں کو فیل کر کے رہے۔ اشمس حقیقت بن کر ظلم و استبداد کے افق سے ابھر کے رہے۔ پس پرچمِ حق اٹھ کے رہے اور اسے فضا ناساز گامیل اور یقین بنائے کہ جمہور اہل اسلام کا مذہبی ڈھانچہ اگر اس زمانہ میں تیار کیا جاتا جب کہ حضرت علی اور ان کے خاندان و اتباع کو سب و شتم اور ظلم و جور کا نشانہ بنایا جاتا تھا تو اسلامی عقیدہ میں حضرت علی کی چوتھی خلافت تو درکنار ان کا صحابہ میں بھی شمار نہ ہوتا۔ اب توشیعوں کو چوتھے کی بجائے خلیفہ بلا فصل ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت شیعوں کیلئے خلیفہ کے بجائے علی کا صحابی رسول بھی ثابت کرنا مشہور ہو جاتا۔ اسی طرح حسنین کا اولادِ پیغمبر ثابت کرنا بھی غیر معمولی مسئلہ بن جاتا کیونکہ جمہور اسلام کا مسلک اس نظریہ وہی ہوتا جو ابتداء دولت بنی عباس میں اہل شام کا تھا اور آج تک خطبوں میں سنت امویہ کو وہ جانا بہید نہ تھا۔

اب یہ نظریہ قائم کرنا بالکل غلط اور خلاف واقع ہے کہ شیعہ مذہب کی ابتداء اموی و عباسی گروپوں کی سیاسی رسد کشتی کے زمانہ سے ہونی بلکہ مودودی صاحب نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ حضرت علی کی جماعت کو ابتداء سے شیعان علی کہا جاتا تھا جو بعد میں صرف شیعہ کہلانے لگے۔ حالانکہ پہلی تینوں حکومتوں کے زمانہ میں ان کی زبانوں پر مہر خاموشی رہی کیونکہ اس زمانہ میں ان کا اختلاف منظر عام پر آکر نہ تو انقلاب اور ہو سکتا تھا اور نہ کوئی دوسرا مفید نتیجہ پیدا کر سکتا تھا بلکہ الٹا حالات حادہ کے ماتحت نقصان ہی نقصان کا پیش خمیہ ہوتا۔ حضرت علی علیہ السلام کے نظریہ ہی اقتدار کے زمانہ میں خاموشی ٹٹنی اور ان کے حلقہ میں کافی وسعت پیدا ہونی خصوصاً جنگِ قبل و عقبین و نہ دان میں لوگوں کو جو سوچنے پر مجبور کئے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون؟ پس دھڑا دھڑا حضرت علی کی عقیدہ مندوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور پیغمبر و طبقہ نے جان لیا کہ رسول اللہ کے بعد بلا فصل امام آپ ہی ہیں پھر اموی ظلم و ستم کے بددلوں میں امامت ختم اور ملتِ شیعہ کا مورخ کافی عرصہ تک روپوش رہا کیوں کہ اسی دور میں جہاں خلیفہ جمہور کے خوشامیوں کے لئے خزانوں کے منہ کھلتے تھے وہاں شیعان علی کے لئے زندانوں کے منہ کھلتے تھے۔ پس اموی و عباسی سیاست کی کش مکش کے دوران میں شیعوں سے استبدادی گرفت جو نہی ٹھیلی ہوئی اپنے عقائد و عقائد کا اعلان کرتے ہوئے میدان میں آ گئے۔

مذہبی اختلاف کی ابتداء

مذہبی اختلاف کی ابتداء وفاتِ پیغمبر سے ہی ہوئی اور مذہبِ دوہن گئے

ایک جہاں میں اسلام پہنچا۔ آئندہ حکومت کو مذہب کا سربراہ نہ ہوگا اور یہاں مذہب کی طرف توجہ
کیا جس میں ملت آزاد ہوگا۔ بعض چیزیں جو پہلے کے زمانہ میں حلال تھیں ان کو مخصوص مصالح کی بنا پر
حکومتوں کے مقررہ قرار سے روکا جائیگا۔ آئندہ ایسی صورتیں آئیں گی کہ جو عورتیں اسلام کی رو سے
کے زمانہ میں حلال تھیں وہ حکمرانوں نے مذہب میں شامل کر لیں۔ اس طرح مذہب کی عورت عورت کے
داخلی کپڑے کی طرح میں ان کے لئے حلیہ عورتوں کو بھی حلال کر دے گا۔ عورتوں کے لئے عورتوں کی
حسرت عورتوں کے لئے اس طرح نہیں کہ عورتوں کو مذہب کی رو سے عورتوں کے لئے عورتوں کی
حلیہ کی بدولت عورتوں کی عورتوں میں رکھیں۔ اس کو اگر کسی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی
دوسرا اس کے مقابل عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی
اور عورتوں کے عورتوں کے لئے عورتوں کے لئے عورتوں کے لئے عورتوں کے لئے عورتوں کے لئے
کے عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی
لہذا کہ عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی
کے عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی
پہنکات۔ البتہ شیعوں میں سے زید اور جعفر اہل اسلام ہیں۔ یہ عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی
مذہب میں۔

پھر اس عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی
کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی
کے عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی
بجائے عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی
یہی لہذا البتہ شیعوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی

جمہور اہل اسلام

یہی اختلاف کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی
یہی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی
یہی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی
یہی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی
یہی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی عورتوں کی

مسلمانوں کی مشکل ۸-۱۰ فیصد آبادی اس تفرقہ سے متاثر ہوئی تھی باقی سب لوگ مسلکِ جمہوری پر قائم تھے۔ مگر دورِ اختلاف کے شروع ہونے کے بعد سے امام ابوحنیفہ کے وقت تک کسی نے ان اختلافی مسائل میں جمہور اہل اسلام کے مسلک کی باقاعدہ توضیح نہیں کی تھی جو ایک پورے نظامِ فکر کی شکل میں مرتب ہوتی بلکہ مختلف فقہاء محدثین مختلف مواقع پر اپنے اقوال، فتاویٰ، روایات یا طرزِ عمل سے منسلک طور پر اس کے کسے کس کو واضح کرتے رہتے تھے۔

شیعہ مسلک کی جمہور سے علیحدگی

اس کے بالکل برعکس شیعہ مسلک اصولی و نظریاتی طور پر جمہور اہل اسلام سے روزِ اول سے منفرد و ممتاز رہا ہے جس کو مودودی صاحب نے صاف بیان کیا ہے۔

(۱) امامت (جو خلافت کے بجائے اُن (شیعانِ علی) کی مخصوص اصطلاح ہے) مصالح عامہ میں سے نہیں ہے کہ اُمت پر اس کا انتخاب چھوڑ دیا جائے اور امت کے بنانے سے کوئی شخص امام بن جائے بلکہ وہ دین کا ایک رکن اور اسلام کا بنیادی پتھر ہے اور نبی کے فرائض میں سے یہ ہے کہ امام کا انتخاب اُمت پر چھوڑنے کے بجائے خود بحکمِ صریح اس کو مقرر کر دے۔

(۲) امام کو معصوم ہونا چاہیے یعنی وہ تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے پاک اور محفوظ ہو۔ اس سے غلطی کا صدور جائز نہ ہو اور ہر قول و فعل جو اس سے صادر ہو برحق ہو۔

(۳) حضرت علی وہ شخص ہیں جن کو رسول اللہ نے اپنے بعد امام نامزد کیا تھا اور وہ بر بنائے نص امام تھے۔

(۴) ہر امام کے بعد نیا امام اپنے سے پہلے امام کی نص پر مقرر ہوگا کیونکہ اس منصب کا تقرر اُمت کے سپرد ہی نہیں کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے منتخب کرنے سے کوئی شخص امام ہو سکے۔

۱۵، شیعوں کے تمام گروہوں کے درمیان اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ امامت صرف اولادِ علی کا حق ہے (خلافت و ملکیت ص ۲۱۱ و ص ۲۱۲)

مذہبِ شیعہ کے اس عقیدہ کی بنیاد عقیدہ نبوت کے تابع ہے کیونکہ عہدِ امامت عہدِ نبوت کی نیابت کی حیثیت رکھتا ہے۔ پس جس طرح نبی کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی طرف سے نامزد ہو اور ہر صفت کمال میں پورے اہل زمانہ سے اشراف و افضل ہو اور اپنے تمام افعال و اقوال یعنی کردار و گفتار میں از ازل تا آخر معصوم ہو یعنی گناہانِ صغیرہ و کبیرہ سے پاک اور محفوظ ہو ورنہ اس کی

ہدایت موثر نہ ہوگی اور اللہ پر ترجیح بلا مرجح یا ترجیح مرجح کی قباحت لازم آئے گی جو محال ہے۔ پس جس طرح نائب منیب کی فرع ہوتا ہے اسی طرح عقیدہ امامت عقیدہ نبوت کی فرع ہے لہذا امام وہی ہو سکتا ہے جو نبی کے بعد دینی و مذہبی، نفسی و معاشرتی اور تمدنی و سیاسی زندگی کے ہر شعبہ میں نبی کی طرح قیادت مطلقہ کی پوری صلاحیت رکھتا ہو۔ صفات کمال ذاتیہ و نفسیہ میں اپنے پورے اہل زمان سے افضل و اشرف ہو اور صفت عصمت سے متصف ہو یعنی کسی چھوٹے یا بڑے گناہ کا ارتکاب نہ کرتا ہو۔ اس کی پوری زندگی میں اس کا کوئی قول یا فعل شرعی لحاظ سے قابل گرفت نہ ہو۔ اور یہ صفات و کمالات اور محامد و محاسن کسی انسان میں دوسرے انسان کو کما حقہ معلوم نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کو اللہ ہی نامزد کرے اور اللہ جس کو نامزد کرے گا وہ یقیناً ان صفات کا حامل ہوگا کیونکہ اللہ پر بعید ہے کہ مفضل کو فاضل پر جاہل کو عالم پر ناقص کو کامل پر غلط کو صحیح پر اور باطل کو حق پر ترجیح دے۔ پس اللہ کے حکم سے رسول پر واجب ہے کہ اپنے بعد کے لئے اپنے وصی و جانشین اور صحیح نائب و خلیفہ کا اعلان کرے جو ان کے بعد لوگوں کا امام حق ہو۔

لوگوں کے چننے سے قطعاً صحیح انتخاب نہیں ہو سکتا کیونکہ ضروری نہیں کہ جس میں صفات فاضلہ موجود ہوں لوگ اُسی کو ہی منتخب کریں اور یہ بھی بعید از قیاس ہے کہ لوگ جس کو چن لیں وہ صفات فاضلہ کا جامع بن جائے چنانچہ سقیفائی انتخابی ادارے کے ایک اہم رکن بلکہ الیکشن کمشنر حضرت ابو عبیدہ جراح نے اس امر کا واضح کاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے اور حضرت علی سے پُر زور لب و لہجہ میں اپنا نام واپس لینے کی درخواست کی ہے جس میں اُس نے اہم پہلو یہی ذکر کیا کہ یہ لوگ تیری قوم کے بزرگ سن رسیدہ اور جہاں دیدہ تجربہ کار ہیں اب ان کو رہنے دیجئے اگر زندگی نے ساتھ دیا اور موت نے مہلت دی تو صفات فاضلہ اور کمالات ذاتیہ کے لحاظ سے آپ کے مستحق خلافت ہونے میں کوئی کلام نہیں پس آپ کی باری بھی آجائے گی۔ کتاب الامامۃ والسیاستہ سے ابن قتیبہ دنیوری کی الیکشن خلافت کے متعلق کارگزاری کی مفصل رواد سے حسب ضرورت جملے ہم نے ابتداءً نقل کر دئے ہیں جو حقیقت حال کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انتخاب ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت تھا اور اچانک تھا اس میں نہ صفات فاضلہ کا لحاظ تھا اور نہ مستحق و غیر مستحق کا اعتبار تھا۔ تمام اہل مدینہ تو درکنار تمام اہل حل و عقد کو بلکہ عشرہ مبشرہ کے پورے گروپ کو شامل کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا تھا اور تاریخ دانوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ جس طرح دھاندلی اور دھینگا مشتی کا مظاہرہ مسلمانوں میں اس پہلے جمہوری خلیفہ کے وقت ہوا۔ اتنا کبھی نہیں ہوا۔ اور جب اقتدار پر قبضہ ہو گیا تو

اُسے فاضل بھی کہنا شروع کر دیا گیا اور حقدار بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی اور اٹکار کرنے والوں کو طاقت سے ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس طرح سے اسلامی حکومت نے جناب رسول اللہ کی وفات کے فوراً بعد سے جمہوریت کے دھوکے سے ملوکیت کا روپ دھار لیا اور یہ صورت حال دن بدن بگڑتی چلی گئی حتیٰ کہ زمانہ پیغمبر سے جوں جوں دور ہوتی گئی ملوکیت کے چہرہ پر جو اسلامی کردار کا سنگار تھا وہ بھی اترنا چلا گیا اور آخر کار سرکاری پارٹی کو مجبوراً کہنا پڑا کہ یہ بادشاہت اور ملوکیت ہے خلافت نہیں۔

لیکن شیعہ مسلک میں پہلے دن سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح چلی آرہی ہے کہ خلافت حقہ جس کا دوسرا نام امامت ہے منصب نبوت کی طرح یہ عہدہ بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے عطا کرے۔ پس جناب رسالت مآب نے بحکم پروردگار حجۃ الوداع سے واپسی پر آیہ بقیع کا نزول کے بعد حاجیوں کے ایک لاکھ بیس ہزار کے مجمع میں خم غدیر کے مقام پر پالانوں کے منبر پر سوار ہو کر بباغ دہل حضرت علی کا بازو پکڑ کر اعلان فرمایا۔ مَنْ كُنْتُ مَوْلاَ فَعَلَيْ مَوْلاَ (جس کا میں سردار ہوں اس کا علی سردار ہے) اور اس کے بعد آیت الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ (آج میں تمہارا دین مکمل کر رہا ہوں) اور اس آیت کو معنوی طور پر تواتر کا درجہ حاصل ہے تفسیر درمثور علامہ جلال الدین سیوطی، تفسیر ثعلبی، اسنی المطالب، مناقب مغازی، شواہد التنزیل، مناقب خوارزمی، فرائد السمیعین، خصائص طنیزی، حلیۃ الاولیاء، تفسیر کبیر رازی اور تذکرۃ الخواص وغیرہ میں موجود ہے۔ نیز تفسیر فتح البیان، تفسیر فتح القدر اور تفسیر ابن کثیر کے حوالہ سے بھی یہ حدیث نقل کی گئی ہے اور اسی ضمن میں حسان بن ثابت صحابی کا قصیدہ غدیر یہ عام کتب میں منقول و مسطور ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے

يُنَادِيهِمْ يَوْمَ الْغَدِيرِ نَبِيُّهُمْ
بِحُجَّةٍ اَسْمِعْ بِالرُّسُولِ مُنَادِيًا

اور غزالی نے سیر العالمین میں حدیث غدیر پر علمائے جمہور کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے (علی مائل)۔
جبراہول تعصب کا اور اموی ذہنیت کا کہ جس کتاب میں حضرت علی کی کسی فضیلت کا تذکرہ ہو اس کو شیعہ کی کتاب کہنا مجبوراً بل اسلام کا وتیہ بن چکا ہے چنانچہ مودودی صاحب خود اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ ابن جریر طبری کو حدیث غدیر نقل کرنے کی بنا پر اہل سنت نے شیعہ کہہ دیا اور اموی دور کے علانیہ سب و شتم نے حضرت علی کے متعلق نفرت عام پھیلادی حتیٰ کہ اہل شام ان کو چوروں کو سمجھنے لگ گئے اور اسی سے تاثر لینے والے متعصب مزاج اہل سنت اپنی کتابوں میں حضرت علی کا ذکر یہی ترک کر بیٹھے اور جب کسی نے کوئی ایک آدھ فضیلت لکھ بھی ڈالی تو اتنے شیعہ

یا کم از کم شیعیت نواز کہہ دیا گیا۔ اموی سیاست کے ماتحت حضرت علی اور شیعیان علی پر غالی کا دعویٰ اور غلط الزامات کی علانیہ نشر و اشاعت نے عامۃ الناس کو اس قدر متاثر کیا کہ حضرت علی کے خاندان و مناقب کی کثرت و شہرت نے اگرچہ ان کا نام کسی حد تک قابل برداشت بنا دیا لیکن شیعوں کا نام اب تک ان کے لئے قابل برداشت بھی نہیں ہے۔ متعجب اہل سنت اس کتاب کو دیکھنا ہی گوارا نہیں کرتے جو کسی شیعہ نواز سنی کی لکھی ہوئی ہو شیعہ تو درکنار۔

اور یہی وجہ ہے کہ مودودی صاحب نے بھی جہاں شیعہ مسلک اور اس کے خصوصیات بیان کئے کئے ہیں کسی شیعہ اصول و عقائد کی کتاب سے نہیں بلکہ عام تاریخی دستاویزات کو کافی سمجھ کر ان کا حوالہ دے دیا حالانکہ کسی محقق کے لئے زیبا نہیں کہ کسی قوم کا نظریہ و عقیدہ ایسی کتابوں سے نقل کرے جو خود ان کے لئے قابل قبول نہ ہوں۔ ایسا فعل اگر خیانت نہیں تو دیانت بھی کسی صورت میں نہیں ہے اور مذموم نہیں تو مدوح بھی اسے نہیں کہا جاسکتا۔

جب شیعہ مسلک کو نقل کرنے کے لئے شیعہ کتب کو دیکھنا گوارا نہیں تو اپنے مسلک کو ثابت کرنے اور اس کی صحت و صفائی اور لپ پوت کے لئے کسی شیعہ کتاب کو کیوں دیکھتے یا چنا پنچہ انہوں نے ماخذ کی بحث میں صاف اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ وہ زیادہ تر ان کتابوں سے مطلب لینے کی کوشش کرتے ہیں جن میں شیعیت یا شیعیت نوازی تو درکنار شیعیت اور شیعیت نوازی سے پورا پورا تعصب موجود ہو اور انہوں نے حافظ ابن کثیر پر اپنے زیادہ تر اعتماد کی وجہ بھی یہی بتلائی ہے کہ تشیع کی طرف میلان تو درکنار وہ اس کے سخت مخالف ہیں اور شیعہ روایات کی زور شور سے تردید کرتے ہیں اور صحابہ میں سے کسی ایک پر حتی الوسع کوئی آنچ نہیں آنے دیتے اور حضرت معاویہ ہی نہیں بلکہ یزید تک کی صفائی پیش کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھتے ۳۱ اور آخر میں لکھتے ہیں کہ:- میں یہ شبہ تک نہیں کر سکتا کہ وہ شیعہ روایات سے کچھ بھی متاثر ہو سکتے تھے یا ان کو اخذ کرنے میں کسی قسم کا تساہل برت سکتے تھے یہ محض مذہب جمہور کے متعلق آبائی تقلید کا نتیجہ ہے کہ لپ پوت کر کے یزید تک کی صفائی پیش کرنا اور حضرت علی کے فضائل کی روایات کو شیعہ روایات کہہ کر رو کرنا مذہبی سمجھا جاتا ہے۔

حقیقت لپ پوت کی عین نہیں ہوتی۔ لیکن بناوٹ لپ پوت ہی کا درجہ لازم
توئی و تہری ہوتا ہے۔ مذہب شیعہ میں یہ نظریہ اساس مذہب کی حیثیت رکھتا ہے کہ کھرب۔
کو کھرا کھو اور اس سے بہت کھو اور کھوٹے کو کھوٹا سمجھو اور اس سے نفرت کرو اور اسی بنا پر شیعہ مسلک

کی رو سے کسی بڑے سے بڑی شخصیت کی غلطی کو لپ پوت کر کے پھپھانا بائز ہے پس دو فرق کی تاریخ میں جن لوگوں نے حق کا ساتھ دیا اور شیعہ ہوئے شیعہ نظریہ کے ماتحت وہ واجب الاحترام بزرگ تھے اور ان سے محبت واجب ہے لیکن جن جن لوگوں نے حق کا ساتھ چھوڑ دیا اور حق کے مقابلے میں آگے شیعہ نظریہ کی رو سے وہ باغی تھے ظالم تھے اور باطل پر تھے خواہ وہ اس سے پہلے کتنی بڑی شخصیت کے مالک ہی کیوں نہ ہوں ان کا احترام اور بزرگی اس وقت تک مسلم تھی جب تک وہ حق کے ساتھی تھے جب انہوں نے حق سے انحراف کر لیا نہ ان کی بزرگی رہی نہ وہ قابل احترام رہے پس وہ قابل نفرت و مذمت ہیں نہ کہ قابل تعریف و مدح۔ البتہ جس کے متعلق غلطی کرنے کے بعد توبہ ثابت ہو جائے تو شیعہ کے نزدیک اس کے احترام میں کمی نہیں ہوتی۔ اور شیعہ مذہب میں تولی اور تبری کا یہ مفہوم ہے کہ نیک سے محبت کرو اور بُرے سے بیزاری کرو۔ شیعہ مسلک کلمہ عدول کا قائل نہیں بلکہ جو راست باز تھے اور ثابت قدم رہے یا پھسلنے کے بعد تائب ہو کر مرے وہ واجب الاحترام ہیں لیکن جو غلط کار تھے اور رہے اور توبہ کے بغیر مر گئے وہ قطعاً واجب الاحترام نہیں ہیں۔ اور شیعہ مذہب کا یہی عقیدہ جمہور اہل اسلام کے عقیدہ میں عقیدہ سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہا ہے اور اسی بنا پر شیعہ جمہوری اسلامی حکومتوں میں معتوب زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے تھے چنانچہ حجر بن عدی اور اس کے ساتھیوں کو اسی الزام میں گرفتار کر کے معاویہ نے قتل کر دیا۔ عمرو بن الحمق صحابی کو اسی عقیدہ کی پاداش میں معتوب قرار دے کر اس کی مردہ لاش سے سر کو الگ کیا گیا اور پھر تشہیر کرایا گیا اور میثم تمار کو اسی ہی عقیدہ کی سزا میں سولی پہ لٹکا یا گیا اور اموی دور میں شیعان علی پر مظالم کے جوہر گرائے گئے گذشتہ صفحات میں مودودی صاحب کی زبانی ان کا ممولی اشارہ گزر چکا ہے۔ اور مظالم امویہ کی رُوح فرساقفصیل تاریخ کے صفحات میں اب تک موجود ہے۔

شیعہ مذہب کی صداقت اور حقانیت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ جبر و استبداد اور قہر و غلبہ کے تشدد کی چکیوں میں پس پس کر رہی انہوں نے اپنے اصول کو نہ چھوڑا۔ اور شریعت رسول میں لپ پوت کر کے باطل پر حق کا خلاف دینا گوارا نہ کیا۔

مودودی صاحب نے ایک واضح اصول ذکر کیا ہے کہ غلطی کے صدور سے بزرگی میں فرق نہیں آتا۔ مثلاً۔ یعنی جس کو بزرگ مان لیا جائے وہ غلط کار ہونے کے باوجود بھی بزرگ رہتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں شیعہ نقطہ نظر یہ ہے کہ کسی بزرگ کی بزرگی اس حد تک مسلم ہے جب تک کہ وہ غلط کار نہ ہو ورنہ غلط کار کو شیعہ مسلمان غلط فہمی کہے گا خواہ اس نے بزرگی کا لبادہ ہی کیوں نہ اوڑھ رکھا ہو۔ البتہ بھول چوک یا اتفاقی غلطی تو بڑا استغفار سے محو ہو جائے وہ قابل گرفت نہیں ہے۔

جمہوریت اور جمہور اہل اسلام

اسلام کے فرقوں میں نظریاتی اختلافات ناقابل انکار ہیں جو مذہب کی حیثیت سے رونما ہوئے۔ اور جن کا اسلامی تعلیمات کے ساتھ جسم و جان اور روح و قالب کا تعلق ہے کیونکہ جہاں وہ فرعی اعمال پر اثر انداز ہیں وہاں عقائد و اصول میں بھی ان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اس جگہ ہم سابقہ ابجاست کی روشنی میں فرقہ وارانہ ان بنیادی خطوط کی نشان دہی کرتے ہیں جن پر مذہب کی بنیاد رکھی گئی۔ پہلے ہم جمہوریت کے خطوط کی تعیین کرتے ہیں جن پر جمہور اہل اسلام نے مذہب کے طور پر ان کو اساسی حیثیت دی۔

(۱) جو شخص جمہوریت کے نام سے الیکشن جیت لے وہ اقتدارِ اعلیٰ کا قانونی و آئینی طور پر مالک ہے۔
 ا۔ خواہ حضرت ابو بکر کی طرح زعامتِ انتخاب کا منصب نہ ملے بلکہ کسی امیدوار کو کھڑے ہونے کا موقعہ دیا جائے پس سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ایک اور دوسرے کا نام اچانک تجویز کر کے اس کی بیعت کر لے اور پھر دوسروں کو اس کی بیعت کرنے کی دعوت دے دے اور اس طریق کار کو اپنے لئے جائز قرار دے کر دوسروں کے لئے خلاف آئین قرار دے دے۔

ب۔ یا حضرت عمر کی طرح سربراہِ مملکت تمام ممالک کے اقتدار پر قبضہ کر لے کر اپنے جانشین کو نامزد کرے۔ اپنے بیعت کیلئے تمام امت کو اپنی موجودگی میں اور اقتدارِ اعلیٰ کے سائے میں دعوت دے دے۔

ج۔ یا حضرت عثمان کی طرح کہ سابق حکمران تمام رعایا کے اختیاراتِ انتخاب سلب کر کے ایک خاص کمیٹی کے حوالے کر دے (اگرچہ اس کمیٹی کے بعض ممبران کے متعلق اُسے حقیقت تک یہ خطرہ بھی ہو کہ اس میں خویش نوازمی اور کنبہ پروری کا جذبہ کارفرما ہے) اور باقی تمام امت پر ان ہی کے فیصلے کو تسلیم کرنا واجب قرار دے دے۔

اس سلسلے میں جمہور اہل اسلام اور سوادِ اعظم کا مذہبی نقطہ نظر یہ قرار پایا کہ طرق مذکورہ سے اقتدار پر قبضہ کرنے والا نائب رسول ہوگا اور اس کی اطاعت خدا و رسول کی اطاعت کی طرح فرض ہوگی اور اس کا انکار منافی اسلام ہوگا۔

(۲) جمہوریت میں معیارِ انتخاب کوئی نہیں ہوتا کیونکہ ہر فرد مملکت کو مساوی حقوق حاصل ہوتے ہیں پس الیکشن کے لئے کھڑے ہونے والے متعدد امیدواروں میں سے جو بھی جیت جائے۔ وہ یہ

دعویٰ کرتا ہے کہ اس مملکت کی سربراہی کے لئے میں ہی زیادہ مستحق ہوں اور مجھ میں ہی وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو کسی مملکت کے صدر میں ضروری ہیں اور اس کی پارٹی اڑی ہوئی چوٹی کا زور اسی بات پر صرف کرتی ہے کہ انتخاب بالکل بر محل ہوا ہے اور منتخب ہونے والا امیدوار ہی ملک و ملت کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اور کرسی اقتدار سنبھالنے والا انسان اگر ڈکٹیٹر مزاج ہو تو وہ اپنے خلاف کوئی آواز سنا گوارا ہی نہیں کرتا بلکہ مخالف گروپ کے اظہار خیالات پر پابندی عائد کر دیا کرتا ہے نیز بوقت انتخاب خواہ کتنی ہی دھاندلی کو بروئے کار لایا گیا ہو اپنی سیاست کی سادھ کو برقرار رکھتے ہوئے اور عوام میں اپنی مقبولیت کو بڑھاتے ہوئے یہ فقرے صرف عامۃ الناس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے اور اختلاف رائے رکھنے والوں کا دل جلانے کے لئے تقاریر میں بیان کئے جاتے ہیں کہ عوام نے میرے اوپر بہت بڑی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیا ہے جس کا میں اہل نہیں ہوں لیکن اب عوام کے جذبات کو ٹھکانا پسند نہ کرتے ہوئے میں طوعاً و کرہاً مسندِ اقتدار پر قدم رکھے ہوئے ہوں۔“

بعینہ اسی طرزِ عمل پر وفاتِ پیغمبر کے بعد جمہوری اسلامی حکمرانوں نے اقتدار پر قبضہ کیا اور پارٹی نے ان کے متعلق اس پروپیگنڈے کو خوب بھادی کہ وہ ہی سب اُمت سے لائق تھے اور وہی معیار انتخاب پر پوری طرح فائز تھے اور حضرت عمرؓ نے توصیف فرمادیا تھا کہ اگر ہم اس بے قاعدگی اور جلد بازی سے بغیر مشورے کے الیکشن کو کامیاب نہ کروا لیتے تو راتوں رات کوئی اور قدم اٹھایا جاتا اور اقتدار کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ میں آ جاتا جس کو نہ ہم قبول کر سکتے اور نہ رد کرنا ممکن ہوتا۔ خلافت و ملکیت ص ۸۴۔ پر اسی مطلب کی ایک عبارت صحیح کی آئی ہے پس جمہور اہل اسلام نے اسی کو اپنا دین بنالیا اور اختلاف رائے رکھنے والوں کو بڑبڑتی اپنا خیال بنانے کا لائحہ عمل مرتب کیا گیا جس پر حسبِ مواقع سختی سے عمل ہوتا رہا اور آج تک سوادِ اعظم کے پڑھے لکھے اور محقق طبع آدمی بھی شیعوں کی زیادت سننے پر تیار ہیں اور نہ ان کی کتابیں پڑھنے کے لئے حاضر ہیں کیونکہ وہ اپنے خیال کے مخالف دوسری آواز کا سننا ہی گوارا نہیں کرتے اور تصویر کا صرف ایک رخ دیکھ کر وہ اپنے عقیدہ پر مطمئن ہیں حتیٰ کہ مودودی صاحب جیسا آدمی بھی ماخذ کی بحث میں اپنا نظریہ اسی تصور کا ظاہر کر چکا ہے۔

۱۳۱۔ جمہوریت میں حق معیار کا میانی نہیں بلکہ کامیابی معیار حق ہے اسی طرح لیاقت و فضیلت جیت کا معیار نہیں بلکہ بیت لیاقت و فضیلت کا معیار ہے۔ اسی بنا پر سوادِ اعظم کے نزدیک جنگِ اقتدار جیت جانے والے تمام اُمت سے افضل قرار دے گئے اور ان کی فضیلت کی وہی ترتیب قائم کی گئی۔

جس ترتیب سے وہ بیت کو سداقت اور پختگی پہنچے

(۴) جمہوریت میں کامیاب امیدواروں کی سبغائش و غاطی پہ وہ ان کی پارٹی کا فرضیہ ہوتا ہے حتیٰ کہ ان کے متضاد نظریات و افکار اور مختلف اقوال و افعال کا ایسا پوتہ ہے کہ ان کا جہرم رکھنا وہ ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ سوا اعظم کے عقائد کا جزو اعظم یہ بات قرار پاتی کہ صحابہ میں سے کسی پرکایت نہیں کرنا خلاف اسلام ہے حتیٰ کہ مخالف کروہوں میں سے بھی ہر ایک کا احترام واجب اور ان کی معابیت کا شرف ناقابل زوال اور ان کی بزرگی کے خلاف زبان کھولنا حرام ہے اور افسوس یہ کہ ایک فریق کو حق کہتے ہوئے بھی دوسرے کو ناحق نہیں کہنا ایک کو امام حق کہنے کے باوجود دوسرے کو باغی کہہ کر بھی ان سے بیزار ہی کرنا حرام سمجھتے ہیں کو یا حق و باطل دونوں سے برابر کی محبت رکھتے ہیں۔ اسی طرح ایک کو مسیح کہنے کے باوجود دوسرے کو غلط نہیں کہنا اور اگر غلط کہنا بھی ہے تو یا تو اجتہاد غلطی کے دامن میں اس کو چھپانے کی کوشش کرنی ہے اور اگر اجتہاد غلطی کہنے کا کوئی امکان نہیں تو نظریاتی غلطی کہہ کر اسے قابل عقوبت بنانا ہے خواہ سچ میں ہزاروں بے گناہ مسلمانوں بلکہ بدیہی و جمعیت رضوان میں شریک صحابہ ہی کو تہیج کر دیا گیا ہو۔ اور یہ عقیدہ قرار دینا ہے کہ قتال و مقتول سب کے ہم برابر وفادار دوست اور محبت میں۔

(۵) جمہوریت میں ضروری نہیں کہ افضل امت کا ہی انتخاب کامیاب ہو۔ اسی بنا پر جمہور اہل اسلام نے اسلامی عقیدہ یہ قرار دیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امام کے لئے ضروری نہیں کہ وہ تمام امت سے افضل ہو۔ چنانچہ علامہ افتخار زانی نے شرح عقائد نسفیہ میں اس امر کی تصریح کی ہے۔

(۶) جمہوریت میں ضروری نہیں کہ جس کا انتخاب کامیاب ہو وہ معصوم بھی ہو اسی بنا پر جمہور اہل اسلام نے اسلامی عقیدہ یہ جوڑ لیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ اور امام امت کے لئے معصوم ہو نا ضروری نہیں ہے۔ (شرح عقائد نسفیہ)

(۷) جس شخص کو بدیہی طرز حکومت کی بنیاد پر سداقت دار مل جائے ضروری نہیں کہ جس مشور کے ماتحت اسے کامیاب کیا گیا تھا اور جن شرائط کے پیش نظر وہ امیدوار کھڑا ہوا تھا کامیابی کے بعد اور اقتدار پر قبضہ کر لینے کے بعد وہ اس مشور پر قائم رہے اور ان شرائط کی ایفہ کرے۔ اسی بنا پر جمہور اہل اسلام نے بطور عقیدہ اس بات کو اپنا لیا ہے۔ لا ینعزل الامام بالفسق اس الخوف من طاعة الله والجور رای الظالم علی عباد الله۔ فاسق ہو جانے سے اللہ کی اطاعت کے دائرے سے نکل جانے سے اور اللہ کے بندوں پر ظلم کرنے سے امام عزل نہیں ہو سکتا۔ (شرح عقائد نسفیہ)

اور چونکہ جمہوریت سے کامیاب ہونے والے بہر وقت اگرچہ ان طبقہ کو نیابت رسول کا دعویٰ بھی تھا

اور نماز میں بھی ان کے پیچھے اقتداء ہوتی تھی پس جب وہ ظلم و فسق سے معزول نہیں ہو سکتے تو ان کو مصلیٰ اور امامت مسجد سے بھی الگ نہیں کیا جاسکتا۔ بنا بریں جمہور اہل اسلام نے اس بارے میں عقیدۂ اسلامی یہ تجویز کیا ہے کہ تَجُوزُ الصَّلَاةُ خَلْفَ كُلِّ بَرٍّ وَفَاجِرٍ ”نماز ہر نیک و بد کی اقتداء میں جائز ہے“ اور اس قسم کے فیصلے مقبول عام نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ ان کی سند جناب رسالت مآب تک نہ پہنچے لہذا برسر اقتدار پارٹی کے خوشامدی روادۃ حدیث نے فاسق و فاجر حکمرانوں کی خوشنودی کی خاطر جناب رسول اللہ پر اتہام لگا دیا کہ آپ نے فرمایا تھا صَلَّوْا خَلْفَ كُلِّ بَرٍّ وَفَاجِرٍ۔ ”ہر نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو“ مودودی صاحب الفقہ الاکبر سے امام ابو حنیفہ کا قول نقل کرتے ہیں ”مومنوں میں سے ہر نیک و بد کے پیچھے نماز جائز ہے“ ص ۲۵۲۔ ادھر ادھر جانے کی ضرورت نہیں۔ خلافت راشدہ ہی کو دیکھ لیجئے۔

مزید برآں چھ آدمیوں کی انتخابی شوری کے لئے انہوں (حضرت عمرؓ) نے جو ہدایات چھوئیں ان میں دوسری باتوں کے ساتھ ایک بات یہ بھی شامل تھی کہ منتخب خلیفہ اس امر کا پابند رہے کہ وہ اپنے قبیلے کیساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہ کرے گا مگر بد قسمتی سے خلیفہ ثالث حضرت عثمان اس معاملے میں معیار مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے (خلافت و ملکیت ص ۹۹) علاوہ بریں سند خلافت سنبھالنے اور اقتدار پر قبضہ کر لینے کے بعد پہلے خطبہ میں حضرت عثمان نے خود اپنے جس دستور العمل کا اعتراف اور وعدہ کیا وہ اس پر بھی ثابت قدم نہ رہے۔ چنانچہ مودودی صاحب رقمطراز ہیں۔

سنو میں پیروی کرنے والا ہوں۔ نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔ جان لو کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی پیروی کرنے کے بعد تین باتیں ہیں جن کی پابندی کا میں تم سے عہد کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ میری خلافت سے پہلے تم نے باہمی اتفاق سے جو قاعدے اور طریقے مقرر کئے تھے ان کی پیروی کروں گا۔ دوسرے یہ کہ جن معاملات میں پہلے کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہوا ہے ان میں سب کے نشورے سے اہل خیہ کا طریقہ مقرر کروں گا۔ تیسرے یہ کہ تم سے اپنے ہاتھ روکے رکھوں گا جب تک کہ تمہارے خلاف کوئی کارروائی کرنا قانون کی رو سے واجب نہ ہو جائے۔ ص ۹۳۔

سنت رسول اللہ کی پیروی یہ کی کہ مردان کے باپ حکم بن ابی العاص طرید رسول کو واپس مدینے میں بلایا چنانچہ مودودی صاحب حضرت عثمان کی خویش نوازی کی افسوسناک داستان میں رقمطراز

ہیں۔ ص ۱۱۰۔

اس معاملہ میں مثال کے طور پر مردان بن الحکم کی پوزیشن دیکھیے۔ اُس کا باپ حکم بن ابی العاص جو حضرت عثمان کا چچا تھا فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوا تھا اور مدینہ آکر رہ گیا تھا مگر اس کی بعض حرکات کی وجہ سے رسول اللہ نے اُسے مدینے سے نکال دیا تھا اور طائف میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ الخ جب حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو اُن سے عرض کیا گیا کہ اسے واپسی کی اجازت دیں مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ حضرت عمر کے زمانہ میں بھی اُسے مدینہ آنے کی اجازت نہ دی گئی حضرت عثمان نے اپنی خلافت کے زمانہ میں اس کو واپس بلا لیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی کہ میں نے رسول اللہ سے اس کی سفارش کی تھی اور حضور نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ اُسے واپسی کی اجازت دے دیں گے۔

یہ نہیں کہ انہوں نے واپس بلا لینے کی اجازت بھی دی تھی۔ کیونکہ اگر آپ نے اس کی واپسی کی اجازت دی ہوتی تو حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے سامنے حضور کا اجازت نامہ پیش کر کے اس کو ان کے زمانوں میں واپس بلا یا جاسکتا تھا کیونکہ اجازت نامے کے ہوتے ہوئے یقیناً وہ دونوں اسے واپس آنے کی اجازت دے دیتے۔ پس پہلے دونوں حکمرانوں کا باوجود اصرار کے اجازت نہ دینا اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ آپ نے اجازت نہیں دی تھی۔ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

اس طرح یہ دونوں باپ بیٹا طائف سے مدینے آ گئے۔ مردان کے اس پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس کا سیکرٹری کے منصب پر مقرر کیا جانا لوگوں کو کسی طرح گوارا نہ ہو سکتا تھا لوگ حضرت عثمان کے اعتماد پر یہ تو مان سکتے تھے کہ حضور نے ان کی سفارش قبول کر کے حکم کو واپسی کی اجازت دینے کا وعدہ فرمایا ہوا نہ کہ واپسی کی اجازت بھی دے دی ہو اس لئے اس کا واپس بلالینا قابل اعتراض نہیں ہے۔ یقیناً قابل اعتراض ہے کیونکہ اجازت نہیں دی تھی ورنہ حضرت ابوبکر و عمر ضرور اجازت دے دیتے، لیکن یہ مان لینا لوگوں کے لئے سخت مشکل تھا کہ رسول اللہ کے اسی معتبوب شخص کا بیٹا اس بات کا بھی اہل ہے کہ تمام اکابر صحابہ کو چھوڑ کر اسے خلیفہ کا سیکرٹری بنا دیا جائے خصوصاً جب کہ اس کا وہ معتبوب باپ زندہ موجود تھا اور اپنے بیٹے کے ذریعے سے حکومت کے کاموں پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ ص ۱۱۱

دوسرے مقام پر آپ تحریر فرماتے ہیں۔

محض قابلیت اس بات کے لئے کافی دلیل نہ تھی کہ خراسان سے لے کر شمالی افریقہ تک کا پورا علاقہ ایک ہی خاندان کے گوزروں کی ماتحتی میں رہے دیا جاتا اور مرکزی سیکرٹریٹ پر جس اس خاندان کا آدمی مامور کر دیا جاتا رہتا۔

اب ان تاریخی حقائق کو سامنے رکھ کر یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جن شرائط کے ماتحت حضرت عثمان کو مجلس شوریٰ کا ممبر بنایا گیا اور جس منشور کی بدولت انہیں مسند اقتدار پر پہنچا نصیب ہوا اور جن جن امور کی رعایت کا انہوں نے اپنے خطبہ میں وعدہ کیا ان کی کس طرح وہجیاں اڑائیں اور اس موقع پر وہ ثابت قدم رہنے میں کس طرح ناکام ہوئے۔ جناب مودودی صاحب نے ص ۹۹ پر کھلے لفظوں میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ وہ معیارِ مطلوب کو قائم نہ کر سکے لیکن آسانیِ سلک کی لاج رکھتے ہوئے لیپ پوت کا فرضیہ ص ۳۲ پر اس طرح انہوں نے ادا فرمایا۔

صدرِ رمی کے شرعی احکام کی تاویل کرتے ہوئے حضرت عثمان نے بحیثیت خلیفہ اپنے اقتدار کے ساتھ جو سلوک کیا اس کے کسی حسد کو بھی شرعاً ناجائز نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر کی ہر وصیت کا میں نے ذکر کیا ہے وہ بھی کوئی شریعت نہ تھی جس کی یا بند ہی حضرت عثمان پر لازم اور خلاف ورزی ناجائز ہوتی۔ ص ۳۱۲

لیجئے حضور مودودی صاحب نے اس لیپ پوت سے حضرت عثمان کی غلطی پر پردہ ڈالتے ڈالتے خلافت راشدہ کی پوری عمارت کو منہدم کر کے رکھ دیا۔ اگر حضرت عمر کا قول حضرت عثمان کے لئے شریعت نہیں اور اس کی خلاف ورزی ناجائز نہیں تو باقی تمام امتِ اسلامیہ پر حضرت عمر کا قول و فعل کیسے شریعت بن گیا اور اس کی خلاف ورزی کیسے ناجائز ہو گئی؟ جب بقول خودش حضرت ابو بکر کی خلافت کی تجویز حضرت عمر نے (بغیر کسی مشورے کے اور بغیر کسی شرعی نص کے) از خود پیدا کر دی۔ اور پھر بیعت کر لی اور لوگوں سے جی کرائی تو وہ شرعی خلیفہ کیسے بن گئے اور اس کی خلافت کا عقیدہ شرعی عقیدہ کیسے بن گیا؟ اسی طرح جب ان کا قول بعد والے خلیفہ کے لئے شریعت نہیں تو وہ خود شرعی خلیفہ کیسے بن گئے ان کی قائم کردہ مجلس شوریٰ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ پھر شیعیان علی پر ناراضگی کس لئے ہے جب کہ وہ ان کی حکومتوں کو صرف طواعت تسلیم کرتے ہیں اور ان کو شرعی طور پر خلیفہ رسول نہیں مانتے؟ بہر حال جمہوری طاقت کو اسلامی خلافت کا نام دے دینے کے بعد اس قسم کی الجھنوں سے گلو خلاصی کے لئے یہ عقیدہ اسلامی عقیدہ کی حیثیت سے ماننا پڑا کہ انکی مخالفت اور عباد اللہ پر ظلم کی بدولت امام مہذول نہیں ہو سکتا اور اسی امامت کے عقیدہ کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد یہ ہے لَا يَمُنُّ إِلَّا بِالْغَيْبِ الَّذِينَ يَلْمِزُونَ آلَ عَبْدِ

(عہدہ امامت ظالموں کو نہیں پہنچ سکتا)

خلیفہ عثمان کے خلاف شورش اور شورشوں کے مطالبہ معزولی کو خلاف قانون قرار دیتے ہوئے

فرماتے ہیں۔

اگر شکایت رفع نہ بھی ہوئی تو شرعاً اس کی بنا پر خلیفہ کے خلاف بغاوت کر دینے اور اس کی معزولی کا مطالبہ کرنے کا قطعاً کوئی جواز نہ تھا لیکن یہ لوگ ان کی معزولی پر اصرار کرنے لگے حالانکہ ساری دنیائے اسلام کے خلیفہ کو صرف بصرہ و کوفہ و مصر کے دو ہزار آدمی جو خود اپنے علاقوں کے نمائندے بھی نہ تھے معزول کرنے یا اس سے معزولی کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہ رکھتے تھے ص ۱۱۸ ... یہ حق انہیں برگز نہ پہنچتا تھا کہ اہل حل و عقد نے اُس وقت کے دستور اسلام کے مطابق جس شخص کو خلیفہ بنایا تھا اور جسے دنیا کے سب مسلمان خلیفہ مان رہے تھے اس کے خلاف یہ چند آدمی بغاوت کر دیتے اور کسی نمائندہ حیثیت کے بغیر محض اپنے اعتراضات کی بنیاد پر اس کی معزولی کا مطالبہ کرتے۔ ص ۱۱۸۔

ان کی عبارت پر غور کرنے سے یہ سوالات ضرور بر ناقد بصیر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔
(۱۱) جو شخص صرف مقامی چھ آدمیوں کی شوریٰ سے تمام دنیائے اسلام کا خلیفہ بن سکتا ہے وہ بصرہ و کوفہ و مصر یعنی اطراف مملکت سے چنے ہوئے دو ہزار انسانوں کے مطالبہ سے کیوں معزول نہیں کیا جاسکتا؟

(۱۲) خلیفہ کی اقرباء و نوازی اور اُن میں سے بعض کی نااہلیت کی شکایات جب عام تھیں اور لوگوں میں اضطراب کی اچھی خاصی لہر دوڑ چکی تھی تو کیا کوفہ و بصرہ و مصر سے اتنا دور دراز کا سفر طے کر کے مقامی شکایات دار الحکومت تک لے جانے کے لئے علاقائی نمائندگی حاصل کئے بغیر وہ دوڑ آئے تھے؟ کیا یہ شکایات لانے والے اپنے اپنے علاقوں کے چند نا عاقبت فہم اور اُن پڑھ گڈریے تھے جنہیں اتنا ہوش بھی نہ تھا کہ دار الحکومت کی طرف مطالبات لے جانے کے لئے علاقائی نمائندگی کی سند بھی ضروری ہوتی ہے؟۔

(۱۳) کیا اسلامی جمہوریت کا تقاضا یہی ہے کہ جمہوری حکمران اگرچہ کنبہ پروری کرتا ہو خدا کی اطاعت سے باہر ہو جائے۔ نا اہل افسہ مقرر کر کے ان کو لوگوں کی گردنوں پر سوار کر دے کہ وہ لوگوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ گراتا رہے تاہم نہ وہ معزول ہو سکتا ہے اور نہ اُسے معزول کیا جاسکتا ہے؟ بلکہ عوام کو یہ حق بھی حاصل نہیں کہ اس سے معزولی کا مطالبہ کریں تاکہ خوشگوار انقلاب رونما ہو کر امن و سکون بحال ہو سکے؟

(۴) تنہا شورشی نہ تھے بلکہ مدینہ کے اہل حل و عقد جن کو خلیفہ سازی کا اختیار حاصل تھا۔ ان کی اکثریت بھی ان کے ہمنوا تھی جس کا مودودی صاحب مختلف مقامات پر اعتراف بھی کر چکے ہیں تو ایسے حالات میں ان کو معزولی کے مطالبہ کا حق کیوں حاصل نہ تھا؟ بیرونجات کے دو ہزار نمایندوں کے علاوہ صحابی اور صحابی زادے اس تحریک میں شامل تھے ۲۲۹۔ اکابر صحابہ خلیفہ سے ناراض تھے ۲۲۹ حضرت طلحہ۔ حضرت زبیر اور حضرت عائشہ بھی ناراض تھے ۲۳۲۔ دارالحکومت (مدینہ) کی اچھی خاصی تعداد ان کے ہم خیال تھی ۲۳۵ بلکہ صرف چار آدمیوں کے علاوہ کوئی ایک بھی خلیفہ کے حق میں زبان نہیں کھولتا تھا ۲۳۳ حضرت علی بھی خلیفہ کی اصلاح سے مایوس ہو گئے تھے ۲۳۲۔ اب انصاف سے فرمائیے کہ اگر باہر سے آنے والے شورشی بقول آپ کے نمایندہ حیثیت نہیں رکھتے تھے تو چار آدمیوں کے سوا سب اہل مدینہ جو بقول آپ کے اس زمانے کے اہل حل و عقد تھے ان میں سے جب خلیفہ کی حمایت میں زبان کھولنے والا کوئی نہ تھا تو اس کا مثبت پہلو یہی ہے کہ وہ سب بیرونجات کے نمایندوں کے مؤید تھے جن کے مطالبات میں سے اہم مطالبہ خلیفہ کی معزولی کا تھا اور جب بات چیت سے کامیابی نہ ہوئی تو آخری حربہ قتل ہی تھا اور اس کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہ تھا کیونکہ پوری دنیا اسلام میں کئے جانے والے مظالم کا سد باب اس کے بغیر ممکن نہ تھا اور سابقہ حوالوں کی بنا پر قتل کرنے والوں کو تمام اہل حل و عقد کی عملی تائید حاصل تھی اور یہی وجہ ہے کہ اس قتل کے بعد اہل مدینہ میں سے کسی نے بھی قاتلین سے قصاص کا مطالبہ نہیں کیا اور طلحہ و زبیر و عائشہ نے اپنی ذاتی اغراض کے پیش نظر قصاص کے بہانہ سے جنگ جمل کا اقدام کیا تو بقول مودودی صاحب وہ خود اس حرکت پر پشیمان تھے اور حضرت عائشہ اپنی اس غلطی پر تازلیت روتی رہیں اور میں نے ذاتی اغراض کی بنا اس لئے کہی ہے کہ اگر خون عثمان کا بدلہ لینا مقصود ہوتا تو قاتلین مدینہ میں موجود تھے اور حضرت علی بھی مدینہ ہی میں موجود تھے۔ بصرہ میں جا کر عثمان بن حنیف گورنر بصرہ صحابی رسول پر ظلم کرنا اور بے گناہ بصریوں کو ستانا کسی طرح عثمان کے قتل کا بدلہ نہیں قرار دیا جاسکتا تھا۔ جب عقلی طور پر ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تو پھر وہی ایک بات ہے کہ شرعی طور پر امام کو معزول نہیں کیا جاسکتا خواہ ظالم و فاسق ہو پس وہ نماز میں بھی مقتدا بن سکتا ہے خواہ ولید بن عقبہ و عثمان کے کوئی گورنر کی طرح شراب پی کر صبح کی نماز چار رکعت ہی کیوں نہ پڑھا دے ۱۱۲۔ یہ واضح رہے کہ حضرت عثمان کو قتل اس وقت کیا گیا جب کہ اصلاحی اقدامات بالکل مدیائوسی تک پہنچ چکے تھے اور مسلمانوں کے لئے خلیفہ کے قتل کے سوا کوئی چارہ کار نہ باقی تھا اور حضرت عائشہ ہی نے تو سب سے پہلے ان کے قتل کا فتویٰ سرزد فرمایا تھا اور اس کی مثال اس طرح تھی جس طرح جسم میں خراب و

فاسد عضو کا حتی الامکان علاج کیا جاتا ہے لیکن جب پوری طرح مایوسی ہو جانے تو پورے جسم میں اس کے
نزدک مادہ کی مرہیت کو روکنے کے لئے اسی ایک عضو کو ہی کاٹ دینا زیادہ مناسب ہوتا ہے تاکہ
باقی جسم اس کے فساد سے متاثر نہ ہو اور بڑھتی ہوئی بے چینی کو روک کر امن و سکون کا سانس لیا جانے اور یہ
کلبناکار عام شورشوں کو لوگوں نے قتل کر دیا بالکل غلط ہے۔ قتل کا ارتکاب کرنے والے کو فی الجہہ ہی دمنہر ہی
نہ تھے بلکہ مدنی ہی تھے ایک خلیفہ اول حضرت ابو بکر کے صاحب زادے حضرت محمد بن ابی بکر مدنیہ کی
مشہور و معروف شخصیت صاحب علم و فضل اور با اثر تابعی تھے دوسرے حضرت عمرو بن العلق خنداسی
صحابی رسول مدنیہ کے رہنے والے تھے اور قیصر نے ان کے بھراہ حضرت مالک اشتر تھے جو زہد و تقویٰ میں
میں یکتائے زمانہ رہتے۔ نیز یہ کلبناکار حضرت عائشہ یہ کہہ کر مدنیہ سے مکہ چلی گئیں کہ اس طوفان بدتمیزی میں کیا
میں بھی اپنی قومین کر اؤں؟ منہ محض تاریکی متعلق سے چشم پوشی اور واقعات کا منہ چڑھانا ہے۔ حضرت
عائشہ خلیفہ اول کی صحابہ اوی صحابیہ اور عدم رسول اللہ ہونے کی وجہ سے عامۃ المسلمین کے نزدیک بہت
بندہ مقدم پر فائز تھیں ان کے اشارے سے شورش ختم ہو سکتی تھی جب کہ ان کا نمایندہ ان کا سگہ جہانی
حضرت محمد بن ابی بکر تھا لیکن وہ خود بھی خلیفہ کی پالیسی سے تنگ دل ہو چکی تھیں اور اسے مضمون فاسد
کی طرف اشارہ کرنا زیادہ موزوں سمجھتی تھیں اور اُقتلو اُقتلوا فینا نہ کفر اُقتلوا اُقتلوا
کا فتویٰ جاری کر کے ملک کی طرف شریعت لے گئی تھیں جس کا اشارہ خود مودودی صاحب نے خلافت و
ملکیت ص ۲ پر کر دیا ہے اور جب اہل بیت اور مدینہ کی اچھی خاصی تعداد بکد چار آدمیوں کے سوا سب
اہل بیت حضرت عثمان کی حمایت میں زبان نہ کھولتے تھے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ حضرت عائشہ
کے فتویٰ سے متفق تھے اور قتل کا ارتکاب کرنے والے بھی صحابی و صحابی زادے تھے تو اب اس تیسرے
تک پہنچنا بالکل آسان ہے کہ اس کا قتل شرعی لحاظ سے صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب تھا اور جن اہل
صل و متہ میں سے بعض کا اقدام اور دوسروں کی خاموشی شرعی خلیفہ بنا سکتی تھی تو کیا انہی اہل صل و متہ میں
سے بعض کا اقدام اور باقیوں کی خاموشی سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ یہ فعل شرعی اعتبار سے درست تھا
اور اہل مدینہ کے اجماع سے تھا اور یہی وجہ ہے کہ جس صحابی اور صحابی زادے نے خلیفہ کو قتل کر دیا تھا وہ
مسجد نبوی میں نماز پڑھتے تھے اور حضرت علی کی بیعت میں بھی شامل تھے اور حضرت عثمان کے قتل پر
اہل مدینہ میں قہر و غم تھا کہ خلیفہ مقتول کی لاش کو تین دن تک دفن کرنا بھی انہوں نے مناسب نہ
سمجھا۔ انہوں نے جہانہ پڑھنے کی زحمت گوارا کی۔ تاریخ خلیفہ ص ۲۶ تاریخ کامل و جامع جہاد المبین ص ۱۰۰
مودودی صاحب نے یہ منہ تو پیش کر دیا ہے کہ تابعین سے بددست بددلیا جانا ناممکن نہ تھا

لیکن حب وہ حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور اطاعت کا عہد کر چکے تھے تو کیا خلیفہ مقتول کے دفن و جنازہ سے بھی وہ مانع تھے؟ ان کی دشمنی خلیفہ کے غلط کردار سے تھی نہ کہ ان کی میت سے اور لطف یہ کہ اہل مدینہ میں سے کسی نے بھی مقتول کی تجہیز و تکفین و جنازہ کو ضروری نہ سمجھا اس سے صاف یہی مطلب نکلتا ہے کہ حضرت علی کے نزدیک بلکہ تمام اہل مدینہ اکابر صحابہ اور ارباب حل و عقد کے نزدیک وہ واجب القتل تھاتھی کہ اس کا جنازہ بھی غیر ضروری تھا پس راتوں رات ان کے کنہ کے چند افراد نے گھر سے اٹھا کر حش کو کب میں اس کو دفن کر دیا اور معاویہ نے اپنے عہد حکومت میں جنت البقیع کی ملحقہ دیوار کو گر کر اس جگہ کو جنت البقیع میں شامل کر دیا اور اب تک دیوار کا موڑ دیکھنے والوں کو اس الحاق کا پتہ دے رہا ہے۔ بنا بریں حضرت علی اور حمزہ اکابر صحابہ کے نزدیک قاتلین عثمان سے انتقام لینا غیر ضروری تھا کیونکہ انہوں نے ایک عضو فاسد کو قطع کر کے پوری مملکت کے عوام کو اطمینان سکون کا سانس دلایا اور ان کو بنی امیہ کے ظالم گورنروں کی گرفت سے نجات دی۔ اور یہی وجہ ہے کہ طلحہ و زبیر نے فتنہ کھڑا کر کے یکسوئی اختیار کر لی اور حضرت عائشہ بھی نادم ہو کر بیٹھ گئی اور اہل مدینہ میں سے کسی نے بھی انتقام کا نادم تک نہیں لیا البتہ معاویہ اور بنی امیہ کے باقی افراد صرف حکومت کو اپنے خاندان میں جذب کرنے کی غرض سے انتقام کی رٹ لگاتے رہے تاکہ وہ اس بہانہ سے اقتدار کی بنیادوں کو مضبوط کر سکیں پس حضرت علی کا قاتلین عثمان سے انتقام لینا بلکہ عہدوں سے سرفراز کرنا قطعاً غلط نہ تھا بلکہ صحیح اقدام تھا۔

اسلام کے اصول حکمرانی اور خلافتِ اشد کی خصوصیات پر دعوتِ سر

جناب مورودی صاحب نے اسلام کے اصول حکمرانی ۹ بیان فرمائے ہیں۔ ہم اسلام کے اصول حکمرانی [منقلاً وہ گنوا دیتے ہیں تاکہ اسلامی حکومتوں کے کردار کے سمجھنے میں آسانی ہو] اس ریاست کا اولین بنیادی قاعدہ یہ تھا کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کا قانون خداوندی کی بالائری [اسی ہے اور اہل ایمان کی حکومت دراصل "خلافت" ہے جسے مطلق الفناء کے ساتھ کام کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ اس کو لازماً اس قانون خداوندی کے تحت رہ کر ہی کام کرنا چاہیے۔

۱۔ تاریخ طبری جلد ۱ ص ۱۴۰ الامامہ والسیاستہ ص ۱۴۰ حش کو کب جنت البقیع سے باہر ایک مقام تھا جہاں یہود اپنے مردوں کو دفن کرتے تھے۔ معاویہ نے اپنے درحکومت میں اس کو بقیع میں شامل کر لیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ اس قبرستان کے ارد گرد مسلمانوں کی قبریں بنائی جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا پس وہ مقام مقابر مسلمانین سے متصل ہو گیا۔ تاریخ طبری جلد ۱ ص ۱۴۰

۲۔ تاریخ طبری جلد ۱ ص ۱۴۰ اصحاب ابن حجر ص ۱۴۰ زیل ترجمہ جلد بن عبد و (کتاب النجاة)

جس کا ماخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہے۔

۲۔ عدل بین الناس

دوسرا قاعدہ جس پر ریاست کی بنیاد رکھی گئی تھی یہ تھا کہ قرآن و سنت کا دیا ہوا قانون سب کے لئے یکساں ہے اور اس کو مملکت کے اونی ترین آدمی سے لے کر مملکت کے سربراہ تک سب پر یکساں نافذ ہونا چاہیے کسی کے لئے بھی اس میں امتیازی سلوک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۳۔ مساوات بین المسلمین

تمام مسلمانوں کے حقوق بالفاظ زمان و نسل و زبان و وطن بالکل برابر ہیں۔ کسی فرقہ، گروہ، ملت یا نسل و قوم کو اس ریاست کے حدود میں امتیازی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کی حیثیت کسی دوسرے کے مقابلہ میں فرقہ قرار پا سکتی ہے۔

۴۔ حکومت کی ذمہ داری و جوابدہی

چوتھا اجماع قاعدہ جس پر یہ ریاست قائم ہوئی تھی یہ تھا کہ حکومت اور اس کے اختیارات اور اموال خدا اور مسلمانوں کی امانت ہیں جنہیں خدا ترس ایماندار اور عادل لوگوں کے سپرد کیا جانا چاہیئے اس امانت میں کسی شخص کو من مانی طریقہ پر یا انضباطی اغراض کے لئے تصرف کرنے کا حق نہیں ہے اور جن لوگوں کے سپرد یہ امانت ہو وہ اس کے لئے جواب دہ ہیں۔

۵۔ شوری

اس ریاست کا پانچواں اجماع قاعدہ یہ تھا کہ سربراہ ریاست مسلمانوں کے مشورے اور ان کی رضامندی سے متقرر ہونا چاہیئے اور اسے حکومت کا نظام بھی باجمعی مشورے سے چلانا چاہیئے۔

۶۔ الطاعت فی المعروف

چھٹا قاعدہ جس پر یہ ریاست قائم کی گئی تھی یہ تھا کہ حکومت کی الطاعت صرف معروف میں واجب ہے بمعینیت میں کسی کو الطاعت کا حق نہیں پہنچتا۔ دوسرے الفاظ میں اس قاعدے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اور حکام کا معروف وہی حکم ان کے ماتحتوں اور رعیت کے لئے واجب الطاعت ہے جو قانون کے مطابق ہو قانون کے خلاف حکم دینے کا نہ انہیں حق پہنچتا ہے اور نہ کسی کو اس کی الطاعت کرنی چاہیئے۔

۷۔ اقتدار کی طلب و حرص کا منوع ہونا

یہ قاعدہ بھی اس ریاست کے قواعد ہیں تہا کہ حکومت کے ذمہ دارانہ منصب کے لئے عموماً اور خلافت کے لئے خصوصاً وہ لوگ سب سے زیادہ غیر موزوں ہیں جو خود عمدہ حاصل کرنے کے طالب ہوں اور اس کے لئے کوشش کریں۔

۸۔ ریاست کا مقصد وجود

اس ریاست میں حکمران اور اس کی حکومت کا اولین فریضہ یہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ اسلامی نظام زندگی کو کسی رد و بدل کے بغیر جوہن کا توں قائم کرے اور اسلام کے معیار اخلاق کے مطابق کھلائیوں کو فروغ دے اور برائیوں کو مٹائے۔

۹۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حق اور فرض

اس ریاست کے قواعد میں سے آخری قاعدہ جو اس کو صحیح راستہ پر قائم رکھنے کا ضامن تھا یہ تھا کہ مسلم معاشرے کے ہر فرد کا نہ صرف یہ حق ہے بلکہ یہ اس کا فرض بھی ہے کہ کلمہ حق کہے، نیکی و کھلائی کی حمایت کرے اور معاشرے یا مملکت میں جہاں بھی غلط اور ناروا کام ہوتے نظر آئیں ان کو روکنے میں اپنی خدک پوری کوشش صرف کرے۔

دعوتِ فکر

پانچویں اصل "شوری" صرف اپنے مسلک کی اتباع میں شامل کر لی گئی ہے۔ ورنہ قرآن مجید نے قطعاً کہیں بھی سربراہ مملکت کے انتخاب کو شورائی کے سپرد نہیں فرمایا اور نہ یہ عمدہ عوام کے انتخاب سے حاصل ہو سکتا ہے اور عوام جس کو چاہیں گے وہ بادشاہ یا صدر ہو گا لیکن خدا کی جانب سے واجب الطاعت مملکت اسلامیہ کا سربراہ نہ ہو گا بلکہ مملکت اسلامیہ کا واجب الطاعت سربراہ وہی ہو سکتا ہے جسے خدا نامزد کرے اور وہ نبی و رسول ہو گا یا جسے رسول نامزد کرے جائے اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

ساتویں اصل "اقتدار کی طلب و حرص کا ممنوع ہونا" یہ بھی ایک ناقابل فہم بلکہ بعید از عقل بات ہے کیونکہ اگر ایک شخص اپنے اندر خدمت قوم و ملک کا جذبہ رکھتا ہو اور اپنے اندر ملت اسلامیہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہو اور اسی مخلصانہ جذبہ کے تحت خلافت کے لئے یا کسی ذمہ دارانہ منصب کے لئے خود کو پیش کرے یا اس کے لئے کوشش کرے تو وہ کیوں کر غیر موزوں قرار دیا جائے۔ اگر وہ خود خاموشی اختیار کرے اور دوسرے لوگ اس کی خاموشی کو اس کی نا اہلیت کی دلیل سمجھتے رہیں کیونکہ وہ غیب دان تو ہیں نہیں پس دریں حالات کوئی نا اہل ہر اقتدار آجائے جو وہاں ملک و ملت اور عزت قوم و مذہب کے لئے سخت مضر ہو تو کیا ایسے

خاموش رہنے والے انسان کو خدا کے ہاں جواب دہ نہ ہونا ہوگا ہ اور کیا ایسا شخص ضمیر فروش بلکہ اسلام دشمن نہ سمجھا جائے گا جس نے دیدہ دانستہ ملت و ملک کو فتنہ ملاکت میں گرنے سے بچا سکنے کے باوجود نہ بچایا اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکنے کے باوجود ہاتھ پر ہاتھ دھڑکے بیٹھا رہا۔

تیسرے اور پانچویں اصول کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے کس حیثیت سے حضرت ابوبکرؓ کا نام پیش کر کے فوراً بیعت کر لی اور لوگوں کو بیعت کرنے پر مجبور کیا کیونکہ نام پیش کرنے سے نہ شوری مکمل ہوتا ہے اور نہ خلافت بنتی ہے پس فوراً بیعت کا اقدام ایک سوچے سمجھے منصوبے کو ظاہر کرتا ہے جس پر عمل کر کے بعد والوں کے لئے حرام قرار دے دیا گیا۔ اس کو اگر اقتدار کی ہوس نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے ہ اور کیا چوتھی اصل کی رو سے اللہ اور مسلمانوں کی امانت کا پہلے دن سے ہی جنازہ نہیں نکلا ہ

مودودی صاحب نے خلافت راشدہ کے سات خصوصیات شمار کئے ہیں۔

خلافت راشدہ کے خصوصیات

(۱) انتحابی خلافت:۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے لئے حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عمرؓ نے تجویز کیا اور مدینے کے تمام لوگوں نے وجود حقیقت اس وقت پورے ملک میں عملاً مانا بندہ حیثیت رکھتے تھے کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ص ۸۳۔

دعوت فکر:۔ سوچنے کے قابل بات ہے کہ حضرت عمرؓ کو یہ حق کیسے پہنچا کہ ایک شخص کا از خود نام تجویز کر دیں نہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو یہ اختیار دیا تھا اور نہ ان پر وحی اتری تھی۔ البتہ یہی ایک صورت ہے کہ سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت یہ کھیل کھیلا گیا۔ اور مقصد برابری کے بعد دوسرے لوگوں کے لئے اس طریق کار کو ناجائز قرار دیا گیا۔ اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ یہ طریقہ آئین اسلامی کے خلاف تھا اور نہ ہمیشہ کے لئے اس کو جائز ہونا چاہیے تھا پس خلافت راشدہ کے دیدہ زیب محل کی بنیاد یہی کھوکھلی نکلی نہ اس کا تیار شدہ نقشہ آئین اسلامی کے مطابق تھا اور نہ اس کے سنگ بنیاد کو حق طلبی و حق کو نشی کی خاطر نصب کیا گیا تھا۔

اجتماعی خلافت کے تحت میں فرماتے ہیں "اہل ایمان کی جماعت کا ہر فرد خلافت میں برابر کا حصہ دار ہے کسی شخص یا طبقہ کو عام مومنین کے اختیارات خلافت سلب کر کے انہیں اپنے اندر مرکوز کر لینے کا حق نہیں ہے نہ کوئی شخص یا طبقہ اپنے حق میں خدا کی خصوصی خلافت کا دعوے کر سکتا ہے۔ یہی چیز اسلامی خلافت کو ملوکیت سے الگ کر کے اسے بدوریت کے رخ پر

اس قاعدے کا صاف یہ مطلب ہے کہ حضرت عمر کو عام مومنین کے اختیاراتِ خلافت سلب کر کے اپنے اندر مرکوز کرتے ہوئے حضرت ابوبکر کا نام پیش کرنے کا کوئی حق نہیں تھا بنا بریں یہ قائم شدہ حکومت اسلامی خلافت نہیں تھی بلکہ ملوکیت ہی ملوکیت تھی جو دیکھڑی کے باوجود جمہوریت کا لباس اوڑھے رہی۔

اگر اس فعل میں ذرا بھر بھی خلوص ہوتا تو نام تجویز کرنے کے بعد رائے عامہ کو ہموار کیا جاتا اور سفیفہ بنی ساعدہ کے بجائے اُمتِ اسلامیہ کے اس اہم کام کی انجام دہی کے لئے مسجد نبوی کو تجویز کیا جاتا جب رائے عامہ ہموار ہو جاتی خواہ اہل مدینہ کو ہی کافی سمجھ لیا جاتا۔ اس کے بعد اس کو خلیفہ سمجھتے ہوئے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھائے جاتے کیونکہ نام تجویز ہوتے ہی خلیفہ نہیں بن جاتا بلکہ اہل حل و عقد کی رائے اور اتفاق کے بعد ہی وہ صحیح خلیفہ قرار پا سکتا ہے۔ بنا بریں حضرت عمر کا حضرت ابوبکر کے نام کو تجویز کرنے کے بعد فوراً اور سب سے پہلے بیعت کر لینا کونسا آئین اسلامی تھا اور دوسرے لوگوں کو بیعت کی پیشکش کرنا کس اسلامی قانون کے ماتحت تھا؟ منصف مزاج انسان اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اقتدار حاصل کرنے کا یہ ایک بہانہ تھا جب کامیابی ہو گئی تو مسجد نبوی میں اعلان کیا گیا اور عوام کو بیعت کی طرف کھینچ لایا گیا گویا رائے عامہ کے ہموار ہونے اور اہل حل و عقد کے اتفاق کر لینے کے بعد خلافت نہیں بنی بلکہ خلافت (حکومت) پر قبضہ کر لینے کے بعد رائے عامہ کو بھی ہموار کیا گیا اور اہل حل و عقد کو بھی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کر لیا گیا۔ کتب سیر میں اس قصہ کی افسوسناک تفصیل اب تک محفوظ ہے۔

مودودی صاحب تاریخ کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ (مدینہ کے تمام لوگوں نے کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔) حالانکہ کتب سیر میں اس دھاندلی کی عبرت ناک المناک اور افسوسناک داستان اب تک جوں کی توں موجود ہے اور منصف مزاج انسان اس فیصلے پر پہنچتا ہے کہ اس سے بڑھ کر دھونس و دھاندلی شاید کسی جمہوری حکومت کے اقتدار میں رونما نہیں ہوئی ہوگی جو سفیفہ بنی ہاشم نے خلافت کے وقت ہوئی تھی۔ سعد بن عبادہ السامی نے بیعت کرنے سے انکار کیا تو مودودی صاحب نے اسے قبائلی عصبیت کا نام دے دیا۔ حضرت علی اور حمزہ خاندان بنی ہاشم نے بیعت سے انکار کیا اور سخت احتجاج بھی کیا اسی طرح حضرت زبیر نے بیعت سے انکار کیا مودودی صاحب نے

ان کا ذکر تک نہیں کیا اور حکومت وقت نے انکار کرنے والوں کا سختی سے مناسب کیا اور بنور ان کو
بیعت کے لئے لایا گیا۔ (الامامت والسیاست)

مودودی صاحب نے اہل مدینہ کو پورے ملک اسلامی کا نمایندہ قرار دے دیا ہے۔ ان کے
نہ تو جناب رسالت مآب نے ان کی نمایندگی پر کوئی نص فرمائی اور نہ قرآن مجید میں کوئی اس قسم کا اشارہ
موجود ہے۔ قرآن کا صاف فرمان ہے کہ اِنَّ اَكْثَرَ مَمْلُكَةٍ عِنْدَ اللّٰهِ اَلْفَاكَةُ اللّٰہ کے نزدیک
زیادہ عزت دار وہی ہے جو زیادہ متقی ہو۔ اس قاعدے کے ماتحت خواہ کوئی ملی ہو یا ملنی ہو۔ عربی ہو
یا ایرانی ہو یا نبویا سفید سب برابر ہیں اور تقویٰ ہی بعض کی بعض پر مبنی کا سبب ہے۔ اسی طرح
احادیث نبویہ میں بھی سب انسانوں کو اسلامی معاشرہ میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے بلکہ خود مودودی
صاحب اسلامی ریاست کے خصوصیات میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”وحدہ و در ریاست میں رہنے والے
تمام اہل ایمان کو خدا کی خلافت کا حامل قرار دیتی ہے اور صل و عقد کے آخری اختیارات مجموعی طور پر ان
کے حوالہ کرتی ہے۔ ۵۵۔ آباء کو رانہ تسلید کے شکنجے میں گرفتار محقق جس قاعدے کو ایک جگہ پختہ کرتا
ہے دوسری جگہ خلافت راشدہ کے مرکبات و سکنت اس کے قاعدے کی دھجیاں اڑا دیتے ہیں۔
وہ بے چارہ اپنے قاعدے سے دست بردار ہوتا ہے اور نہ خلافت راشدہ کو چیلنج کر سکتا ہے چنانچہ
اس نے جمہور اہل اسلام کے مسلک کی تصحیح کے فرائض کو انجام دیتے ہوئے جمہوری خلافتوں کے
انقصاد کے وقت کی دھاندلیوں سے جان چھڑانے اور سلاطین وقت کے اقتدار کو اسلامی خلافت
ثابت کرنے کے لئے تاریخ کا منہ پڑاتے ہوئے یہ عذر لنگ پیش کیا ہے۔ خلافت و ملکیت ترا
پر ملاحظہ فرمائیے۔

اب نہ اسے ہم چھپا سکتے ہیں نہ لوگوں سے کہہ سکتے ہیں کہ تم تاریخ اسلام کے اس دور کا
مطالعہ نہ کرو اور نہ خلق خدا کو اس پر کلام کرنے سے روک سکتے ہیں۔ اگر ہم صحت نقل اور مقبول
و مدلل اور متوازن طریقے سے اس تاریخ کو خود بیان نہ کریں گے تو مغربی مستشرقین اور غیر
معتدل ذہن و مزاج رکھنے والے مسلمان مصنفین جو اسے نہایت غلازنگ میں پیش کرتے
رہے ہیں اور آج بھی پیش کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی نئی نسل کے دماغ میں اسلامی تاریخ ہی
کا نہیں بلکہ اسلامی حکومت اور اسلامی نظام زندگی کا بھی غلط تصور بھجوا دیں گے۔ الخ

مقتصد یہ ہے کہ جب تک تاریخ کے پیرے کو منہ کر کے جمہوری حکومتوں کو اسلامی خلافتیں ثابت
کرنے کے لئے ہم خود نہ واقعات کو اپنی صوابدید سے مرتب کریں گے اور گزشتگان کی غلط کاریوں

پر لپ پوت کی چادر چڑھا کر صحیح نہ ثابت کریں گے تو ممکن ہے مسلمانوں کی نئی پود تحقیقت سے واقف ہو کر خلافت راشدہ کو بادشاہت و ملوکیت کا نام دے دے اور جمہور اہل اسلام کا سارا منصوبہ خاک میں مل جائے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں۔ ع۔ خوشبو انہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے۔

دوسری خصوصیت۔ شوری حکومت۔ اس کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ چاروں خلفاء حکومت کے انتظام اور قانون سازی کے معاملہ میں قوم کے اہل الرائے لوگوں سے مشورے کئے بغیر کام نہیں کرتے تھے، حالانکہ کتاب کی تفصیلی ابجاث میں اس کی کاپی تردید موجود ہے حضرت ابو بکر کا نام تجویز کرتے ہوئے حضرت عمر نے قطعاً اہل الرائے لوگوں سے مشورہ نہیں لیا تھا اور حضرت علی و عباس و زبیر وغیرہ جیسے اکابر کو بھی اس بارے میں نظر انداز کرتے ہوئے خلافت کی کھڑی تیاری کر لی تھی۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر نے برسر اقتدار ہوتے ہوئے بلا کسی مشورہ کے حضرت عمر کو نامزد کر کے اپنے اقتدار کے زیر سایہ لوگوں سے بیعت لی تھی۔ اور لطف یہ کہ معاویہ نے یزید کے لئے حکومت کی راہیں اسی طرح ہموار کیں تو وہ ملوکیت ہو گئی اور حضرت ابو بکر نے عمر کے لئے وہی طریقہ اختیار کیا تو خلافت راشدہ قرار پائی اور شوری حکومت بھی اُسے کہا گیا۔ اور طرہ یہ کہ کتاب کے اکثر و بیشتر حصہ میں حضرت عثمان کی اقربا و اوزمی کو بیان کیا اور جا بجا یہ واضح کیا کہ اہل الرائے حضرات اس کے اس فعل سے ناراض تھے چنانچہ صحابہ کبار کو مناصب حکومت سے بلا وجہ معزول کر کے اپنے خاندان کے نااہل افراد کو لوگوں کی گردنوں پر سوار کر دیا اور قطعاً اس بارے میں اہل الرائے سے مشورہ لینا کبھی گوارا نہ کیا۔ بلکہ اہل الرائے کے ٹوکنے کے باوجود بھی وہ باز نہ آئے حتیٰ کہ ان کی اپنی بیوی بھی ان کی اس جنبہ داری سے ناالاں تھی اور صحابہ و صحابہ زادوں کی اکثریت اس سے متنفر ہو چکی تھی جو بالآخر اس کے قتل تک منتی ہوئی اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا کہ اہل الرائے لوگوں کے مشورے کے بغیر کام نہیں کرتے تھے کس قدر جرأت و جسارت ہے؟

تیسری خصوصیت۔ بیت المال کے امانت ہونے کا تصور۔ اس ذیل میں حضرت ابو بکر و حضرت عمر و حضرت علی کی مثالیں گنوائی ہیں اور حضرت عثمان کو شامل کرنے کی جرأت نہیں کی کیونکہ وہ صلہ رحمی کے نام سے بیت المال کے دروازے اہل خاندان کے لئے کبھی بند نہیں کرتے تھے۔ یہ صلہ رحمی بھی عجیب ہے کہ اپنی گردن سے ادا کرنے کے بجائے بیت المال اور تمام مسلمانوں کا مشترکہ ہے اسے کنز پروردہ ہی ہوتی ہے اور لطف یہ کہ اس صلہ رحمی کا معنی سوائے عثمان کے اور کسی صحابی یا صحابی زادے کے ذہن میں نہیں تھا ورنہ وہ قطعاً معترض نہ ہوتے۔

حضرت ابوبکر کی اختیارات کے متعلق فدک کے بارے میں رقمطراز ہیں حضرت ابوبکر نے اسے
مضور کی میراث میں آپ کی ساری بڑائی تک کو دینے سے انکار کر دیا تھا مگر مردان بن الحکم نے اپنے
زمانہ خلافت میں اسے اپنی ملک اور اپنی اولاد کی میراث بنالیا تھا ص ۱۶۲

مودودی صاحب نے بڑے اچھوتے انداز سے خلیفہ کے غاصبانہ تصرف کو تقدس کا لباس دیا
فرماتے ہیں بیت المال کا اسلامی تصور یہ تھا کہ وہ خلیفہ اور اس کی حکومت کے پاس خدا اور خلق کی امانت
ہے ص ۱۶۱ حضرت عثمان اور اس کی حکومت نے تو اس امانت خلق کو سدرہ رحمی کے بہانہ سے اقرباء پروری
کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اور حضرت ابوبکر نے جناب فاطمہ کی ذاتی املاک کو جو نبی کریم سے ان کو ورثہ میں پہنچی
تھیں بحق سرفار ضبط کر کے بیت المال میں شامل کر لیا۔ اس بہانہ سے کہ نبیوں کا متروکہ مال صدقہ ہوا
کرتا ہے۔

حالانکہ قرآن مجید کی آیات تو ریت میں نبیوں کا کوئی استثناء نہیں ہے۔ اور خبر واحد قرآن
کی ماسخ نہیں ہو سکتی۔ بہر کیف اس مقام پر موضوع فدک پر مناظرہ مقصود نہیں ہے۔ البتہ سوچنے کا
مقام ہے کہ ایک طرف سخت گیر ہی اور تنگ نظری کا یہ عالم کہ ذاتی املاک کو بیت المال میں شامل
کرتے ہوئے اولاد رسول کی بخشش کی پروا نہ کی جاتی اور دوسری طرف دریا دلی کی یہ حد کہ اپنے
اقرباء و خاندان کے لئے سدرہ رحمی کے بہانہ سے بیت المال کے دروازے کھلے ہیں اور طریقہ کہ افریطو
تفریط کے دونوں پہلو خلافت راشدہ کی حدود کی وسعتوں میں بلا چون و چرا سما سکتے ہیں اور سمونے جاسکتے
ہیں ان میں سے کسی پہلو پر بھی زبان کشائی۔ اسلامی نظام حکومت کی توہین سمجھی جاتی ہے پس جس کی
لائسنس اس کی جینس بمقتی دوران کے نزدیک دونوں ادا کے مستحق ہیں۔

چونکہ خصوصیت حکومت کا تصور۔ پانچویں خصوصیت قانون کی بالاتر ہی پرانوں نے
تفصیلی تبصرہ کیا لیکن سہ دست ہم اس سے پہلو تھی کرتے ہیں۔

البتہ چھٹی خصوصیت۔ عبیتوں سے پاک حکومت۔ کے متعلق بڑا جی پاد رہا تھا کہ کچھ کہہ دیں لیکن
جلد ہو متحق دوران کا کہ حضرت عثمان کے متعلق اتنا تو برأت سے کہ گئے۔ مگر بہت سی سے خلیفہ
شمالی حضرت عثمان اس معاملے میں معیار مطلوب کو قائم نہ کر سکے ص ۹۹۔ ان کا یہ نظریہ بڑے
رکھ رکھا اور کچھ بچاؤ کا غماز ہے کیوں کہ یہاں تین مرحلے ہیں (۱) انتخاب کے وقت کسی شخص میں معیار
مطلوب کا لا نظر رکھنا ص ۱۲۰ جس میں ایک معیار مطلوب کا لا نظر رکھا گیا۔ انتخاب کے بعد اس کا پس
معیار پر پورا اترنا ص ۱۲۱ معیار پر پورا اترنے والے خسان کا معیار مطلوب کو قائم رکھنا۔ اس تمام

پر بنیاد کی خشتِ اول ہی غائب ہے حضرت عثمان کا معیار پر پورا اترنا یا معیار کو قائم رکھنا تو درکنار انتخاب کے وقت روزِ اول سے اس معیارِ مطلوب کو سرے سے نظر انداز کیا گیا تھا چنانچہ مودودی صاحب اس سے پہلے حضرت عبداللہ بن عباس سے تبادلہ خیالات کرتے ہوئے حضرت عثمان کے بارے میں حضرت عمر کے الفاظِ نقل کر چکے ہیں

”اگر میں ان کو اپنا جانشین تجویز کروں تو وہ بنی معیط (بنی امیہ) کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانیاں کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں نے ایسا کیا تو عثمان بھی کریں گے اور اگر عثمان نے یہ کیا تو لوگ ضرور معصیتوں کا ارتکاب کریں گے اور عوام شورش برپا کر کے عثمان کو قتل کر دیں گے اسی چیز کا خیال ان کو اپنی وفات کے وقت بھی تھا۔“

حاشیہ پر قلمراز ہیں۔

بعض لوگ اس جگہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا حضرت عمر کو الہام ہوا تھا جس کی بنا پر انہوں نے قسم کھا کر وہ بات کہی جو بعد میں جوں کی توں پیش آگئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک صاحب بصیرت آدمی بسا اوقات حالات کو دیکھ کر جب انہیں منطقی طریقہ سے ترتیب دیتا ہے تو اسے آئندہ رونما ہونے والے نتائج دو اور دو چار کی طرح نظر آنے لگتے ہیں اور وہ الہام کے بغیر اپنی بصیرت ہی کی بنا پر ایک صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کو شوروی کمپنی میں نامزد کرتے ہوئے ان کے اندر معیارِ مطلوب کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور بعض خاص جذبات ہی اس کے محرک تھے ورنہ اگر امت کی بہتری اور اسلامی مہبودی کا جذبہ اور خلوص دل میں ہوتا تو پوری امت کو آنے والے خطرات کے منہ میں نہ دھکیل دیا گیا ہوتا اور ایسے خطرناک شخص کے لئے اقتدار کا رستہ ہموار نہ کیا جاتا پس حضرت عثمان کے لئے نہ معیار کا لحاظ رکھا گیا اور نہ وہ معیارِ مطلوب پر پورے اترے اس کا قائم رکھنا تو درکنار اور ذرا اسلام کے اصولِ حکمرانی کو خلفاء کے کردار سے تطبیق دیکھئے اور مودودی صاحب کو تحقیق و انصاف کی داد دیجئے۔ چوتھے قاعدے کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ حکومت اور اس کے اختیارات و اموال - اللہ کی اور مسلمانوں کی امانت ہیں لیکن حضرت عمر اللہ کی اور مسلمانوں کی امانت کو ایسے شخص کے حوالے کر رہے ہیں جن کے متعلق بطور پیشین گوئی کے کہہ رہے ہیں کہ اس کا مال خدا کی نافرمانی ہوگا اور ان کو پورا خطر تھا کہ کنبہ پروردہ کرتے ہوئے عدل و انصاف کے تقاضوں کو نظر انداز کریں گے۔ لیکن ساتویں خصوصیت مروج جمہوریت کو بیان کر کے آخر میں بیانِ دہل یہ بھی کہہ گزرے کہ خلافت راشدہ کا یہ دور ایک

روشنی کا مینار تھا، ص ۲۱۱ یہ ہے آبائی کورانہ تقلید کا روح فرسائیت پر۔

انصاف کا تقاضا

واقعات و حقائق کا منصفانہ جائزہ لینے کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد فوراً ہی اقتدار کی طرف للچائی ہوئی نظریں اٹھیں اور موقع غنیمت جان کر فرضی الیکشنی بورڈ تجویز کر کے خلافت سازی کے معاملہ میں عجلت کی گئی اور من مانی کاروائی کر گزرنے کے بعد اسے شرعی حیثیت دے دی گئی پس بیان کردہ آئین اسلامی کے ماتحت نہ پہلی خلافت منعقد ہوئی اور نہ اس کے انعقاد کے وقت کسی معیار کا لحاظ رکھا گیا چنانچہ بروایت ابن قتیبہ دینوری سرکاری وکیل حضرت عبیدہ بن جراح نے حضرت علیؑ کے اعتراض کی مقبولیت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا کہ واقعی معیار خلافت آپ (حضرت علیؑ) میں موجود ہے۔ لیکن آپ بزرگان قوم کے اقتدار کو اب چیلنج نہ کریں اگر وقت نے ساتھ دیا تو آپ کا بھی نمبر آجائے گا۔

جس طرح پہلی خلافت میں معیار کو ملحوظ نہ رکھا گیا تھا اسی طرح دوسری خلافت کے انعقاد کا مسئلہ ہے کہ خلیفہ اول نے بار احسان سے سبکدوش ہونے کے لئے حضرت عمر کو نامزد کر دیا اور اپنے اقتدار کے سایہ میں لوگوں سے ہاں کرائی جس طرح بعد میں معاویہ نے اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے یزید کو مسلمانوں کی گردنوں پر سوار کر دیا لیکن معاویہ کے فعل کو ملکیت سے تعبیر کیا گیا اور عمر کی خلافت کو راشدہ کا نام دے دیا گیا اگرچہ طریق کار میں ذرا بھر فرق نہیں ہے۔

جہلا جو مودودی صاحب کا تیسری خلافت کے بارے میں ان کا اس قدر تسلیم کر لینا کہ وہ معیارِ مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے بھی غنیمت ہے کاش! ان کی تحقیق پسندی۔ آبائی تقلید کا جوا گردن سے اتار چیلنے کی جرأت کر سکتی تو انہیں کہنا پڑتا اور اپنی ہی تحقیق کی روشنی میں انہیں اعتراف کرنا پڑتا کہ ان میں سے کسی کے انتخاب کے وقت نہ کسی آئین اسلامی کا لحاظ رکھا گیا اور نہ معیارِ مطلوب کی پاس کی گئی تھی بلکہ اقتدار ان کے ہاتھ میں آیا اور اقتدار پر وہ قابض ہو گئے۔ بعد والوں نے ان کے فعل کو آئین اسلامی کا نام دینا شروع کر دیا اور ان کے ہر عمل کو شرعی حیثیت دے دی گئی جس طرح ہر جتنے والے کی ہر دھاندلی کو خوشامد پرست اور حکومت نواز جماعت جائز ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کی کرتی ہے پس وہ مسلمانوں کے سیاسی قائد تھے اور یکے بعد دیگرے مسلمان حکمران تھے اس سے آگے بڑھنا انصاف کا خون کرنا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام ان کے اُردار حکومت میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے رہے اور ان

کی صلاحیتوں کو چھپانے کی خاطر برسرِ اقتدار جماعت نے کبھی ان کو حکومتی کاموں میں داخل دینے کا موقع تک نہ دیا اور دور رسالت میں ان کے سپاہیانہ خدمات اور فوجی تجربات عیاں راجہ بیان کے بعد ان تھے لیکن تینوں حکومتوں میں دیدہ وائل تھے ان کو نظر انداز کر دیا گیا تاکہ ان کا استحقاق خلافت منظرِ عام پر نہ آ سکے۔ اور تو اور حضرت علی کی مسئلہ قرآن و فہمی کا علم رکھنے کے باوجود جب خلیفہ ثالث نے جمع قرآن کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل کی تو اس میں حضرت علی کو شامل کرنے کی تجویز نہ کی گئی اور جن لوگوں کو مامور کیا گیا وہ یقیناً بدرجہا حضرت علی سے کم پایہ رکھتے تھے۔ ان اور دیگر اس قسم کے روح فرسا واقعات وحقائق سے نتیجہ نہ اخذ کرنا اور آبائی کورائے تقلید کے زیر سایہ تحقیق و انصاف کی گردن پر ٹھہری پھیرتے ہوئے دعویٰ کرنا خلافت راشدہ کا یہ دور ایک روشنی کا مینار تھا ا دیدہ دلیری کے سوا اور کچھ نہیں۔ حضرت عثمان کی بدعنوانیوں کی طویل فہرست گنوانے کے بعد اور خلافت کے معیارِ مطلوب کو قائم نہ رکھنے کا اعتراف کرنے کے باوجود بھی خلافت راشدہ کے دائرہ میں اسے جگہ دینا تحقیق کا فیصلہ نہیں بلکہ تقلید کا وبال ہے جو حلق میں پھنسے ہوئے لقمے کی طرح نہ نگلا جا سکتا ہے اور نہ اگلا جا سکتا ہے اصولِ محمدانی میں نویں نمبر پر امر بالمعروف کے ذیل میں فرماتے ہیں۔ معاشرے کے ہر فرد کا فرض ہے کہ مملکت میں جہاں بھی غلط اور ناروا کام ہوتے نظر آئیں ان کو روکنے میں اپنی مدد تک پوری کوشش کرے۔ اس کے پیش نظر حضرت عثمان کی اوقیانوسی کے افسوسناک دور میں مسلم معاشرے پر فہرستِ عائد ہوتا تھا کہ حکومت کی غلط اور ناجائز پالیسی کو بدلنے میں حتی الامکان کوشش کریں چنانچہ جب حضرت عثمان کو سمجھانے اور معاملہ کو سلجھانے کی تمام تر کوششیں رائیساں اور بے اثر ثابت ہوئیں۔ اور بقول مورخین صاحب کے حضرت عائشہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر بھی ان کی اصلاح سے مایوس ہو گئے۔ ۲۳ اور بقول ان کے پورے مدینہ کی آبادی میں سوائے چار آدمیوں کے ان کا ہمنوا کوئی نہ تھا۔ ۲۴۔ تو ایسے حالات میں مسلم معاشرہ و پرفہرست تھا کہ ایسی حکومت کا تختہ الٹ دیں چنانچہ ابولہب اور کوفیوں نے نہیں بلکہ اہل مدینہ نے اور شورش یوں نے نہیں بلکہ صحابہ اور صحابہ زادوں نے تنگ آکر خلیفہ کے قتل کا منصوبہ بنایا اور ان میں بہت پیش خلیفہ اول حضرت ابوبکر کے صاحبزادے حضرت محمد بن ابی بکر مدینہ کے رہنے والے تھے اور ساتھ حضرت محمد بن حنفیہ غزالی صحابی رسول تھے جو مدینہ میں ہی سکونت پذیر تھے یہ گناہ شورش یوں نے قتل کر دیا واقعات وحقائق کا منہ چرانا ہے باہر سے آنے والے تو اپنے آپ پر مستادِ ظالم اموی حکام کے استبدادی دلیوں سے تنگ آکر دارالحکومت سے اونٹواہی کے لئے مدینہ ہوئے تھے جب اہل مدینہ کی پوری کوششوں کے باوجود ناکامی ہوئی اور خلیفہ نے اپنے دو چکر کو بولنے

سے انکار کر دیا تو مذکورہ بالا مدینہ کے مقتدر لوگوں نے خود ہی ان کو موت کے گھاٹ اتار کر مسلمانوں کی گردنوں سے اوراق نواز حکومت کا جوا اتار پھینکا۔

تمام اہل مدینہ کے نزدیک یہ قتل حق بجانب تھا سوائے ان لوگوں کے جو اقتدار کی ہوس میں حضرت علی سے انتقام کا دعویٰ لے کر اٹھے۔ اور اہل بصرہ سے جا کر انتقام لے لیا۔ ان کا مقصد صرف مملکت میں انتشار پھیل کر حضرت علی سے اقتدار چھیننا تھا ورنہ مارنے والے صحابی اور صحابی زادے مدینہ میں ہی تھے اگر مبتہتی تو وہیں ان سے انتقام لیا جاتا یا حضرت علی سے ہی انتقام لینا تھا تو مدینہ میں ہی یہ آواز اٹھائی جاتی اس کا ابہرہ سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اسی طرح جنگ بل کے بعد جنگ صفین اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ معاویہ نے جب دیکھا کہ طلحہ و زبیر حضرت علی سے اقتدار چھیننے میں ناکام رہے ہیں تو اس نے علوی بغاوت کھڑا کر لیا اور خون عثمان کا انتقام بہاؤ بنا لیا تاکہ اقتدار ہاتھ میں آجائے۔ اور یہ مطالب اقتدار ملک میں انتشار پھیل کر ہی لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا کرتا ہے۔

اہل مدینہ کے نزدیک قتل عثمان کوئی بُرم نہ تھا بلکہ مسلم معاشرہ کی فلاح کا راز اسی میں ہی مضمر تھا اس لئے اہل مدینہ میں سے کسی نے بھی خلیفہ مقتول کا نہ سوگ منایا اور نہ ان کا جنازہ پڑھنے اٹھانے اور دفن کرنے میں انہوں نے شرکت کی حتیٰ کہ حضرت علی علیہ السلام نے اقتدار سنبھالنے کے بعد ہی نہ مقتول خلیفہ کے پس ماندگان کو پیغام تعزیت بھیجا اور نہ کبھی ان کے قاتلوں کے فعل کو ناجائز ٹھہرایا بنا بریں حضرت علی کے نزدیک قاتلین عثمان بُرم کے مترشح نہ تھے بلکہ انہوں نے ایک صحیح قدم اٹھایا تھا پس حضرت علی کا ان سے بدلہ لینا ملک ان کو حمد سے مناسب دے کر ان کی عوصلہ افزائی کرنا بالکل درست اور بجا اقدام تھا جناب مولود می صاحب مدت آبادی تعلیم کے پیش نظر ہی حضرت علیؑ کے اس اقدام کو غلطی سے تعبیر کرتے ہیں ورنہ اگر اس گرد کو تحقیق و انصاف کے نائنوں سے کھولتے تو اس الجھن میں نہ پڑتے اور نہ ان کو بطالم و مظلوم اور قاتل و مقتول دونوں کو رضی اللہ عنہما کہنے کی ضرورت ہوتی بلکہ حق کو حق سمجھ کر اس کو سینے سے لگا لیتے اور غلط کو غلط جان کر اس سے الگ ہو جاتے

امامت اور فرقہ امامیہ (شیعیان علیؑ)

سب تصویر کاغذ پر اترنے دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ جمہوریت کے مفاد میں امامت کا طرز عمل کیا ہے اور اس بارے میں فرقہ امامیہ (شیعیان علیؑ) کے عقائد کیا ہیں؟ امامت ایک دینی منصب ہے اور نہ الٰہی حمد و ثناء ہے اور یہ الٰہی شرف سے حاصل نہیں ہو سکتا

بے شک الیکشن حبیت کر انسان بادشاہ و حکمران بن سکتا ہے لیکن امام نہیں بن سکتا جب تک کہ خدا کی جانب سے پیغمبر کی زبانی اس پر نص نہ جو بنا بریں شیعیان علی کا یہ عقیدہ ہے کہ رسالت مآب کے بعد امام منصوب حضرت علی علیہ السلام ہیں جن کی نامزدگی کا اعلان جناب رسالت مآب نے ختم غدیر کے مقام پر ایک لاکھ سے زیادہ کے مجمع میں فرمایا تھا اور یہ حدیث بالتواتر تمام معتبر تفاسیر میں منقول ہے اور اس کے بعد ہر سابق امام بعد والے امام کو نامزد کرتا رہا۔

۲۔ امامت ایک معیاری عہدہ ہے جس طرح نبی کا بنانا انسانوں کا کام نہیں اسی طرح کسی نبی کے جانشین امام کی تعیین بھی امت کے اختیار میں نہیں ہے اور اللہ ایسے افراد کو نامزد نہیں فرماتا جو معیار سے گرے ہوئے ہوں اور شیعیان علی کا یہ عقیدہ ہے۔

۳۔ امامت کے لئے ضروری نہیں کہ الیکشن میں اس کی حبیت بھی ہو۔ دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا نے فرمایا اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا میں تجھے لوگوں کا امام بناتا ہوں اگر عوامی سطح پر اس زمانہ میں الیکشن ہوتا تو یقیناً ابانی تقلید میں غیر اللہ کے پجاری حضرت ابراہیم کے بجائے مروہی کو ووٹ دیتے اور وہی کامیاب ہوتا بلکہ عملی طور پر وہی کامیاب ہو گیا تاہم خدائی جانب سے حضرت ابراہیم کی امامت پر کوئی بڑا اثر نہ پڑا وہ ویسے کے ویسے امام ہی رہے اسی بنا پر شیعوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی خدا کی جانب سے باعلان پیغمبر امام خالق تھے اگرچہ ظاہری اقتدار دوسروں کے ہاتھوں میں تھا اور اس سے حضرت علی کی امامت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

۴۔ امامت کا عہدہ خدا اُسی کو دیتا ہے جس سے غلطی نہ ہو لہذا شیعوں کو لیب پوت کر کے دامن امام کو محفوظ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

۵۔ خدا اس کو امامت کا عہدہ دیتا ہے جو باقی لوگوں سے صفات و کمالات میں افضل و اکمل ہو ورنہ ترجیح مرجوح لازم آئے گی۔ اور عقلاً محال ہے کہ اللہ افضل کو مفصل کی اطاعت پر مامور کرے کیونکہ یقیناً یہ فعل قبیح ہے اور اللہ افضل قبیح سے بالاتر ہے اور شیعیان علی کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب سالت مآب کے بعد حضرت علی تمام امت سے افضل ہیں اور آیت مباہلہ میں علی کو انفس رسول کہنا علی کی افضلیت پر دلیل قاطع ہے۔

۶۔ چونکہ رسول اللہ کے بعد عہدہ امامت نیابت رسول کا عہدہ ہے جس کی نامزدگی اللہ کے سپرد ہے تو جس طرح نبی غیر معصوم نہیں ہو سکتا اسی طرح امام بھی غیر معصوم نہیں ہو سکتا اور اہل سنت کے امام غیر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ خدا کی طرف سے جس شخص کی اطاعت مطلق

کا حکم ہو اُسے معصوم ہونا چاہیے پس یا تو خلیفہ کی اطاعت کو شرعی حیثیت نہ دی جائے بلکہ دنیاوی حکمرانوں کی طرح اس کی اطاعت بھی تمدن انسانی اور سپہن کو برقرار رکھنے کے لئے فرض سمجھی جائے تو ایسی صورت میں اس کی عصمت کا عقیدہ بھی غیر لازم ہے لیکن اگر خلیفہ کی اطاعت کو خدا اور رسول کی اطاعت کی طرح شرعی حیثیت دی جائے یعنی اس کی اطاعت واجب اور اس کی نافرمانی حرام ہو تو ضروری ہے کہ وہ معصوم ہو اور اس سے غلطی کے صدور کا امکان نہ ہو ورنہ اس کے غلط کار ہو سکی صورت میں اس کے غلط احکام میں بھی اس کی اطاعت واجب ہوگی اور خدا غلط و ناجائز احکام میں کسی کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا آیت مجیدہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ** (سورہ نساء آیت ۵۹) کی تفسیر میں امام فخر الدین رازی نے کہا ہے چونکہ آیت میں اولوالامر کی اطاعت کا حکم مطلق ہے لہذا اولوالامر کا آیت کی رو سے معصوم ہونا ضروری ہے اور خداوند کریم نے جہاں کہیں غیر معصوم کی اطاعت کا حکم دیا ہے وہاں ناجائز امور میں ان کی اطاعت کو مستثنا قرار دیا ہے چنانچہ اس نے والدین کی اطاعت کا حکم دیا لیکن یہ استثناء بھی ساتھ ذکر کیا کہ اگر وہ شرک کا حکم دیں تو ان کی اس بارے میں اطاعت نہ کرو۔ آیت مجیدہ میں رسول اللہ کی اطاعت کی طرح اولوالامر کی اطاعت کا حکم مطلق ہے اور اس میں استثناء کوئی نہیں تو صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ کی طرح اولوالامر کو بھی معصوم ہونا چاہیے جس شخص کی اطاعت اللہ کی طرف سے واجب ہو اگر وہ معصوم نہ ہو تو مستند جہانگیر میں لازم آئیں گی۔

۱۔ سبب و ذرہ غلط کار ہوگا تو دوسرے غلط انسانوں کے لئے اس کی اطاعت کا حکم خلاف صحت ہونے کے علاوہ ترجیح بلا مرجع ہوگی اور خدا اس قبح سے مبرا ہے۔

۲۔ غیر معصوم ہونے کی صورت میں اس کی یہ تائید اسود حسنہ ہوگی اور نہ اس کا اور واجب الاتقیاء ہوگا۔

۳۔ اس کی سہ بات میں مہوٹ یا غلطی کا امکان رہے گا لہذا وہیں پر اس کا قول اثر انداز نہ ہوگا۔

۴۔ غلطی نہ ہونے کی صورت میں دلوں سے اس کا قائل نہ ہو جائے گا پس اس کا اللہ کی جانب سے حاکم ہونا مضحکہ خیز ہوگا۔

۵۔ اگر کہہ کر ہوگا تو دیا گیا کہ باہمی تھوڑی سی فیصلہ کے لئے اس سے عمل و انصاف کی نصیحت نہ دینے کی پس ایسے شخص کو لوگوں پر سطا کرنا اور اس پر سطا کرنا کے خلاف ہوگا۔

۶۔ خدا کی جانب سے متعین کردہ الٰہی نصیحت بن پر میں سے لوگوں کو منع کرنا ہے یا جیسا کہ حکم دینا

ہے۔ اس پر واجب ہے کہ پہلے خود انہی امور کا پابند ہو اور اس کا کردار مثالی ہو ورنہ اس کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

بہر حال نبی کے جانشین میں عصمت کا ہونا ضروری ہے ورنہ اس کا قول و فعل امت کے لئے شرعی حیثیت سے حجت نہ ہو سکے گا مثال کے طور پر اگر حضرت عمر معصوم ہوتے تو حضرت عثمان پر ان کی نصیحت و وصیت پر عمل کرنا شرعی اعتبار سے واجب ہوتا اور اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں وہ خود استحقاق خلافت سے گرجاتے اور اقتدار سے الگ ہو جاتے پس اس خون خرابے کی نوبت آتی اور نہ مودودی صاحب کو یہ کہنے کی ضرورت پڑتی کہ حضرت عثمان کے لئے حضرت عمر کی وصیت پر عمل کرنا شرعی حیثیت سے واجب نہ تھا۔ ص ۳۲۲۔

۴۔ امام میں چونکہ معصوم ہونا ضروری ہے لہذا وہ خدائی احکام کے تابع ہوگا۔ اور شیعیان علی کا یہ عقیدہ ہے امام نہ فاسق و ظالم بن سکتا ہے نہ رہ سکتا ہے اور نماز میں صرف اس شخص کے پیچھے اقتداء جائز ہے جو ظاہری لحاظ سے نیک ہو۔ بدکردار ظالم و فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز ہے سوائے تقیہ کی صورت کے (جہاں جان مال و عزت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو وہاں بنیت فراہمی فاسق پیشماز کے پیچھے نماز ادا کی جاسکتی ہے) چنانچہ شیعیان علی سلاطین زمانہ کے مقرر کردہ حکام کے ساتھ اس طرح ہی گزارا کرتے رہے ہیں بلکہ ائمہ طاہرین علیہم السلام بھی اسی قسم کی زندگی میں بے بس رہے ہیں۔

قیادت

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں مسلمانوں کی ہر حیثیت سے

قیادت کا مرکز حضور کی ہی ذات تھی جہاں آپ اللہ کے دین کے بانی مبلغ و محافظ

تھے وہاں مملکت اسلامیہ کے اندرونی نظم و نسق اور بیرونی توسیع و تحفظ کے ذمہ دار بھی خود تھے آپ تعلیم قرآن و تزکیہ نفوس کے لحاظ سے جہاں مسلمانوں کے سروں پر ابر رحمت بن کے چھائے ہوئے تھے وہاں فوجی نظم و ضبط اور جنگی محاذوں میں سربراہی کے فرائض انجام دیتے ہوئے دشمنان اسلام کے سروں پر برق قمر و غضب گرانے میں خود بنفس نفیس سالاری لشکر کے فرائض بھی سنبھالتے تھے گویا داخلی و خارجی امور مملکت کی انچارج آپ ہی کی ذات تھی۔ اور جس طرح اسلامی ضابطہ حیات سیاسی و دینی ہر دو پہلوؤں پر حاوی ہے اسی طرح آپ کی قیادت بھی ہر پہلو کے لحاظ سے جامع تھی۔

جب آپ کی رحلت ہوئی تو ابھی آپ کا جنازہ گھر ہی میں تھا کہ سیاسی قیادت کے شعبہ میں سربراہی حاصل کرنے کے لئے سقیفہ بنی ساعدہ میں اجتماع ہوا اور جنگ اقتدار شروع ہو گئی۔ پس حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کا اچانک نام پیش کر کے رائے عامہ کو ہموار کئے بغیر اس کی بیعت بھی کر لی پھر ان

کی مخصوص جماعت نے فوراً ان کی اتباع کی اور عوام پر بعد میں یہ بیعت مسلط کر دی گئی۔ انصاری امیر دار سعد بن عبادہ کو بُری طرح نکال دیا گیا اور اس "اسلامی کاروائی" کا مسجد نبوی میں باقاعدہ اعلان کر دیا گیا حضرت علی نے اتمامِ حجت کے طور پر احتجاج کیا لیکن اس کو ٹھکرا دیا گیا اور اس رُوح فرسا داستان کو ابنِ قتیبہ دینوری نے اپنی کتاب الامامة والسياسة میں درج کیا ہے جو منصف مزاج انسان کے لئے حقیقت کی نشان دہی کے لئے کافی ہے۔ حضرت علی اور ان کی عقیدت مند جماعت "جو بقول مودودی صاحب ابتداءً شیعیان علی کہلاتے تھے، نے ایک دن کے لئے بھی ان کی اس قیادت کو دینی قیادت کا نام نہ دیا اور نہ اس حکومت کو اسلامی حکومت اُنہوں نے تسلیم کیا بلکہ حضرت علی علیہ السلام نے قنفذ غلام کو جو سرکاری نمائندہ کی حیثیت سے بلانے آیا تھا حضرت ابو بکر کے لئے خلیفہ رسول اور امیر المومنین کے القاب استعمال کرنے سے بھی روک دیا تھا لیکن بدلے ہوئے حالات نے حضرت علی کو خاموش زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا اور آپ کے شیعیان بھی آپ کی تاسی میں چپ ہو کر بیٹھ گئے بہر حال ہونے والے خلفاء نے سیاسی میدان حبت لیا اور اقتدار پر قابض ہو گئے لیکن وہ ان لوگوں کے دلوں کو نہ جیت سکے تاکہ یہ لوگ ان کو اپنے دین کا امام بھی مان لیتے۔ سیاسی قیادت کے بارے میں مودودی صاحب رقمطراز ہیں۔

سیاسی قیادت

ایک حد سیاسی قیادت کا تھا جسے طاقت سے بادشاہوں نے حاصل کر لیا تھا اور چونکہ اسے نہ طاقت کے بغیر ٹھایا جاسکتا تھا اور نہ سیاسی قیادت بغیر طاقت کے ممکن ہی تھی۔ اس لئے اُمت نے بادل ناخواستہ اُسے قبول کر لیا۔ یہ قیادت کافر نہ تھی کہ اسے رد کر دینے کے سوا چارہ نہ ہوتا اس کے چلانے والے مسلمان تھے جو اسلام اور اس کے قانون کو مانتے تھے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے حجت۔ ہونے کا انہوں نے کبھی انکار نہ کیا تھا۔ عام معاملات ان کی حکومت میں شریعت ہی کے مطابق انجام پاتے تھے۔ صرف ان کی سیاست دین کے تابع نہ تھی اور اس کی خاطر وہ اسلام کے اصولِ حکمرانی سے ہٹ گئے تھے اس لئے اُمت نے ان کی سیاسی قیادت اس حد تک قبول کر لی کہ ان کے تحت مملکت کا نظام چلتا رہے امن و امان قائم رہے، سرحدوں کی حفاظت جوتی رہے۔ اعدائے دین سے جہاد ہوتا رہے۔ جمعہ جماعت و حج قائم ہوتا رہے اور عدالتوں کے ذریعے سے اسلامی قوانین کا اجرا برقرار رہے ان مقاصد کے لئے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین نے اگر اس قیادت کی بیعت کی تو وہ اس معنی میں نہ تھی کہ وہ اس امر واقعی کو تسلیم کرتے تھے کہ اب امت کی سیاسی قیادت کے مالک یہی لوگ

ہیں۔ حصہ ۲۰۲۔

نظارہ ہی اقتدار کے زمانہ سے پہلے بعینہ اسی طرح حضرت علی اور آپ کے شیعوں اور نظارہ ہی اقتدار سے دست بردار ہونے کے بعد امام حسن اور ان کے شیعوں اور شہادت عظمیٰ امام حسین علیہ السلام کے بعد تمام آئمہ اور ان کے شیعوں کا سلاطین وقت کے تحت زندگی کا دستور ہی رہا۔

حضرت امام حسین کا بروقت اقدام | حضرت امام حسین علیہ السلام کے زمانہ میں جب اقتدار کی باگ ڈور یزید بن معاویہ نے سنبھالی تو یہ شخص چونکہ

اعلامیہ فاسق تھا اور سیاسی حکمرانوں میں یہ دستور پہلے سے چلا آ رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خلیفہ و نائب رسول جی کہلاتے تھے اگرچہ حضرت علی اور ان کے شیعوں نے ان کی دینی سربراہی کو کبھی قبول نہیں کیا لیکن عوام الناس کے لئے اقتدار اور دین دونوں کو لازم و ملزوم ثابت کیا جا رہا تھا اور جمہور اہل اسلام نے تعلیمات اسلامیہ کو ایسا لچکا رہ بنا رکھا تھا کہ وہ ہر سلطان وقت کے احکام کو انعام خداوندی سمجھنے لگے تھے۔ اور ان کے خلاف آواز اٹھانا ان کے نزدیک دین کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے مترادف تھا۔ پس امام حسین علیہ السلام اس صورت حال سے پوری طرح واقف تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ان حالات میں خاموشی رفتہ رفتہ دین اسلام کی نظاہر ہی شکل کو بھی مسخ کر کے رہے گی اور باقی ماندہ صحابہ میں یہ جرات ہی نہ تھی کہ وہ خلیفہ کہلائے والے کے کردار کے خلاف لب کشائی کر سکیں۔ پس امام حسین نے دین اسلام کی آبرو کی مخالفت کی خاطر آواز حق بلند کی اور حقیقی اسلام کا مجتہد ابھرنے لگے کہ میں ان میں شکل کھڑے ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب معاویہ کے حکم سے ہر شہر و دیہات میں یہ تقریب کے موقع پر ہر جمعہ اور ہر عید کے خطبات میں بلکہ نجی مجالس و محافل میں بھی حضرت علی اور ان کے شیعوں پر مست و شتم کی بوچھاڑ ہوتی تھی اور لوگ خوشنودی خدا سمجھ کر اور راستہ دین کا اہم کردار سمجھ کر ثواب کے لئے بجالاتے تھے۔ اور یقیناً اگر امام حسین علیہ السلام خاموش رہتے تو آئندہ اسلام میں خراب فتنہ گشت سے بچاؤ نہ ہو سکتی۔ اور یہی طریقہ بدیشہ کے لئے اسلام کا رکن بن جاتا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی پہلی خداستہ حق پر اگرچہ بہت سوں نے ہاتھ بندھنے اور کوفہ کی طرف سے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے نصرت کا وعدہ کیا اور ہر ممکن قربانی کی پیش کش کی لیکن وقت جوں جوں قریب آ گیا، دست تعاون بٹھانے والوں میں غیر معمولی کمی واقع ہوتی گئی اسی دوران میں واقعات کی ناکت کا جائزہ لے کر یزید نے حبیب اللہ بن زیاد کو کوفہ کی گود میں کا موم دیا۔ اس نے وہاں کوفہ پر قبضہ کر کے جامع مسجد کوفہ میں ایک مسجد بنوایا تو بن لوگوں نے اس کے باپ

”ولد الحرام“ کی گورنری کے دوران میں کوفہ کے شیعان علی پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھے تھے وہ ان کا تصور کر کے لرز اُٹھے پس امام حسین علیہ السلام کے ساتھ وفاداری کا عہد توڑ کر حکومتِ وقت کے ہمنوا ہو گئے اور مذہبِ اقتدار کو قبول کر کے ظلم و استبداد کی چکی میں اپنے سے بچاؤ کا سامان مہیا کر بیٹھے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے اگر یہ اقدام کیا ہوتا تو یقیناً بدلے ہوئے حالات میں وہ بھی ہاتھ پر ہاتھ دھڑکے بیٹھ جاتے اور حکومتِ وقت کو اپنی وفاداری کی یقین دہانی کرا دیتے لیکن وہ چونکہ حق و باطل، دین و سیاست بلکہ امامت اور جمہوری اقتدار کے درمیان امتیاز کا ایک مضبوط حصہ تعمیر کرنا چاہتے تھے تاکہ خلافتِ نبویہ کے نام سے موسوم ہونے والی حکومتوں کے زیر سایہ روز افزوں بد سے بدتر ہونے والے حالات میں دین اسلام شاہانِ وقت کا کھلونا نہ بن جائے وہ چاہتے تھے کہ لوگوں کو ایک مرتبہ اس بات کی سمجھ آجائے کہ دین الگ چیز ہے اور اقتدار الگ چیز ہے نیز امامت اور چیز ہے اور ملکیت اور چیز ہے۔

جناب رسالت مآب کے بعد سے اب تک مسلمان اسلامی تعلیمات سے تدریجاً بیگانہ ہوتے ہوئے بہت دُور نکل چکے تھے اور اقتدار کے سائے میں اپنی کھوئی ہوئی دولتِ اسلام اور اخلاق و کردار کی پاکیزگی کے فقدان کے احساس سے بھی وہ غافل ہو چکے تھے اب ان کو اس طویل غفلت سے متنبہ کرنے اور بے حسی کی گہری نیند سے جگانے کے لئے ایک بہت بڑے دھماکے کی ضرورت تھی پس امام حسین علیہ السلام کا بالکل قلیلِ جاعت کے ساتھ خراسان سے لے کر شمالی افریقہ تک اور عدن سے لے کر اُنڈیس تک کی لمبی چوڑی مملکت کے مطلق العنان حکمران کو لٹکانا اور ان کے خلاف علمِ بلند کرنا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا جس نے مسلمانوں کو بالعموم حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کے لئے دعوتِ فکر دی اور واقعہ شہادت کے بعد خاندانِ رسالت کی دربد تشہیر نے اس تحریک کو مزید کامیابی سے ہمکنار کر دیا اور ایک بار خوابِ رفتہ ملت کو ان واقعات و حالات نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا دیا اور اُس وقت تک جن لوگوں نے امامت اور ملکیت کے درمیان فرق معلوم کرنے کی کوشش نہ کی تھی یا نہ کر سکے تھے وہ اس واقعہ عظیمی کے بعد سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ حق پر کون اور باطل پر کون اُترنا کیا چیز ہے اور جمہوریت کیا ہے؟ اور مودودی صاحب نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے جیسا کہ ص ۶۲ پر خلافت و ملکیت کے ص ۲ کے حوالہ سے گزر چکا ہے۔

اور اس میں شک نہیں کہ واقعہ کربلا کے بعد آنے والی حکومتوں کے دلوں میں بھی یہ احساس شدت سے پیدا ہوتا رہا کہ شیعانِ علی کا مسلک جمہورِ اہل اسلام کے مسلک سے الگ ہے اور ان کے عقیدہ میں

امامت الگ چیز ہے اور جمہوریت سے قائم ہونے والی خلافت الگ چیز ہے اور انہیں یہ بات روز روشن کی طرح معلوم ہو گئی کہ ان کے نزدیک دینی قیادت کی علمبردار امامت ہے اور سیاسی قیادت کی علمبردار حکومت وقت ہے اور یہ کہ سیاسی قیادت اگر دینی قیادت کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرے تو وہ سر دھڑکی بازی لگا کر اپنی دینی قیادت کی استقلالی حیثیت کو ختم نہ کر سکتے ہیں اور نہ وہ جمہور اہل اسلام میں جذب ہونا جانتے ہیں جن کا مذہب اقتدار کے تابع ہو بلکہ شیعیان علی وہ ہیں جو اقتدار کو مذہب پر قربان کرنا جانتے ہیں لیکن کئی قمیت پر مذہب کو اقتدار کی بحیثیت نہیں چڑھا سکتے۔

اور یہ امر حقیقت ہے کہ واقعہ کر بلا تاریخ اسلام میں ایسا نہ ہو دست المیہ تھا جس پر بعد میں پردہ ڈال کسی حکومت کے بس میں نہ رہا جہاں سرکاری حکم کے ساتھ مجلس و وعظ میں حضرت علیؑ کی اور ان کے شیعوں پر سب و ستم ایک سنت بن چکا تھا وہاں اس واقعہ کے بعد لوگ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ حق پر کون تھا اور باطل پر کون؟ اور یہ کہ اسلام صرف پر اقتدار پارٹی کی ہاں میں ہاں ملائے کا نام ہے یا اس کی استقلالی حیثیت کچھ اور بھی ہے؟ اور سچ ہے کہ جمہور اہل اسلام کے دانشور طبقہ کی بھی اس واقعہ کے بعد آنکھ کھلی کہ خلافت کچھ اور ہے اور اقتدار کچھ اور ہے چنانچہ انہوں نے یہاں پہنچ کر قیادت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا کہ دینی قیادت الگ ہے اور سیاسی قیادت الگ ہے جیسا کہ مودودی صاحب نے ظاہر کیا ہے۔

مسلطین سے بے نیازی اور ان کے قہر و غضب کے مقابلہ میں ثابت قدمی مسلمانوں کے انسانی قیادت کی اہمیت کا معیار بن گئی تھی اس معیار سے بہت کر اگر کوئی امت کا بندہ چلا تو قوم بڑی بڑی گماہوں سے اس کا جائزہ لیتی رہی اور اس کی بندگی کو اس نے صرف اس وقت تسلیم کیا جب سلطان کے قریب جاکر بھی اس نے دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت نہ کی۔ ص ۳۳

اور آگے چل کر سمجھتے ہیں اسی طرح پہلی صدی کے وسط ہی سے دینی قیادت کا راستہ سیاسی قیادت کے راستے سے الگ ہو چکا تھا۔

بہر حال شیعیان علیؑ تو پہلے ان سے ہی دینی قیادت اور سیاسی قیادت کے دو راستوں میں فسوق معلوم کر چکے تھے لیکن کثرت اقتدار کی زد میں نہ آئے اور امام حسین علیہ السلام کی شہادت عظمیٰ نے جہاں شیعیان علیؑ کے ایمان میں جلائے نو بخشیں اور انہیں باطل کے سامنے نہ بننے کے بجائے اجڑنا سکھایا اور حق پر قائم رہنا سکھایا اور موت کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر خود اعتمادی کا جذبہ تسلیم کیا وہاں جمہور اہل اسلام کو بھی

دعوتِ فکر دی کہ دینی قیادت اور سیاسی قیادت دورستے ہیں بلکہ پورے ادیانِ عالم کے سربراہوں کے لئے باطل سے کھولینے کی راہیں ہموار کر دیں یا یوں سمجھیے کہ پوری انسانیت کو انسانِ نادرندوں کی سخت گرفت سے بچنے کے لئے قربانیاں دے کر اور مظالم برداشت کر کے راہِ نجات کی نشان دہی کی جو رتی دنیا تک انسانیت سے خراجِ تحسین لیتی رہے گی۔

دینی قیادت ابتدائی دور میں دینی قیادت اور سیاسی قیادت میں فرق کرنا اس لئے بھی مشکل تھا کہ اہل اسلام کی اکثریت جناب رسالت مآب کی تربیت یافتہ ہونے کی حیثیت سے کم و بیش مسائلِ ضروریہ سے آگاہ تھی اور پیش آمدہ مسائل میں وہ ایک ہی جماعت کے متعلمین کی طرح بعض اوقات ایک دوسرے سے مدد لے کر کام چلا لیتے تھے اور حکومتِ وقت بھی نبوی تعلیم اور اسلامی اخلاق و کردار سے کسی حد تک متاثر تھی اس لئے انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں اسلامی آئین کو ہی سرکاری قانون کی حیثیت دی وہ صوم و صلوة کے خود بھی پابند تھے اور رعایا پر بھی صوم و صلوة کی پابندی کو ضروری قرار دیتے تھے اور اس سلسلہ میں وہ باز پرس بھی کرتے تھے مقدمات کا فیصلہ بھی ان کے دور میں اسلامی قوانین کی رو سے ہوتا تھا اور سزائیں بھی تعزیراتِ اسلامیہ کے تحت میں دی جاتی تھیں اور جہاں حکومتِ وقت کسی مقدمہ کے فیصلہ میں اسلامی نقطہ نظر کو زبجان سکتی تھی اور باہمی مشورہ سے بھی اس کے حل کرنے میں کامیاب نہ ہوتی تھی وہاں حضرت علی علیہ السلام سے مشکل کشائی کی درخواست کی جاتی پس آپ حقیقی دینی قائد ہونے کی حیثیت سے اُس کو حل فرمادیتے۔ اور اس قسم کے فیصلوں سے ہی حقیقت بین نکالیں تا دلیتی تھیں کہ دینی قائد کون ہے اور سیاسی قائد کون ہے؟

حکومتِ وقت نے چونکہ زمانہ پیغمبر کے قرب کی وجہ سے اسلامی آئین کو ہی سرکاری قانون قرار دے دیا تھا لہذا عامۃ الناس کو یہ تاثر دلا گیا تھا کہ یہی قیادت صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ دینی قیادت بھی ہے اور جناب رسالت مآب کے برحیثیت سے نائب ہونے کا حق بھی ابھی کو حاصل ہے پس وہ خلیفہ رسول اور امیر المؤمنین کے القاب سے بھی خطاب کئے جاتے تھے لیکن حضرت علی علیہ السلام نے ان کی سیاسی قیادت کو تسلیم کرنے کے باوجود کبھی ان کی دینی قیادت کو تسلیم نہ کیا اور نہ آپ ان کو اس منصب کے اہل سمجھتے تھے اور روبرو کی باتوں میں جب حضرت علی علیہ السلام نے دینی و سیاسی ہر دو قیادتوں کا اہل اپنے آپ کو ثابت کیا تو انہوں نے اپنے لئے نہ یہ قیادت کی اہلیت کا خود دعویٰ کیا اور نہ سرکاری و کیسلس حضرت ابو عبیدہ جراح نے ان کی اہلیت کا اعلان کیا بلکہ آپ کے دعویٰ کی تصدیق و تائید میں اس نے چند الفاظ کہے اور حضرت ابو بکر کی سن ربیب کی اور تجربہ کاری کی بدولت ان کے حق میں اقتدار کی بھالی کی

سفارش کی جیسا کہ الاماتہ والیاستہ سے ہم نقل کر چکے ہیں۔

چونکہ حضرت علی نے حکمران طبقہ کی دینی قیادت کو تا آخر تسلیم نہ کیا تھا اسی لئے حکومت کی جانب سے ان کو سزا دی گئی کہ ایک طرف ان کے املاک کو سرکاری طور پر ضبط کر لیا گیا جس کو فک کہتے ہیں اس بہانہ سے کہ رسول اللہ کا مال مال سرکار ہے اور وہ اسلامی بیت المال کا حصہ ہے کیونکہ نبیوں اور رسولوں کا کوئی وارث نہیں ہوا کرتا۔ اور دوسری طرف ان کو حکومتی کاروبار میں شہ یک نہ کیا گیا نہ داخلی امور میں اور نہ خارجی معاملات میں آپ کی جنگی صلاحیتیں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھیں تاہم ان سے حکومت وقت نے کسی معاملہ میں سرکاری طور پر کار لینا مناسب نہ سمجھا اور انہیں کمپن سالہ دور حکومت میں گھر کی چار دیواری میں خاموشی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا اور اس کا پس منظر اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اگر حضرت علی کی علمی و عملی دینی و سیاسی نظامی و معاشی اور فوجی و جنگی صلاحیتوں اور سرگرمیوں کو بروئے کار لانے کا موقعہ دیا جاتا تو پہلا مرحلہ اگرچہ تجزیہ و تحلیل پیچیدہ کی وجہ سے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ لیکن دوسرے مرحلہ میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ حضرت علی کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی برسرِ اقتدار ہو سکتا ہے آپ کی صلاحیت و استعداد کے پیش نظر دینی قیادت تو پہلے سے ہی تھی سیاسی قیادت خود بخود آپ کے قدموں میں جھک جاتی اور مسلمانوں کے لئے ان کی قیادت کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوتا جس طرح عثمان کی وفات کے بعد سیاسی قیادت خود بخود علی کے قدموں میں جھکی اور مسلمانوں کے لئے ان کی قیادت کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ علامہ علی اعلیٰ اللہ تعالیٰ نے اتفاق الحق میں حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلا فصل پر آیات و احادیث کی روت سے بہت کچھ مواد پیش فرمایا ہے اور آپ نے مسند احمد بن حنبل سے حدیث و حدیث ہی خلافت علی کے استدلال میں ذکر کی ہے۔ سلمان نے رسول اللہ سے دریافت کیا کہ حضور! آپ کا وصی کون ہو گا؟ تو آپ نے فرمایا اے سلمان! میرے بھائی موسیٰ کا وصی کون تھا؟ سلمان نے جواب دیا کہ یوشع بن نون۔ تو آپ نے فرمایا میرا وصی اور وارث جو میرے قرعے جی ادا کرے گا اور میرے وعدوں کی بھی ایفا کرے گا وہ علی بن ابی طالب ہے۔

اس کے جواب میں فضل بن روزبهان منسوب مزاج سنی العقیدہ اپنی کتاب "البحال الباسل" میں لکھتا ہے: **النَّوْحِيُّ قَدْ يُقَالُ وَبِإِدْبِهِ مَنْ أَوْصَى لَدَى الْعِلْمِ وَالْهِدَايَةِ وَحِفْظِ قَوَانِينِ الشَّرْعِ نَعْدَ وَتَبْلِيغِ الْعِلْمِ وَالْمَعْرِفَةِ فَإِنْ أُرِيدَ هَذَا مِنَ الْوَصِيَّةِ فَمُسَلَّمٌ إِنَّكَ كَانَ وَصِيًّا لِرَسُولِ اللَّهِ وَلَا خِلَافَ فِي هَذَا وَإِنْ أُرِيدَ الْوَصِيَّةُ بِالْخِلَافَةِ فَقَدْ ذَكَرْنَا بِالْأَدَلِّ الْعَقْلِيَّةِ وَالنَّفْلِيَّةِ عَدَمَ النَّصْرِ فِي خِلَافَةِ**

عَلِيٍّ وَلَوْ كَانَ نَصًّا جَلِيًّا لَمْ يُخَالِفْهُ الصَّحَابَةُ وَإِنْ خَالَفُوا لَمْ يُطِغْهُمْ الْعَسَاكِرُ وَ
عَامَّةُ الْعَرَبِ سِوَمَا إِلَّا نَصَاد۔ ترجمہ۔ بعض اوقات وصی بول کر اس سے مراد لیا جاتا ہے وہ جس کو
علم، ہدایت، حفظ قوانین شریعت اور تبلیغ علم و معرفت کے لئے وصیت کی گئی ہو پس اگر وصی سے یہ معنی
مراد ہو تو مسلم ہے کیونکہ آپ (اس معنی میں) رسول اللہ کے وصی تھے اور اس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں
لیکن اگر وصیت خلافت مراد ہو تو ہم بیان کر چکے ہیں (دلائل عقلیہ و نقلیہ کی روشنی میں) کہ خلافت علی پر
کوئی نص نہیں ہے ورنہ اگر نص چلی ہوتی تو صحابہ مخالفت نہ کرتے اور اگر صحابہ مخالفت کرتے بھی تو فوج
اور عوام خصوصاً انصار قطعاً ان کا ساتھ نہ دیتے۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک بھی حضرت علی کی قیادت علمیہ و دینیہ
مسلم تھی اور جو انصوص شیعہ کی طرف سے حضرت علی کی خلافت بلا فضل پر پیش کی جاتی ہیں سنی علماء کے
نزدیک اس سے مراد قیادت دینیہ ہے اور اس کے سربراہ حضرت علی تھے اور خلافت بمعنی سیاسی قیادت
کے سربراہ حضرت ابو بکر تھے اور شیعیان علی اس کا انکار نہیں کرتے۔

دورِ اموی میں سرکاری آرڈمی نہیں کے ماتحت حضرت علی ان کی اولاد امجاد اور ان کے
عزاداری شیعوں پر گالی گلوچ اور سب و شتم کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا واقعہ ہائے کربلا میں شہادت
عظمیٰ کے بعد شیعیان علی میں سلسلہ عزاداری اس کا ردِ عمل ہے۔ حکامِ جور حضرت علی اور شیعیان علی کو گالیاں
دیتے تھے اور جمہور اہل اسلام ان کے ہمہوا ہو کر حکومتِ وقت کے سامنے اپنی وفاداری و ایما نداری کا ثبوت
پیش کرتے تھے۔ ائمہ طاہرین کے حکم سے شیعیان علی نے سلسلہ عزاداری کو جاری کر کے اور ہر سال واقعہ کربلا
کی یاد مناکر ایک طرف اموی مظالم کو اجاگر کیا ہے اور دوسری طرف اپنی مظلومیت کی داستان دہرا کر
اپنی بے گناہی کو طشت از بام کر کے عوام الناس اور بالخصوص اہل اسلام کو دعوتِ فکری دی ہے کہ ہمیں
بے گناہ گالیاں دی جاتی رہی ہیں اور ہمارے خلاف ہر قسم کی غلط سلط افواہیں دورِ اموی کی ظالمانہ و جابرانہ
پالیسی کی ایجاد ہیں لہذا ہمارے متعلق جو منفرد اموی دورِ حکومت میں پھیلا یا گیا تھا وہ بالکل بے بنیاد ہے
اس کا اثر یہ ہوا کہ اموی دور کے بعد عباسی دور اگرچہ شیعیان علی پر مظالم کے لحاظ سے کچھ کم نہ تھا
حتیٰ کہ شیعوں کے ائمہ بھی ان کے جو رستم کا نشانہ بنے رہے لیکن اس سلسلہ عزاداری کی بدولت شیعیان
علی بجائے گھٹنے کے بڑھتے ہی رہے اور ان کی تعداد میں روز افزوں ترقی جاری رہی نہ وہ حکومتِ وقت
کے مٹانے سے مرٹ سکے اور نہ ان کے دبائے سے دب سکے۔

حکومتوں نے دیکھ لیا کہ جمہور اہل اسلام کے مقابلہ میں ان کی تحریک ختم نہیں ہو سکتی حالانکہ کسی تحریک

رہ۔ اکل مو ہو حکایت، ماحولیت، مناصب و جوائز کے لالچ کے سرپوشوں میں اسے بند کر دیا گیا تھا۔

عزاداری کا اہم ترین مطمح نظر یہ ہے کہ علی اور اولاد علی کے فضائل و محامد کی نشر و اشاعت لائیاں کی زینت کر دئے گئے تھے اور پھر ان پر کئے جانے والے مظالم اور ڈھائے جانے والے مصائب کا برملا تذکرہ کیا جائے جو نشہ اقتدار میں بدست حکمران طبقہ کے آمرانہ و متشددانہ طرز حکومت کے نتیجے میں ہوئے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کو ظالم سلاطین بنی امیہ سے نفرت ہوتی ہے اور آل محمدؐ سے عقیدتمندی میں اضافہ ہوتا ہے اور لوگ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ دینی قیادت اور سیاسی قیادت کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور کتب تاریخ کی چٹان بین خوبی اس نتیجہ تک لے جاتی ہے کہ دور رسالت کے بعد سے ہی یہ دونوں لائیں نکلی تھیں حضرت علی دینی قیادت کے سربراہ تھے اور مقابل میں خلیفہ کھلانے والے صرف سیاسی قیادت اور ظاہری اقتدار کے ہی مالک تھے اس طرف ظاہری اقتدار کی مسند یزید تک پہنچی تو اس طرف دینی قیادت کی باگ ڈور حسین علیہ السلام تک پہنچ گئی اور ظاہری اقتدار نے دینی اقتدار کو اپنے قدموں میں روندنا چاہا تو حضرت حسین علیہ السلام وقت کے تقاضوں کو بھانپ کر باطل کے طوفان کے سامنے کوہ گراں بن کر ڈٹ گئے اور آخر کار خود مرٹ کر شہادت کا جام شیریں پی کر راہ حق اور راہ باطل میں حلی امتیاز پیدا کر گئے۔

اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ جہاں انسان کے دل میں ایک طرف مظلوم سے محبت ہوتی ہے وہاں ظالم سے نفرت کا پیدا ہونا بھی ضروری امر ہے اسی طرح جب حق سے محبت ہوتی ہے تو باطل سے بیزاری کرنا بھی فطری چیز ہے تو جہاں جنگ جمل و صفین کے معاملہ میں لیب پوت کر کے معاویہ و طلحہ و زبیر وغیرہ کا احترام باقی رکھا گیا تھا امام حسین علیہ السلام کی شہادت عظمیٰ نے اس لیب پوت کا پردہ بھی چاک کر کے رکھ دیا کیونکہ جب لوگ عزاداری سے متاثر ہو کر یزید سے بیزار ہوئے تو یزید کے باپ معاویہ سے بیزاری لازمی تھی کیونکہ اسی نے ہی اس ناخلف بیٹے کے لئے اقتدار کی راہیں ہموار کی تھیں اور معاویہ کے اقتدار کی ذمہ داری اوپر کو جاتی ہے اور تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں اسی خطرے کے پیش نظر مہر اہل اسلام کے مفتیان نے عزاداری کی عمرمت کا فتویٰ دے دیا اور ابن حجر مکی نے صواعق مرقہ میں اپنے بعض اکابر اہل سنت کا قول نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک امام حسین کی عزاداری اس لئے ناجائز ہے کہ اس سے اکابر صحابہ پر باطنی پیدا ہونے کا خطرہ ہے اور موردی صاحب نے بھی اہل سنت کے ایک گروہ کی طرف یہی بات منسوب کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ انہی احادیث کی بنیاد پر علما کے ایک گروہ نے یزید پر لعنت

کو جائز رکھتا ہے اور ایک قول ان کی تائید میں امام احمد بن حنبل کا بھی ہے مگر ایک روایت
 کہ صرف اس لئے اس سے منع کرتا ہے کہ کہیں اس بات اس کے والد یا معاہدہ میں سے کسی
 اور پر لعنت کرنے کا دروازہ نہ کھل جائے ۱۸۳۔

اور خود بھی اسی دوسرے گروہ کے حامی معلوم ہوتے ہیں چنانچہ بیتہ ہاشیہ پر لکھتے ہیں۔
 ہمیں ایسے لوگوں کے غلط کاموں کو غلط کہنے پر اکتفا کرنا چاہیے اور لعنت سے پرہیز کرنا
 اولیٰ ہے ۱۸۴۔

آئمہ اثنا عشر حضور رسالت مآب کے بعد دینی قیادت کی ذمہ داریاں اُن سے صحیح
 جانشینوں کے سپرد تھیں جو یکے بعد دیگرے اس منصب جلیل کے اہل
 تھے اور اُن کی تعیین کا فرضیہ امت کے سپرد نہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں تھا اور اس نے زبانِ نغمہ نامزد فرمایا
 ہے اور احادیث میں جو سجدہ تواتر حضرت پیغمبر سے منقول ہیں آپ کے بعد آئمہ کی تعداد بارہ ہے
 جس کو تمام اہل اسلام نے تسلیم کیا ہے اور یہ کہ وہ سب قریش سے ہی ہوں گے۔ مودودی صاحب نے
 خلافت و ملکیت میں اس حدیث کو تو کھلے دل سے قبول کیا ہے کہ آپ نے فرمایا خلافت میرے
 بعد تیس سال تک ہوگی اور بعد میں ملک و ملکیت ہو جائے گی اور شرح عقائد نفسیہ میں تفصیلاً
 نے بھی اس کو تسلیمی حیثیت سے نقل کیا ہے لیکن اس حدیث کو نقل کرنے کی جسارت نہیں کی گئی جس میں
 خلفاء کا بارہ ہونا مذکور ہے بلکہ اس میں سے نہ تو ایک فقرہ لے لیا گیا ہے کہ خلفاء قریش سے ہوں گے
 اور خلافت و ملکیت مثلاً اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خلافت کی مدت تیس برس تک معین
 ہونے کی صورت میں تاویل کی گنجائش حال لی گئی ہے کہ خلافت کی دو قسمیں ہیں ایک راشدہ اور
 دوسری غیر راشدہ معنی ملکیت اور حدیث شریف نے خلافت راشدہ (علی منہاج النبوة) کے متعلق
 ہی فرمایا تھا کہ یہ تیس برس تک ہوگی اور بعد میں بادشاہت و آمریت کا دور دورہ ہوگا لیکن اثنا عشر بارہ
 خلفاء والی حدیث کی تصریح کے لئے مہجور اہل سنت کے مسلک کی رو سے کوئی تاویل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ
 خلفائے نبویؐ کو ساتھ ملا یا جائے تو تعداد بارہ سے بڑھتی ہے بلکہ صرف بنو امیہ ہی بارہ سے زیادہ ہیں۔ اور
 بنو العباس کی تعداد تو ان سے بھی زیادہ ہے۔ علامہ مہمال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں بارہ خلفاء والی
 حدیث پر کافی تبصرہ کیا ہے اور بالآخر اس کی رائے کا بھان اس طرف ہے کہ ابو بکر سے لے کر عمر بن عبد العزیز
 تک کے خلفاء راہ لے جائیں لیکن اس خیال پر خود مصلحت نہیں کیونکہ بعض کا کہنا ہے کہ اس قدر غلط اور افسوسناک
 بلکہ فسادیت سوز حد تک پہنچا ہوا ہے کہ مہجور اہل اسلام کے نزدیک بھی اس پر خلافت نبویہ کے مقدس

یہی کی تطبیق محل اشکال ہے اور دوسری طرف معرفت امامت والی حدیث جو تمام اہل اسلام میں مسلم حیثیت رکھتی ہے۔ جس کو علامہ لفظ زانی نے مخرج عقائد نسفیہ میں نصب امام کے وجوب کے استدلال میں پیش کیا ہے حضور نے فرمایا۔ مَنْ مَاتَ وَلَهُ يَعْرِفُ اِمَامَ زَمَانِهِ مَاتَ مِثْلَهُ جَاهِلِيَّةً۔ یعنی جو شخص امام زمانہ کی معرفت کے بغیر مر جائے تو اس کی موت کفر و جہالت کی موت ہے۔ اس حدیث کی رو سے بارہ خلفاء کی جو بھی تاویل کی جائے قابل قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ بارہ خلیفے جہاں جی ختم ہوں گے اس کے بعد والے لوگوں کے لئے جہالت کی موت لازمی طور پر مانتی پڑے گی۔

اس حدیث کی رو سے صرف شیعیان علی کا نظریہ ہی صحیح قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ شیعوں کے نزدیک حضور کے بعد حضرت علی علیہ السلام سے لے کر حضرت ہمدی علیہ السلام تک بارہ خلیفے بنتے ہیں اور سب کے سب قریش ہی سے ہیں۔ گیارہ کا زمانہ ختم ہو چکا ہے لیکن بارہویں کا زمانہ تا قیامت بنے پس ہر زمانہ ہر انسان امام وقت کی صحیح معرفت حاصل کر کے جہالت کی موت سے بچ سکتا ہے اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ جناب رسالت مآب کے بعد جب تا قیام قیامت نئے نبی نے آنا نہیں تو کم از کم حضور کے بعد قیامت تک کی کثیر التعداد امت اسلامیہ کے لئے ہر زمانہ میں ایک پادری و حجت خدا کا وجود تو ہو، جو امت کے لئے سہارا بن سکے اور اس سوال کا حل سوائے شیعہ عقیدہ کے اور کسی فرقہ کے پاس نہیں مل سکتا۔ علامہ علی نے بارہ خلفاء والی حدیث صحیح بخاری صحیح مسلم اور ابوداؤد سے نقل کی ہے اور سچی بات ہے کہ جو اہل اسلام اس حدیث کو دیکھ کر شش و پنج میں پڑ جاتے ہیں نہ آسانی عقیدے کا جو ان کی گردن سے نکلتا ہے نہ اس کی صحت سے انکار ہو سکتا ہے اور نہ اس کی کہیں تطبیق ہو سکتی ہے۔

اس حدیث کو پڑھ کر فضل بن روزبہان نے یہ تو کہہ دیا کہ حدیث صحیح ہے اور کتب صحاح میں وارد ہے لیکن اس کے مصداق کی تلاش میں وہ بھی مارا مارا پھرتا رہا لیکن ناکامی و نامرادی نے ساتھ نہ چھوڑا۔ آخر کہنے لگا "اس سے مراد یہ لی جاسکتی ہے کہ قریش سے جوئے والے صالح خلفاء کی تعداد بارہ ہوگی۔ ان میں سے پانچ تو ہیں خلفائے راشدین ابو بکر۔ عمر عثمان۔ علی و حسن چٹا عبداللہ بن زبیر ساتواں عمر بن عبدالعزیز۔ اور پانچ خلفائے بنی عباس میں سے ہوں گے گویا حدیث میں قریش کے بارہ صالح خلیفوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد آتا ہے۔ اس حدیث سے اگر بارہ امام مراد لئے جائیں جو شیعہ کہتے ہیں تو اگر خلافت سے مراد وراثت علم و معرفت، بیان حجت اور قیام منصب نبوت مراد ہو تو اس کی صحت سے کوئی انکار نہیں اور یہ صحیح درست ہے لیکن اگر خلافت سے مراد عامت کبریٰ (اقتدار حکومت) ہو تو یہ درست نہیں کیونکہ اقتدار بارہویں سے صرف دو کو، علی و حسن کو، حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اس سے صاف معلوم ہے کہ دو در رسالت

کے بعد دینی قیادت حضرت علی سے لے کر حضرت مہدی علیہم السلام کے پاس رہی اور اقتدار حکومت پہلے خلفائے ثلاثہ کے پاس تھا پھر اموی حکمرانوں کے قبضہ میں رہا اس کے بعد سلاطین بنی عباس اس پر قابض ہوئے اور پھر جس کی لاٹھی اس کی بھینس سیاسی قیادت اہلیت و نااہلیت کے معیار سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے مخصوص اسباب و ذرائع ہوتے ہیں اور مختلف حیلے و بہانے ہوتے ہیں کبھی ایک ذریعہ سے ایک شخص کامیاب ہو جاتا ہے لیکن وہی ذریعہ دوسرے کے لئے ناکامی کا باعث بن جاتا ہے۔ اسی طرح کبھی ایک حیلہ ایک کے لئے مفید ثابت ہو جاتا ہے لیکن دوسرے کے لئے وہ نقصان دہ بن جاتا ہے۔ بہر حال اقتدار پر قبضہ مختلف ذرائع و اسباب کے ماتحت قوموں میں تقسیم ہوتا چلا آیا ہے اور یکے بعد دیگرے قومیں اور افراد ایک دوسرے کے وارث چلے آ رہے ہیں اور اقتدار کبھی شخصی کبھی جمہوری کبھی آمریت اور کبھی ملوکیت کے مختلف رنگوں میں ڈھلتا ہوا چلا جا رہا ہے اور ہر کہ آمد عمارتِ نوساخت کے کچلے کے ماتحت نہ حکومت کو بقا ہے اور نہ قانون کو پابندی حاصل ہے۔ صرف اللہ کی حکومت باقی ہے اور اس کا قانون پابدار ہے۔ جب اللہ اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا تو قانونِ الہی کو برتری حاصل ہوگی اور زمین کی حکومت اللہ کے نیک بندوں کے ہاتھوں میں ہوگی اور حضرت مہدی علیہ السلام کی آمد اور ان کا دور تمام اہل اسلام کے لئے اُمیدوں کی آخری قرار گاہ ہے۔

پہلا امام برحق اور خلیفہ رسول بلا فصل حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام

آپ عام الفیل کے تیس برس بعد کعبہ میں رجب المرجب کی تیرھویں تاریخ کو متولد ہوئے اور یہ جمعہ کا دن تھا۔ ابن صباغ مالکی کا بیان ہے کہ کعبہ میں تولد کا شرف صرف حضرت علی ہی کے حصہ میں ہے نہ اس سے پہلے کسی کو یہ شرف ملا اور نہ بعد میں ملنے کا امکان ہے۔ اور یہ پہلا ہاشمی ہے جس کے ماں باپ دونوں ہاشمی تھے۔ افسول مہدی آپ کے والد ماجد کا اہم گرامی حضرت ابوطالب بن عبد المطلب بن ہاشم اور والدہ ماجدہ کا نام نانی جناب فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھا (المجالس المرضیہ)

تذکرۃ الخوئاس میں بھی ہے کہ جناب فاطمہ بنت اسد طوائف کعبہ میں مشغول تھیں کہ آپ کو درودِ زہ پیدا ہوئی۔ پس بڑا بچہ شوقِ نبوی اور اندر داخل ہوئیں اور جو کعبہ میں علی کی ولادت ہوئی۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ علی کی ولادت کعبہ میں تو اتر کے ساتھ منقول ہے۔ چنانچہ دلائل الصدق۔

”تذکرۃ الخوئاس“ میں سبط بن الجوزی لکھتے ہیں کہ حضرت عبد المطلب نے وفات سے پہلے

حضرت ابوطالب کو اپنا وصی مقرر فرمایا اور رسول اللہ کے معاملہ میں رعایت کی انہیں بہت تاکید کی

آگے چل کر لکھتے ہیں، ابوطالب نے رسول اللہ کی مدد اور کفالت میں بہترین کردار ادا کیا ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے اور تھوڑے وقت کے لئے بھی ان کو اپنے سے جہان کرتے تھے اور آپ سے ان کو اس قدر وابہانہ محبت تھی کہ اپنی اولاد سے بھی ان کو عزیز تر سمجھتے تھے اور اپنے پیلوہی میں ان کو سلامتے تھے اور عرض کیا کرتے تھے کہ بیٹا تمہارا چہرہ مبارک ہے، حضرت عبدالمطلب کی وفات کے وقت آپ کی عمر آٹھ برس تھی اس وقت سے لے کر اعلان نبوت کے دس برس بعد تک آپ نے خدمت پیغمبر کا فریضہ ادا کیا (۲۲ برس) ابن سعد نے واقعہ سے نقل کیا ہے جب حضرت ابوطالب کی وفات کی اطلاع حضرت علی علیہ السلام نے حضور کو دی تو آپ بہت روئے اور حضرت علی کو حکم دیا کہ تجنیر و تکفین و تدفین کا فریضہ ادا کرو۔ خدا ان پر اپنی مغفرت نازل فرمائے۔ عباس نے پوچھ لیا کہ ان کے لئے بھی مغفرت کی امید ہے۔ تو آپ نے فرمایا ہاں بے شک خدا کی قسم مجھے اس کی بخشش کی توقع ہے۔ اور رسول اللہ کئی روز تک حضرت ابوطالب کے لئے دعا و استغفار کرتے رہے۔ (تذکرۃ الخواص)

ایمان ابوطالب جن لوگوں نے حضرت ابوطالب کے ایمان میں شک کیا ہے وہ صرف ان کی تنگ نظری کا ہی نتیجہ ہے اور تاریخ کے اوراق شاید ہیں کہ معاویہ حضرت علی کا سخت ترین بلکہ بدترین دشمن تھا اور حضرت علی نے بعض خطوط میں ان کو سخت دست الفاظ بھی لکھے تاہم اس نے کبھی حضرت علی کو حضرت ابوطالب کے کفر کا طعنہ نہ دیا ورنہ وہ اہل شام میں بھی یہ فخر یہ نعرہ بلند کرتا کہ میں مسلمان باپ کا بیٹا ہوں اور علی، معاذ اللہ کا فر باپ کا بیٹا ہے اور کم از کم ساٹھ برس تک اموی سلاطین کی طرف سے حضرت علی پرست و شتم ہوتا رہا لیکن کبھی کسی نے حضرت علی کے باپ کے کفر کا نام تک لینے کی جرأت نہ کی اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دور اول میں حضرت ابوطالب کا مومن ہونا اس قدر مسلم تھا کہ بدترین دشمن بھی اس کا انکار نہ کی جرات نہ کر سکتے تھے جب دور بنی عباس میں جبہور اہل سنت کے مذہب کی منظم طور پر تشکیل ہوئی تو خلفائے بنو عباس کے خوشامدیوں نے عباس کو ابوطالب سے افضل ثابت کرنے کے لئے حضرت ابوطالب کے ایمان پر لب کشائی کی اور اندھا دھند تقلید کرنے والوں نے سلاطین کی خوشامدی میں آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر لیا۔ کیا انہیں معلوم نہیں بھت کہ دعوتِ عمیرہ سے لے کر بعثت کے دسویں برس تک حضرت ابوطالب زندہ رہے۔ انہی کی سرپرستی میں کلمہ کھلا حضور تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیتے رہے اور آپ ہی کی بدولت کسی سرچھریے مشرک کو جرأت نہ ہو سکی کہ آپ کی تبلیغ کی راہ میں حائل ہو سکے جب حضرت ابوطالب کا انتقال ہوا تو اس کے بعد مشرکین نڈر و بے باک ہو کر حضور کے درپے ایذا ہوئے اور حالات دن بدن بد سے بدتر ہوتے

چلے گئے یہاں تک کہ آپ مکہ کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو گئے۔ بہر حال حضرت ابو طالب مومن اور کامل الامیان بزرگ تھے اور اسلام کی جو خدمات انہوں نے سر انجام دیں وہ انہی کا ہی حصہ تھیں اور بانی اسلام کے نزدیک ان کی سعی مشکور تھی۔

آپ کی والدہ ماجدہ حضرت علی کی والدہ ماجدہ جناب فاطمہ بنت اسد کے متعلق نہ کرۃ الخواص میں نہ کوفہ ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائی تھیں اور مدینہ میں ستم جبری کو آپ کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئیں۔ حضور نے بنفس نفیس ان کی نماز جنازہ پڑھی اور اپنی قمیص ان کے لئے جلوہ گھن کے عنایت فرمائی۔ زہری سے منقول ہے کہ حضور فاطمہ کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے اور ان کے گھر میں قبیلہ بھی فرماتے تھے وہ ایک وصالہ خاتون تھیں۔ ابن عباس سے مروی ہے آیت **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يَبَايِعْنَكَ** فاطمہ بنت اسد کے شان میں اتری اور یہ پہلی خاتون ہے جو پاپا یہ ہجرت کر کے مدینہ پہنچی۔ اور یہی پہلی عورت ہے جس نے سنت خدیجہ ام المؤمنین کے بعد مکہ میں حضور کی بیعت کا شرف حاصل کیا۔

تر بیت حضرت علی علیہ السلام کو نسب کے لحاظ سے اپنے عظیم باپ اور بلند پایہ ماں کے بیوت ہونے پر بجا ناز تھا لیکن اس سے بڑھ کر تربیت کے لئے آپ کو ایسا بلند مقام ملا جس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا اور وہ آغوش رسالت تھی اسی لئے مقام فخر میں جلوہ شکر پر درخشاں ارشاد فرمایا مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے آغوش رسالت میں بکری پانی آپ نے مجھے اپنے سینے پر لٹایا۔ اپنے پیلو میں سلایا۔ اپنے جسم اقدس کو میرے جسم سے مس کیا اور میں نے انہی کی بونے نبوت کی مہک سے اپنے دماغ کی فرست حاصل کی (منہج) علامہ بقی نے **بشار المصطفیٰ** سے نقل کیا ہے کہ حضور بنفس نفیس بچپن میں علی کا تجلوا تجلاتے تھے اور جب جاگتے تو اس کو اٹھا کر گود میں جھاتے اور پیار کے لب و لہجہ سے باتیں کرتے اور چہرہ مکہ کی پاڑیوں اور دایوں میں سیر کرانے کے لئے علی کو اٹھا کر لے جاتے تھے۔

محمد و مناقب علی علیہ السلام کی فضیلت کے متعلق حضرت ابن عباس سے مروی ہے اگر درخت قلیں جو بانیں و ریاسیاں بن جائیں اور جن دانس لکھنے اور حساب کرنے والے ہو جائیں تب بھی علی کے فضائل کا احاطہ نہیں ہو سکتا آپ سے مروی ہے کہ خدا نے قرآن میں کوئی آیت فضیلت نہیں نازل فرمائی۔ مگر یہ کہ علی اس کے پاس نہیں ہیں (تذکرۃ الخواص) اور سند احمد بن حنبل وغیرہ سے منقول ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** نازل نہیں ہوا مگر یہ کہ علی اس کے امیر و شریعت ہیں اور قرآن مجید میں خدا نے کئی دفعہ صحابہ کو سزاؤں کی ہے لیکن شہر علی کا ذکر من و ثنا اور خیر کے ساتھ ہی فرمایا

اس سے واضح ہے کہ جن آیات میں مومنوں کو خطاب کر کے خدا نے سرزنش کی ہے ان خطابات سے جو علی مستثنیٰ ہیں حدیث مذکور کو ابو نعیم نے حلیہ میں اور ابن حجر کی نے صواعق محرقہ میں بھی ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ (ولأهل الصدق)

جمہور مسلمین کا اتفاق ہے کہ حضرت علی پہلا وہ شخص ہے جس نے حضرت رسول اللہ کی تصدیق کی پس وہ اول مومن ہے۔ اور علی وہ ہے جس کا دامن شرک کی نجاست کبھی ملوث نہیں ہوا پس ان کے اسلام لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نیز حضرت علی علیہ السلام پہلا شخص ہے جس نے حضرت رسول اللہ کی اقتداء میں نماز پڑھی۔ (مروج الذهب ج ۱ ص ۱۰۰)

(تذکرۃ الخواص)

معاویہ نے ایک مرتبہ سعد بن ابی وقاص سے کہا تو ابو تراب (علی) کو سب کیوں نہیں کرتا؟ سعد نے جواب دیا کہ حضرت علی کے بارے میں تین باتیں مجھے یاد ہیں جو رسول اللہ نے فرمائی تھیں اس لئے میں علی کو سب نہیں کر سکتا۔ معاویہ نے پوچھا وہ کونسی؟ تو سعد نے جواب دیا (۱) حدیث رايت (اس حدیث کو احمد بن حنبل نے مسند میں اور بخاری و مسلم نے صحیحین میں سہل بن سعد سے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے جنگ خیبر کے موقع پر فرمایا "کل میں علم اس شخص کے حوالہ کروں گا جو خدا و رسول کو دوست رکھتا ہے اور خدا و رسول اس کو دوست رکھتے ہیں اور خدا اس کے ہاتھ پر فتح دے گا۔ لوگوں نے علم حاصل کرنے کی انتظار میں رات بستروں پر کر وٹیں لے لے کر سہر کی اور صبح کو ہر شخص کے دل میں اس شرف کے حصول کا لالچ تھا۔ رسول اللہ نے پوچھا علی کہاں ہے؟ تو جواب ملا کہ وہ آشوبِ چشم کی تکلیف رکھتے ہیں آپ نے بلوایا اور چشمہ وحی پر وردگار سے دھلا ہوا دھان رسالت کے مقدس و پاکیزہ ظرف سے نکلا ہوا سرمہ لعابِ نبوت چشمِ ولایت میں ڈال کر لب ہائے مبارک کو حرکت دی اور علی کے حق میں دعا فرمائی پس علم جنگ عطا فرما کر روانہ بہاؤ کیا۔ (۲) نصاریٰ بخیران کے ساتھ مباہلہ کے موقع پر آبِ نساءؑ کی جگہ حسن حسینؑ نساءؑ کی جگہ فاطمہ زہراؑ اور انفسنا کی جگہ پر حضرت علیؑ کو ہمراہ لے گئے اور فرمایا خدا یا میرے اہل بیت ہیں۔ احقاق الحق میں علامہ حلی نے دعویٰ کیا ہے کہ آیت مجیدہ کی اس تفسیر پر تمام مفسرین کا اجماع ہے (۳) رسول اللہ جب جنگ تبوک کی طرف جانے لگے تو علیؑ کو اپنا خلیفہ بنا کر گئے۔ جب حضرت علیؑ نے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی تو آپؐ نے فرمایا کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ تیری بجائے وہ نسبت ہے جو یاروں کو موسیٰ سے تھی۔ معاویہ نے یہ سن کر کہا کہ پہلے کی نسبت اب تو میرے نزدیک زیادہ قابلِ ملامت و نفرت ہے کیونکہ جب تو علیؑ کے اس قدر فضائل جانتا ہے تو نے اس کی اطاعت سے کنارہ کشی کیوں کی اور اس کی بیعت چھوڑ کر ان سے کیوں ہو گیا؟ اگر تیرے بجائے میں نے حضورؐ کی زبانی یہ باتیں سنی ہوتیں تو عمرِ حیدر علیؑ کی نوکری کرتا (تذکرۃ الخواص)

نقلًا از مسند احمد و مروج الذهب وغیرہ (حدیث منزلت کو صحیح بخاری و مسلم میں بھی ذکر کیا گیا ہے اور فضل بن روز بہان جیسے متعصب مزاج نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔ (دلائل الصدق)

بروز خندق عمرو بن عبید و غامری کے مقابلہ سے جب تمام مسلمان عاجز آچکے تھے اور سورہ اعراب میں خداوند کریم نے مسلمانوں کی حالت خوف اس طرح بیان کی ہے بَلَعَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ۔ ڈر کے مارے دل خجروں تک پہنچ گئے تھے۔ وَتَلْتُنُونَ بِاللَّهِ ظَنُونًا اور تم لوگ اللہ پر بگمان ہو رہے تھے اور تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ مسلمانوں پر سنی چپا گئی تھی اس وقت حضرت علی علیہ السلام نے نہایت جرأت سے میدان کارزار کی طرف قدم بڑھایا تو تمام تاریخین متفق ہیں کہ حضور نے فرمایا بَرَزَ الْإِيمَانُ كُلُّهُ إِلَى الْكُفْرِ كُلِّهِ (سب کا سب ایمان سب کے سب کفر کے مقابلہ میں جا رہا ہے) علامہ نے اس روایت کو اتنا قی قرار دیا ہے اور فضل بن روز بہان نے اس کو صحیح روایت مانا ہے (دلائل الصدق)

حدیث موافقہ جو متفق علیہ ہے اور کتب صحاح میں مذکور ہے جب حضرت رسالت پناہ نے مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ قائم کیا تو حضرت علی کو اپنا بھائی قرار دیا۔ (دلائل الصدق) و رت الزہب حضرت علی علیہ السلام کے وفور عار اور وسعت معلومات کا کوئی مسلمان انکار ہی نہیں کر سکتا چنانچہ علامہ علی نے مسند احمد و صحیح مسلم سے نقل فرمایا ہے کہ اصحاب پیغمبر میں سے کسی کو سوائے علی کے اس دعویٰ کی جرأت نہ ہوئی جو چاہو مجھ سے پوچھ لو سوائے علی کے۔ اور رسول اللہ نے ان کے حق میں فرمایا تھا اَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِيٌّ بَابُهَا (میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے)

اس پر فضل بن روز بہان نے حدیث کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے حضرت علیؑ کے وفور علم و افقات کے استنباط اور مختلف علوم و معارف میں ان کی دسترس کا پتہ چلتا ہے اور حضرت علی کے متعلق یہ سب باتیں قابل تسلیم ہیں۔

دوش رسول پر سورہ بقرہ کعبۃ اللہ سے بت توڑنا حضرت علی کا وہ شرف ہے جس میں آپ کا کوئی سیم و شریک نہیں ہو سکتا۔ اور اس روایت کو مستند رک حاکم ج ۳ ص ۳۷ مسند احمد ج ۳ ص ۳۷ اور کنز العمال ج ۱ ص ۱۱۱ سے نقل کیا گیا ہے۔

اور حضرت علی علیہ السلام کی امامت حق پر واضح ترین و حدیث سے جس میں علی کو مع الحق اور حق کو مع علی کہا گیا ہے۔

علامہ علی نے احقاق الحق میں حدیث ص ۲۰۰ فی الجمع بین الصحاح
حق علی کے ساتھ | المستند جناب رسول اللہ نے فرمایا اللہ علی پر رحم کرے۔

”اے اللہ حق کو ادھر پھیر دے جس طرف علی ہو“ اور جمہور نے روایت کی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا عمار کو۔ میری امت میں میرے بعد ناخوشگوار امور ہوں گے اور اختلاف اس وقت تک ہوگا کہ آپس میں آزادانہ تلوار کا استعمال ہوگا اور باہمی قتل و قتال اور ایک دوسرے سے بیزاری کا بازار گرم ہوگا اے عمار تجھے باغی گردہ قتل کرے گا جب کہ تو حق کے ساتھ ہوگا اور حق تیرے ساتھ ہوگا۔ علی تجھے ہلاکت کے قریب نہ کرے گا اور ہدایت سے دور نہ لے جائے گا۔ اے عمار جو شخص تلوار حائل کر کے دشمن کے مقابلہ میں علی کی حمایت کرے گا اللہ بروز محشر اُسے بطور انعام دو موتیوں کے ہار پہنائے گا۔ اور جو شخص گلے میں تلوار لٹکا کر علی کے خلاف اس کے دشمن کی مدد کرے گا۔ اللہ بروز محشر اس کے گلے میں جہنم کے دو طوق ڈالے گا جب اس قسم کی نوبت آجائے تو میرے دائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص یعنی علی کا دامن نہ چھوڑنا۔ اگر تمام لوگ ایک وادی میں ہوں اور صرف علی دوسری وادی میں ہو تو اس وادی میں قدم رکھنا جس میں علی ہو اور باقی تمام لوگوں کو چھوڑ دینا۔ اے عمار۔ علی ہدایت پر رہے گا۔ اے عمار علی کی اطاعت میری اطاعت ہے اور میری اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا اَلْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ وَ عَلِيٌّ مَعَ الْحَقِّ لَنْ يَنْتَرِفَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ (یعنی حق علی کے ساتھ اور علی حق کے ساتھ ہے۔ یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ حوض کوثر پر دونوں میرے پاس وارد ہوں گے)۔

بہر حال تمام وہ اوصاف جو انسان کو پستی سے بلندی کی طرف لے جاتے ہیں حضرت علیؑ میں بدرجہ اتم موجود تھے اور بعض ایسے صفات جن میں سے دو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے مثلاً شجاعت اور نرم مزاجی اسی طرح عبادت و خوفِ خدا میں گریہ۔ حضرت علیؑ میں یہ صفات بھی درجہ کمال پر تھے۔ آج تک چشمِ فلک نے نہ میدانِ کارزار میں علیؑ جیسا بہادری کیا اور نہ مسجد میں اس جیسا کوئی خوفِ خدا سے گریہ کناں دیکھا وہ ایک ہی وقت میں یہاں بے مثال جبرئیلؑ کیسے تھے نرم مزاج اور رحیم بھی تھے وہ دشمنوں کے لئے بے بق۔ قہر قمار تھے۔ اور دوستوں کے لئے سایہ رحمت پروردگار تھے اسی طرح علوم و فنون۔ محاسن و مکارم اور مناقب و معارف کے لحاظ سے فیوض و برکات کا بحر سبکریاں اور سمندر بے پایاں تھے اسی بنا پر ابن عباسؓ کا قول ہے کہ میرا اور جملہ اصحاب رسول اللہؐ کا علم علیؑ کے علم کے مقابلہ میں اس طرح حقیر تھا جس طرح ایک قطرہ آبِ سات سمندروں کے مقابلہ میں۔ (الغدير)

بہر حال علیؑ کی ذات والا صفات ہی اس قابل تھی جس پر حضورؐ کو مکمل اعتماد تھا۔ اسی لئے تو شبِ جبریت انہی کو اپنے بستر پر سلا کے گئے اور اپنی امانتیں ادائیگی کے لئے حضرت علیؑ کے ہی سپرد

کر گئے اور آخری حج (حجۃ الوداع) کے موقع پر خیم غدیر کے وسیع و عریض میدان میں لاکھوں کے سامنے علی کی جانشینی کا اعلان بھی کیا۔ اس سے پہلے سورہ برأت کی تبلیغ کے لئے حضرت ابوبکر کو نامزد کر کے بحکم پروردگار حضرت علی کو اس کے پیچھے روانہ فرمایا کہ یہ اور اس قسم کے پیغامات بحکم خداوندی یا میں پہنچا سکتا ہوں یا وہ جو مجھ سے ہو۔ جب بعض قرآن کی تبلیغ کے لئے ایک آدمی کو حضور نے بحکم خدا اہل نہ سمجھا تو پورے قرآن کی تبلیغ کے لئے پوری امت کے لئے اسے کس طرح موزوں سمجھ سکتے تھے۔

رسالت مآب کی وفات کے بعد ظاہری اقتدار میں رسد کشتی کا ہونا فطرتِ انسانیہ کا تقاضا تھا۔ اور اس پر شرعی اقتضا کو مقدم کرتے ہوئے حقدار کے لئے موقع فراہم کرنا بہت مشکل تھا پس اقتدار دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ سیاسی قیادت حضرت ابوبکر کے ہاتھ میں آگئی اور دینی قیادت اپنی بلند صلاحیتوں کے پیش نظر حضرت علی کے ہی پاس رہی جس طرح بعض علمائے اہل سنت نے بدل نامنا خواستہ اس کا اعتراف کر لیا ہے۔ ان کے بعد حضرت عمر تختِ حکومت پر متمکن ہوئے تقریباً دس سال ان کا دورِ اقتدار رہا پھر حضرت عثمان برسرِ اقتدار آئے تقریباً ۱۲ برس حکومت کرنے کے بعد قتل کر دئے گئے اس پچیس سالہ دور میں حضرت علی حکومت وقت کے تحت ایک عام شہری کی حیثیت سے بسر کرتے رہے نہ ان کے علمی فیوض سے آزادانہ طور پر کسی کو کچھ حاصل کرنا نصیب ہوا اور نہ ان کی نظامی و معاشرتی استعدادات کو بروئے کار لانے کا موقعہ دیا گیا اور نہ ان کی جنگی و فوجی صلاحیتوں کی بدولت ان کی جرات و شجاعت سے استفادہ کرنا مناسب سمجھا گیا۔

رفتہ رفتہ حالات بد سے بدتر ہو چکے تھے اور مجبوراً اہل اسلام کو کوئی ایسا انسان نظر نہ آتا تھا جو ملک بھر میں پھیلے ہوئے ظلم و استبداد سے پیدا شدہ اضطراب کے خلاف اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرے پس چار و ناچار لوگ علی کے دروازہ پر آئے اور ان سے اقتدار سنبھالنے کی درخواست کی لیکن آپ وقت کی نزاکت کو خوب سمجھ چکے تھے اور جانتے تھے کہ اب حکومت حکومت نہیں رہی، بلکہ کانٹوں کا بار بن چکی ہے لیکن صحابہ کے مسلسل اصرار سے آپ عنانِ اقتدار سنبھالنے پر مجبور ہو گئے اور اس کیفیت کا تذکرہ آپ نے اپنے خطبہ شقشقیہ میں بھی فرمایا ہے۔

اب ایک مرتبہ پھر دینی و سیاسی قیادت پچیس سالہ وقفہ کے بعد یک جا ہو گئی لیکن جن حکام نے دینی تقاضوں سے آزاد ہو کر حکومت کی چاشنی لی تھی انہیں کب دینی قیادت کے سامنے جھکنا گوارا تھا جب کہ ان کا اسلام لانا بھی محض زندگی کی حفاظت کی خاطر ہی تھا نہ کہ اسلام کی صداقت کی خاطر اور فتح مکہ کے موقع پر ہی وہ اسلام کے حلقہ جگوش ہوئے تھے پھر زیادہ دیر تک صحبت نبوی میں رہنے کا موقعہ بھی نہ ملا تھا تا کہ ان کے اخلاق و کردار اور عادات و اطوار پر اسلام کی تعلیمات کا اثر ہوتا اور

پھر ان کے دلوں میں ایک طرف اسلامی حقیقت پہنچے نہ تھی اور دوسری طرف جنگ بدر کے مقتول
 رشتہ داروں کا بڑا انتقام بھی کارفرما تھا۔ ان تمام حالات و حقائق کے پیش نظر علیؑ کے قتل کا لازم
 حضرت علیؑ کو ٹھہرا کر اس بہانے سے بغاوت کی داغ بیل ڈال لی اور رفتہ رفتہ افسانہ ساز کہانوں کو شش
 میں دعویٰ خلافت تک پہنچے۔ ان حالات کے پیش نظر حضرت علیؑ نے مدینہ کے بجائے کربلا کے لیے
 قرار دیا تاکہ جنگ و جدال کی وجہ سے مدینہ نبوی کی حرمت ضائع نہ ہو۔ حضرت علیؑ کے چھ سالہ دورِ حکومت
 میں آپؑ کو کبھی چین نصیب نہ ہوا حتیٰ کہ جو غلط اقدامات شرعی نقطہ نظر سے سابق حکومتوں میں کئے گئے
 تھے۔ ان کی بھی اصلاح نہ ہو سکی اور آپؑ کا قیمتی وقت جنگ جمل و صفین و نہروان میں الجھ کر رہ گیا۔ کاش
 امتِ اسلامیہ ایسے عالم و فاضل مدبر و مقنن اور مصلح و محسن نائبِ رسول سے خاطر خواہ استفادہ نہ کر سکی
 آپؑ نے عدل و انصاف حقوقِ نفس و حقوقِ معاشرہ و حقوقِ تمدن حقوقِ رعایا اور حقوقِ سلطان کے متعلق
 جو مفصل ہدایات پیش فرمائیں وہ رشتہ دنیا تک اسلامیانِ عالم کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔ آپؑ کی شہادت
 ۶۳ برس کی عمر میں سنگم میں ہوئی عبدالرحمن بن ملجم مرادی آپؑ کا قاتل ہے انیس رمضان کی صبح کو تلوار کی
 ضرب لگی جب کہ آپؑ جامع مسجد کوفہ میں نماز پڑھ رہے تھے و دو دن بسترِ علالت پر بے چین رہے اور
 اکیس ماہ مبارک کی رات عالمِ بآودانی کی طرف چل بسے۔ آپؑ کا مزار نجف اشرف میں زیارت گاہِ اہل
 اسلام ہے۔ آپؑ کے اقتدار کا زمانہ ۴ سال ۹ ماہ اور ایک دن ہے۔ مروج الذہب ج ۳ ص ۳۵۳

دوسرے امام

حضرت حسن بن علی بن ابی طالب علیہ السلام

آپؑ کی ولادت باسعادت ۵ رمضان ۳۵ مدینہ منورہ میں صدیقہ طاہرہ حضرت فاطمہ زہرا
 بنت رسول اللہؐ کے لطن مبارک سے ہوئی۔ آپؑ کا نام نامی حضرت رسالت مآبؐ نے حسن رکھا
 آپؑ کی کنیت ابو محمد اور لقب محبتی زیادہ مشہور ہے۔ آپؑ کی تقریباً سات برس کی عمر میں آپؑ کے
 نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت ہوئی بچپن میں آپؑ کی تربیت اپنے نانا جان کے زیر اثر
 ہوئی۔ ساتویں دن آپؑ کا عقیدہ بھی رسول اللہؐ نے کیا تھا۔ کئی دفعہ حضورؐ ان کو اپنے دوشِ اقدس پر سوار
 کر کے سیر کراتے تھے بعض اوقات آپؑ منبر پر چلو کر موتے تو امام حسنؑ ان کے پیچھے رہتے۔ تھے
 امام حسنؑ کا چہرہ رسول اللہؐ کے چہرہ کے مشابہ تھا بعض اوقات حالتِ سجدہ میں آپؑ رسول اللہؐ کی
 پشت پر سوار ہو جاتے اور وہ سجدہ سے نہ بلند نہیں کرتے تھے جب تک یہ اتر نہ جائیں۔ حضورؐ کی

محبت کا یہ عالم تھا کہ گود میں بٹھا کر بہت دیر ان کو بوسے دیا کرتے تھے حضرت رسالت مآب سے یہ حدیث کتب صحاح میں مروی ہے آپ نے فرمایا میرے شہزادے حسن و حسین جو انان جنت کے سردار ہیں حضور کی وفات کے تھوڑے عرصے کے بعد ان کے سر سے اپنی والدہ ماجدہ جناب فاطمہ زہرا کا سایہ ہی اٹھ گیا۔ ابتدائی بچپن میں باپ کے علاوہ نانا اور ماں کا سایہ عاطفت بھی رہا۔ اس کے بعد حضرت علیؑ کے زیر سایہ جوان ہوئے۔ حضرت عثمان کی حکومت کے زمانہ میں آپ جبر پور جوان تھے لیکن عمدہ صلاحیتوں اور خوبیوں کے باوجود مخصوص مصالح کے پیش نظر ان کو عوامی ملکی و ملی خدمات کا موقعہ نہ دیا گیا۔ بس اپنے پدر عالیقدر کے ساتھ گوشہ عزلت میں بسر کرتے رہے۔

زید و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں ذکر کیا ہے آپ نے میں تجیں مدینہ سے پایادہ کہیں نہ لگاؤ سواریاں بھی براہ ہو کر تیں آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے شہم آتی ہے کہ بارگاہ پروردگار کی طرف سوار ہو کر جلاؤں۔ بعض روایات میں پچیس جوں کا ذکر بھی ہے (تذکرۃ الخوارج)

حضرت علیؑ علیہ السلام کی شہادت کے بعد آپ کی بیعت کی گئی اور آپ کو سیاسی قیادت کی مسند سونپ دی گئی اور دینی قیادت کے لئے شب شہادت حضرت علیؑ علیہ السلام نے اپنی تمام اولاد کو بلا کر امام حسن کی امامت و سیادت کی وصیت کر دی تھی اور ملاقاتوں کو بھی فرمادیا تھا کہ حضرت رسالت کے بعد امام علیؑ کو براہِ نبیہ سے جس کے ہاتھ میں دینی و سیاسی سرور قیادتیں جمع ہیں اور اقصا آپ اپنے باپ کے بعد اس کے اہل بھی تھے آپ نے اپنے باپ کی طرف کو فوجی کو دار السلطنت رکھا۔

معاویہ حضرت علیؑ کی خلافت کے زمانہ میں بغاوت کا اعلان کر چکا تھا اور کافی علاقے اس نے اپنی جنگی سرگرمیوں جاری رکھتے ہوئے اپنے ساتھ ملا لئے تھے حضرت علیؑ علیہ السلام کی شہادت کے بعد اس کے لئے مزید سہولتیں پیدا ہو گئیں۔ معاویہ نے امام حسن کے خلاف جنگی محاذ کو بہت کافی طاقتور بنا لیا۔ چنانچہ اس نے جباری فوجی جمعیت کے ساتھ عراق پر حملہ کرنے کے لئے اپنے ایک جرنیل کو روانہ کر دیا۔ معاویہ خود بھی جنگی چالوں میں کسی سے کم نہ تھا لیکن اس کا وزیر اعظم عروہ عاص جس نے فوجی تعلیم میں مسلمانوں کے اتحاد کی علامت کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور اس سے پہلے ہنگامہ نہیں کی شکست کو قرآن کو نیزوں پر مبرا کر کے فتح سے تبدیل کر چکا تھا وہ سیاست کا رنگ گھٹال تھا اس لئے چند ہی دنوں میں حالات کی ایسا عوارض کر کے کہ وہی کہ امام حسن کے لئے قدم قدم پر کانٹوں کا جال بچھا ہوا تھا پس آپ نے حالات سے نمٹنے کے لئے ہتھیار چھوڑ دیئے۔ سب سے پہلے ہتھیار چھوڑنے کے حوالہ کرنے میں بھلائی بھی آپ کے لئے تھی۔ ہتھیار چھوڑنے کے بعد امام حسن کے آخری لمحے میں چھوڑ دیئے اور چند دن تھا آپ بیمار تھے۔

دست بردار ہو گئے۔ اور کشت و خون کے لرزہ خیز انجام کو بھانپ کر حکومت سے استعفا دے دیا۔
 اس کے بعد کچھ عرصہ تک آپ کو فہ میں رہے پھر معاویہ نے ان کو شام آنے کی دعوت دی۔ پس
 آپ دمشق تشریف لے گئے اور چند دن وہاں رہ کر مدینہ میں آ گئے۔ تقریباً سینتالیس برس کی عمر میں
 ۲۸ صفر ۴۰ھ کو زہر سے شہید ہوئے۔ معاویہ نے جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ سے زہر دلوائی تھی مروج ائذیح ۲۰۳
 واقعی سے منقول ہے کہ امام حسن نے وصیت کی تھی کہ مجھے قبر رسول کے پاس دفن کیا جائے
 لیکن بنی امیہ نے وہاں دفن نہ ہونے دیا۔

اور حضرت عائشہ بھی امام حسن کے روضہ رسول میں دفن ہونے کے خلاف تھیں (تذکرۃ الخواص)
 پس آپ کی لاش مبارک کو جنت البقیع میں سپرد خاک کیا گیا۔
 تیسرے امام

حضرت حسین بن علی بن ابی طالب علیہ السلام

ولادت با سعادت ۳ شعبان المعظم ۴ھ مدینہ منورہ میں سیدہ طاہرہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا
 کے لطن مبارک سے ہوئی۔ آپ کا نام نامی بھی حضور نے رکھا۔ ساتویں دن عقیقہ کیا۔ آپ کی کنیت ابو عبد اللہ
 اور لقب سید الشہداء زیادہ مشہور ہے۔ چھ برس کی عمر میں نانا کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا پھر شیعہ
 روایت کے ماتحت زیادہ سے زیادہ نانا کے بعد ۳ ماہ تک ماں کا سایہ سر پر رہا اور یہ بھی ختم ہو گیا۔
 حضور کی ان سے بے حد محبت تھی کندھوں پر سوار کر کے دونو بھائیوں کو مدینہ کی گلیوں میں بعض اوقات
 پھراتے رہے ان کے لبھائے مبارک کے بار بار بوسے لیتے تھے حدیث صحیح میں آپ نے فرمایا حسن و
 حسین جو انانِ جنت کے سردار ہیں۔ آپ آیت تطہیر کے بھی مصداق ہیں کیونکہ حضور نے حضرت علی حضرت
 فاطمہ امام حسن اور حسین ان سب کو اٹھا کر کے ان کے اوپر ایک چادر ڈال دی اور آیت تطہیر پڑھی اور پھر
 کہا اے خدایہی میرے حقیقی اہل بیت ہیں (تذکرۃ الخواص نقلاً از مسند احمد بن حنبل) آپ بھی حالت
 سجدہ میں بعض اوقات رسول اللہ کی پشت مبارک پر سوار ہو جایا کرتے تھے اور اتنے تک حضور سر نہ
 اٹھاتے جب تک یہ اپنی مرضی سے اتر نہ جاتے۔ آپ کا بھی دستور تھا کہ ہر سال پایادہ حج بیت اللہ
 کو جاتے تھے (تذکرۃ الخواص)

ایک دفعہ امام حسین مسجد نبوی میں داخل ہوئے جب حضرت عمر بن رسول پر بیٹھ کر تقریر کر رہے
 تھے تو آپ نے دیکھ کر فرمایا میرے باپ کے منبر سے اتر آؤ۔ حضرت عمر نے اٹھایا اور اپنے پیلو

میں ان کو بٹھالیا۔ (تذکرۃ الخواص)

آپ چھ برس ابتدائی اپنے نانار رسول اللہ کے زیر سایہ رہے پھر خلفائے ثلاثہ کے سیاسی اقتدار کو دیکھا۔ پانچ برس اپنے والد ماجد کی حکومت کے سائے میں کوفہ میں رہے اور سیاسیاتِ ملکیہ میں نمایاں کردار ادا فرمایا چنانچہ جنگِ صفین میں آپ نے جنگی صلاحیتوں کا بھی مظاہرہ فرمایا۔ حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد چھ ماہ تک امام حسن علیہ السلام کے اقتدار کا زمانہ دیکھا۔ پھر اپنے بھائی کے ہمراہ واپس مدینہ میں پلٹ کر آ گئے اور بیس برس متواتر معاویہ کے دور اقتدار میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ۲۲ رجب کو معاویہ مر گیا اور اس کا بیٹا یزید غنیمتِ نشین ہوا۔ ہوا کے ساتھ ساتھ اسلامی اقتدار کو بدلنے والے جمہور مسلمانوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور زہری کہتا ہے مجھے سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن عمر پر تعجب آتا ہے کہ انہوں نے حضرت علی کی بیعت تو نہ کی لیکن یزید کی بیعت کر لی۔ (تذکرۃ الخواص)

حالاتِ مذہبی و سیاسی لپٹا کھا چکے۔ تھے سابق حکومتوں نے مذہب اور سیاست کو اور دین و حکومت کو ایک سمجھ رکھا تھا۔ پہلی تین حکومتوں میں عوام کے ذہن نشین کرنا کہ "اقتدار الگ ہے اور دین الگ ہے" بہت مشکل تھا کیونکہ زمانہ پیغمبر کے قرب کی وجہ سے اسلامی تعلیمات سے متاثر عوام چونکہ سلاطین وقت کو بھی ظاہر ہی طور پر اسلامی کردار کا حامی پاتے تھے لہذا وہ اس دقیق فرق کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس لئے حضرت علی نے تھوڑے دنوں تک مجالسِ انصار میں پہنچ کر اپنی آواز بلند کی تو اس نتیجہ تک پہنچے کہ سردست خاموشی ہی بھلی ہے پس سب ضرورت مسائل بیان کر دیتے تھے جب کوئی دریافت کرتا تھا ورنہ خاموش ہی رہتے تھے۔

رفتہ رفتہ حکومت و اقتدار کا نشہ اپنا اثر ظاہر کرتا رہا اور اسلامی معاشرہ سیاسی رنگ میں رفتارِ زمانہ ڈھلتا گیا اور عثمانی دور میں لوگوں کی آنکھیں کھلنے شروع ہوئیں کہ اسلام کچھ اور تھا اور یہ حکومت کچھ اور ہے لیکن کسی اقتدار کی حمایت میں پیش کیا گیا یہ حکومت پر لب کشائی نہیں کرنے دیتا تھا لوگ غلیظہ کی ہر بے راہ روی کو دامنِ تاویل میں جکڑ دیتے رہے لیکن حالات دن بدن خراب ہوتے چلے گئے اور غلیظہ لوگوں کی اس چشم پوشی سے مزید جبرأت اپنے اندر محسوس کرتا گیا اور آگے بڑھتا بڑھتا گیا یہاں تک کہ عوام کا دامن صبر و ضبط اور دائرۃ تاویل و تمہیل تنگ ہو گیا اور ان کا رجحان کے احسہ دہی نصرتِ حق ہو گئے پس انجام کار حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔

سب حضرت علی کی ظاہر ہی بیعت تو ہو گئی اگر ان کو آرام و سکون سے سلطنت کے امور کو

سنجھانے کا موقع ملتا تو سیاسی اقتدار کی طرف سے لائی جونی خابیاں تدریجاً ختم ہو جاتیں اور اسلام اپنے اصلی نہرو حال میں منظر عام پر ملٹ کر آجاتا لیکن جس اقتدار کے متوالے اور کرنی حکومت کے دیگر خواہشمند فوراً قتل عثمان کا بہانہ لے کر میدان میں کود پڑے اور حضرت علی کو اسلامی اقدامات کا موقع تک نہ دیا پس دین و سیاست اور اسلام و اقتدار میں نمایاں فرق معلوم نہ کیا جاسکا اور عوام الناس کی حالت یہی رہی کہ جس کی لاکھٹی اس کی معنیس۔ الناس علی دین مکر کہہ کر لوگ بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں پس حضرت علی کے بعد معاویہ برسر اقتدار آیا تو اس نے دینی و مذہبی اقتدار کو کافی متکبر ختم کر دیا لیکن مہجور اہل علوم اس کے اخلاف کو بھی صحابیت کے دامن میں چھپانے کی کوششیں ہیں رہے اور جنگ بھل، صفین و نہروان میں قحطِ آبست جو حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کا موقع ملا تھا معاویہ کے دورِ حکومت میں اس کے اثرات کو ختم کر دیا گیا اور سرکاری احکام کے ذریعے سے حضرت علی اور اولاد علی پر لعن و طعن کی جو عمت شروع ہوئی اس نے پھر حکومت کو دین اور اقتدار کو مذہب بنا کر رکھ دیا اور اس دور پر آشوب میں جن لوگوں نے حضرت علی کے حق میں اچھی عقیدت کا اظہار کیا ان کو عبرت ناک اور سخت سے سخت سزا دی گئی۔ خاندانوں کے خاندان برباد کر دئے گئے اس مجرم میں کہ وہ علی سے محبت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ نہ رسول کے سامنے سجدہ نبوی میں منہ رسول کے اوپر اموی خلیفہ حضرت علی کو گالیاں دیا کرتا تھا اور اولاد علی کو مجبوراً سب کچھ سن کر بداشت کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ مورخوں کی صاحب بھی مخالفت و ملکیت سخت پر اس امر کا اعتراف کر چکے ہیں۔

من مہجرت کے پیش نظر ایک اہم دست اقدام کی ضرورت تھی اور لوگوں کو کافی طاقت و قوت کے اندر لے اس لیے اس لیے غفلت اور غریبیت سے بچانا تھا اور انہیں ایک بار پھر بارگاہِ حاکم اقتدار اور دین و ملک ایک ہی چیز میں اور اب حضرت علی کے زمانہ کی طرح مہجرت نہ تھے کہ لوگ اقتدار اور مذہب میں فرق نہ کر سکیں کہ جو کس وقت اقتدار کا دور ہے مذہب کے قریب قریب تھا جس لئے فرق کرنا عوام کے لئے مشکل تھا لیکن اس وقت اقتدار کا دور مذہب کے دانت سے بہت دور نکل گیا تھا اور حکومت کا دور اصل اسلام کی گودار سے بہت فاصلہ ہو چکا تھا اس لئے عرب خور کہہ کر مہجرت کو بجا ہونے کی تھا جس کا دور بھی عہدِ اسلام نے عرب کی فتنہ نشینی کا دور ہوئے ہی مگر بہت باغی اور فاضل کی پشت پر سرد ہو کر مہجرت کے گہرے گہرے سے لے کر جو اسلام کی تشریح کی گئی تھی کہ وہی سردیوں کے لئے حق و باطل اسلام و اقتدار اور ابست و ملکیت کے درمیان ایک عظیم تقابلی نشان کا نام لیا ہے مگر گہرے نشانہ نہیں ہاں

آپ حب مدینہ سے چلے تو مکہ ہی منزل مقصود تھی اور چہار ماہ کا عرصہ وہاں رہے۔ عبداللہ بن زبیر بھی مکہ ہی میں تھا۔ اموی غیر اسلامی حکومت اور ان کے مظالم کے تذکرے اور اسلامیان عالم کے لئے اس سے نجات پانے کی تدابیر بھی زیر غور آتی رہیں لیکن پوری طاقت کے بغیر کسی اقتدار کا تختہ الٹنے کا تصور بھی کوئی دانا انسان نہیں کر سکتا اور خصوصاً جب کہ یزید حبیب مذہب و دین کی قیود سے آزاد نافرمان انسان تحت حکومت پر ممکن ہو جس سے اقتدار کی حفاظت کے لئے ہر بڑے سے بڑے گناہ اور سخت سے سخت جرم کو گزرانے کی توقع کی جاسکتی ہو اور ایسے حالات میں جب کہ لوگوں میں دینی قیادت اور سیاسی قیادت کے درمیان فرق کا تصور بھی نہ ہو۔ بنا بریں مودودی صاحب کا یہ دعویٰ قطعاً حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ بلاشبہ وہ اہل عراق کی دعوت پر یزید کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے لشکرینے جارہے تھے، خلافت و ملوکیت۔ بلاشبہ مودودی صاحب کا یہ شبہ غلط ہے جس کو اگلے لفظوں میں خود انہوں نے اپنے قلم سے باطل کر کے رکھ دیا ہے۔ فرماتے ہیں: یہ تو امر واقعہ ہے کہ وہ کوئی فوج لے کر نہیں جارہے تھے بلکہ ان کے ساتھ ان کے بال بچے تھے اور صرف ۳۲ سوار اور چالیس پیادے۔ اسے کوئی شخص بھی فوجی چٹھانی نہیں کہہ سکتا، اگر اسے فوجی چٹھانی کوئی نہیں کہہ سکتا تو ایک بہت بڑی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے روانگی اسے کون کہہ سکتا ہے؟

بے شک حضرت حسین علیہ السلام حکومت وقت کی سیاسی قیادت کا نہیں بلکہ اس کے مقصدِ عظیم | ضمن میں جوانوں نے اسلامی حکومت اور دینی قیادت کا دعویٰ کر رکھا تھا اس کا پردہ چاک کرنے جارہے تھے یعنی ان کی اسلامی برتری اور مذہبی سربراہی کا تختہ الٹنے جارہے تھے اور اس کے لئے فوج کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کے بجائے عزمِ عظیم اور قلبِ قویہ کی ضرورت تھی جس کو وہ اپنے سینہ میں رکھتے تھے پس آپ فتح مند بنونے اور یزید کی دینی قیادت کا تختہ بالآخر الٹ ہی گیا۔ اور اس وقت تک جو لوگ برسرِ اقتدار طبقہ کی دینی قیادت کے قائل تھے انہیں اسلام کے صحیح راستہ کو معلوم کرنے میں آسانی ہو گئی اور وہ سمجھنے کے قابل ہو گئے کہ پیغمبر کے زمانہ کے فوراً بعد ہی سے قیادت دینی و قیادت سیاسی کے دونوں شعبے الگ الگ ہو گئے تھے اور سیاسی حکمران محض سیاست کے مفاد کے لئے ہی مذہب سے رابطہ قائم رکھتے ہوئے تھے بلکہ مذہب پر اپنی اجارہ داری کا جھنڈا لہرا رکھا تھا اور شہادتِ عظمیٰ حسین نے حقیقت کے منہ پر پڑے ہوئے سب پردے چاک کر ڈالے اسی وجہ سے جمہور اہل اسلام کے بعض علماء نے غزوہ اربعہ کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے کہ اس سے بعض صحابہ کے متعلق بدگمانیوں کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور یزید پر لعن کرنا بھی اسی لئے ناجائز قرار دیا ہے کہ کہیں یزید کا باپ اور دیگر صحابہ

اس لپیٹ میں آجائیں جیسا کہ مودودی صاحب نے خلافت و مملوکیہ کے صفحہ ۱۴۲ پر ہی اظہارِ گفت کیا ہے۔

یہاں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے گناہ نے جو دم کے بعد بھی کیا وہ لوگ اپنے آپ کو دین و اسلام کا حامی و رکن سمجھتے تھے تاہم اس کی حقیقت مخالفت و ملکیت میں تاہم یہی کمال ابن اثیر اور البہاریہ کے حوالوں سے ملاحظہ ہو۔

اس کے بعد ان اہل حقیت تمام شہداء کے گروہوں کے سربراہوں کو فوجیں بھیجیں
اور ان کے زبانون سے یہ دعویٰ جاری کیا کہ ہم ان کی فحاشی کی بلکہ باطل و منکر میں بہرہ پہنچانے کے لیے
کیا کہ الحمد للہ الذی انھم المؤمنون الصالحون و الصالحات و الصالحات و الصالحات و الصالحات
و قتل الذئاب بنو الذئاب الحسین بن علی و شیعتہ ص

ترجمہ۔ اس اللہ کا شکر ہے جس نے حق اور حق والوں کو کامیاب کیا اور امیر المؤمنین زید اعداس کے لشکر کی ہلاکت کی۔ اعداس کا لفظ کذاب بنی کذاب معین بن عباس کے مشیموں کو تسلیم کیا۔

اس سے صاف واضح ہے کہ یزید کے حکام یزید اور یزیدیوں کو اہل حق سمجھتے تھے اور حسین اور شیعیان
حسین کو اہل باطل قرار دیتے تھے اور یزید کو اہل اسلام ان کے اس نعرہ میں ان کے منہواتے اور جس مسلمان کو
یزید یوں کی طرف سے حق کا نام دیا جاتا تھا اسے حسین اور شیعیان حسین کے نزدیک وہی باطل تھا۔

یہ نیکو لوگ نے یہاں شہداء کے گریباں یعنی اسات صحت کو شہر لپٹ کر اور وہاں چھپانے میں حکومت
کی جگہ فی گنجی دینی خیال کرتے تھے کہ اس طریقے سے لوگوں پر حکومت کا دھب غلامی جو کمالہ شیطان ملی کی
تو کب ختم ہو جائے گی لیکن یہی حکومت نے دینی قیادت کا الگ نعرہ ختم ہو جانے کا اور مذہب
حرف جو مصلیٰ اسلام ہی ہے۔ کا جو بہرستی اختیار سمجھانے والے کے ہاتھوں میں کھلا نابین کے یہاں
کھلا اس دوری شہر کا جو شریعت موعودہ و عید می کا جو ایک ہی اسی کا لٹا اثر یہ جو اگر جہاں جہاں سے یہ
اسیہ ال کال کالنا جو اقامت لگنا گیا لوگوں کے دلوں میں حکومت کے خلاف جذبات ابھرتے گئے
اور لوگ سمجھنے پر تیار ہو گئے کہ اقتدار کا استیصال جاتا ہے اور دینی قیادت کی منزل مقصد کیا ہے۔
اس کے بعد یہی ہی فرق کے باعث مینہ اللہ وال کی تاملاتی قتل عام اور بے عزتی کے وجہ فرسا
واقف لے چکے ہیں۔ مصلیٰ اسلام کے دل ہاں سے ان کو خلافت کے واسطے میں یہ کفر و عناد اور
نفاق و الحاد کا محسوس نظر آنے لگا چھرا اسی فرق کے ہاتھوں کعبہ کی بے عزتی اور مہر پر لگا کی تو میں نے
نفاہر میں فسادات کھٹے والوں کے لئے قطعاً سبک دہ کی گہا نشہ باقی رکھی کہ وہین واقف

دو لگ لگ چنریں ہیں۔ واقعہ ہائیکہ کر بلا۔ المحرم ۱۰۰ھ بروز جمعہ ہوا۔

فتح حسین

ان واقعات کے نتیجہ میں اموی سلطنت کی طرف سے عامۃ المسلمین کے دلوں میں تنفہ کی لہر دوڑ گئی۔ پس اقتدار کے قدم اڑکھڑانے لگ گئے۔ شہادتِ حسین کا المیہ چونکہ عراق کا حادثہ تھا اس لئے خونِ حسین کے انتقام کا نعرہ بلند کر کے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی نے اموی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا لوگ و ستر و ستر اس کے جھنڈے تلے جمع ہوئے اور کوفہ کا پایہ تخت پوری طرح ان کے زیر نگیں ہو گیا۔ اموی فوج نے مقابلہ کیا لیکن بُری طرح انہوں نے شکست کھائی اور قائدانِ حسین کو مختار نے چن چن کر بُری طرح مروایا اور تاراجی مدینہ و توہین کعبہ سرزمینِ حجاز کے المیے تھے۔ اس لئے عبداللہ بن زبیر نے اس صوبے میں اموی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور اس صوبے پر اس کے اقتدار کا سکہ بیٹھ گیا پس اسلامی سلطنت تین گروپوں میں تقسیم ہو گئی۔ مختار کے فصل واقعات جاری۔ اب مختار اور ابن زبیر کے درمیان جنگ اقتدار نے سر اٹھایا اور دونوں طرف سے بے شمار خون کے دریا بہنے لگے۔ بنی اُمیہ کے لئے ان کی باہمی جنگ مفید ثابت ہوئی۔ مصعب بن زبیر کے ہاتھوں مختار مارا گیا اور زیادہ لڑائیوں کی وجہ سے فوج پر کمزوری مسلط ہو گئی پس بنی اُمیہ کی مجموعی طاقت کے مقابلہ میں ابن زبیر کی فوجیں نہ ٹھہر سکیں اور یہ بھی مارا گیا اور اقتدار پھر ایک مرتبہ بنی اُمیہ کے بدترین خاندان بنی مروان کے ہاتھ میں آ گیا اور تمام اسلامیان عالم دوسری دفعہ پھر اموی سلاطین کے مظالم کی زد میں آ گئے۔

واقع کی سرزمین جہاں ایک وقت حضرت علی کی حکومت کا پایہ تخت تھا اور واقعہ عظمیٰ کر بلا بھی اسی سرزمین پر ہوا۔ اس کے نتیجہ میں مختار نے انتقامِ خونِ حسین کا نعرہ بلند کر کے شیعہ تحریک کو اس صوبہ میں کافی مضبوط کر لیا تھا۔ اسی لئے اموی حکومت کی جانب سے یہاں کا گورنر حجاج بن یوسف کو مقرر کیا گیا جس کے نزدیک انسان کی جان کی قیمت ایک چھوٹی کے برابر بھی نہ تھی۔ حضرت علی اولاد علی اور شیعان علی پر سب و شتم کا دور دورہ زوروں پر ہو گیا اور شیعان علی کو بلا ویرغ تیرغ کیا جانے لگا۔ اور اس کے ظلم کی داستان مودودی صاحب اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

اس حجاج بن یوسف کے زمانے میں جو لوگ قید کی حالت میں کسی عدالتی فیصلے کے بغیر قتل کئے گئے صرف ان کی تعداد ایک لاکھ بیسٹل ہزار بتائی جاتی ہے جب وہ اسے تو اس کے قید خانوں میں ۱۰ ہزار بے قصور انسان کسی مقدمے اور کسی عدالتی فیصلے کے بغیر سڑے تھے اور یہی کم گورنر تھا جس کے حق میں عبدالملک نے اپنی اولاد کو مرتے وقت وصیت کی کہ "حجاج بن یوسف کا ہمیشہ لگاؤ کرتے رہنا کیونکہ یہ وہی ہے جس نے مجھے اس سلطنت ہموار کی دشمنوں

کو مغلوب کیا اور ہمارے خلاف اٹھنے والوں کو دبا دیا ص ۱۸۶۔

اچھا ہوا کہ تہو ر اہل اسلام کے مسلک کی تشکیل اموی دور میں نہ ہوئی ورنہ اگر مذہب مجبور کی تشکیل اموی دور میں ہوتی تو چوتھی جگہ نسیفہ ہوتا تو درکنار حضرت علی کا صحابہ میں بلکہ اہل اسلام کی فہرست میں تہیٰ نم نظر نہ آتا اور شیعیان علی سے حضرت علی کے اسلام کا ثبوت طلب کیا جاتا۔

بہر حال شہادت حسین نے جہاں ایک طرف شیعیان علی میں ثبات قدم اور غیرت نفس کا جذبہ بھڑایا وہاں تہو ر اہل اسلام کو اس اصول (قیادت دینی و سیاسی کی وحدت) کے ٹوڑنے پر مجبور کر دیا اور ثابت کر دیا۔ اقتدار اور دین لازم و ملزوم نہیں ہیں اور دینی و سیاسی قیادت کے راتے الگ الگ ہیں۔ وہ اگرچہ اپنی آبائی تقلید اور کثرت کی بے ہوشی کے تاثر سے نکل جانے کی جرات کر کے شیعیان علی کے ہمہوا تو نہ ہوئے لیکن اپنے سابق طریق پر بھی جم نہ سکے اور ان کو مجبوراً دینی قیادت کا راستہ سیاسی قیادت سے الگ کرنا پڑا یزید اور اس کے بعد کے سلاطین جو کہ کردار بد پر پردہ ڈالنا چھوڑ دیا البتہ وہ معاویہ و عثمان کی غلط کاریوں پر لیب پوت کا پردہ دے کر آبائی تقلید کی لاج رکھتے ہوئے ان کے احترام کو خیر باد نہ کہہ سکے اور ان سے سابق حکمرانوں کے متعلق تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ واقعہ کریم کی منسل روداد اصحاب الہیین میں پڑھیے۔

چوتھے امام

حضرت علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام

آپ کی ولادت باسعادت مدینہ منورہ میں حضرت علی علیہ السلام کی خلافت ظاہریہ کے زمانہ میں ۲۵ جمادی الاولیٰ کو ہوئی۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام نامی شاد زنان تھا۔ بعض مورخین نے سن ولادت ۳۵ھ اور بعضوں نے ۳۷ھ بھی لکھا ہے (تذکرہ)

قول مشہور کی بنا پر واقعہ کر بلا میں آپ کی عمر شریف تقریباً ۲۳ برس تھی مشہور روایت یہ ہے کہ آپ کی ولادت کے چند دن بعد آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔

واقعہ کر بلا میں آپ پورے جوان تھے لیکن بیماری کی وجہ سے شریک جنگ نہ ہوئے آپ اسیری کے علاوہ ماؤں بہنوں بچپنوں اور دیگر مخدرات خانوادہ عصمت کی بے پردگی کے روح فساد واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے لیکن اپنے صبر و ضبط اور ہمت و استقلال میں فرق نہ آنے دیا۔ زندانِ شام سے رہائی کے بعد واپس مدینہ میں پہنچے اور پورے ۳۵ برس کی بقایا زندگی گوشہ عزلت میں بہر حال عجم بچشم غم گزار دی۔

نزد و قتلوی کا یہ عالم تھا کہ آپ وضو کو دیکھ کر بدن ٹھرا جاتا تھا اس تک نہ ہو جاتا تھا جب
وہ پوچھی جاتی تو فرماتے تھے تمہیں کیا خبر کہ میں کس کے برابر میں حاضر کی تیاری کہ باہوں بہ آپ
نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو مجھ مبارک میں لڑھکاری بتاتا تھا۔ دریافت کرنے پر فرماتے تھے تمہیں
کیا معلوم کہ میں کس ذات سے مناجات کرنا چاہتا ہوں التذکرۃ الخواص

بلندی اخلاق و کردار کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ کو دل کھول کر ناسزا لگایا کہ
آپ خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے پھر آپ اس کے گھر میں گئے لوگوں کا خیال تھا کہ آپ انتہائی غامض
کریں گے لیکن آپ نے اس سے فرمایا کہ جو کچھ تو نے مجھے کہا ہے اگر درست تھا تو خدا مجھے معاف کرے
اور اگر غلط تھا تو خدا تجھے معاف کرے پس اس نے آپ سے معافی مانگ لی۔

ہر رات کو ایک ہزار رکعت پڑھنا آپ کا معمول تھا (تذکرہ) اس پر ابن تیمیہ کا اعتراض مفسر اس
کی اموی عصیت کا انبار ہے اور یہاں اس کے جواب کا مقام نہیں رہا اس کا منسل جواب مقدمہ
تفسیر انوار النجف اور کتاب عقائد لفقہ الانوار میں دے دیا ہے آپ کا یہ دستور تھا کہ ہر رات کو
روٹیوں کا گٹھا اٹھا کر مساکین مدینہ کو غذا پہنچاتے تھے جب آپ کی رحلت ہوئی تو معلوم ہوا کہ آپ سے
ایک سو خاندان کے افراد آپ کے زیر کفالت زندگی گزار رہے تھے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے میرے والد ماجد حضرت علی بن الحسین علیہما السلام فرمایا
پانچ قسم کے لوگوں کو درست نہ سمجھئے۔

- (۱) فاسق۔ کیونکہ وہ ایک تقریباً اس سے بھی کم قیمت پر تم کو فروخت کرے گا۔
- (۲) بخیل۔ جب ضرورت کے وقت اپنے مال کی اخلاص سے راز راہ بخل، مخدوم کرے گا۔
- (۳) جھوٹا۔ اس کا قول سراب ہے حقیقت کی مانند ہے قریب کو بعید اور بعید کو قریب ظاہر کرے گا۔
- (۴) احمق۔ وہ اپنے پہنچانے کے ارادے سے بھی تجھے نقصان دے بیٹھے گا۔
- (۵) قاطع الزم۔ کیونکہ اس کو میں نے کتاب اللہ میں متعدد مقامات پر ملعون پایا ہے۔

آپ کی زندگی میں سیاسی انقلابات کافی رونما ہوئے آپ کی ڈیڑھ دو برس
کی عمر میں آپ نے دادا بزرگوار حضرت علی علیہ السلام کی شہادت ہوئی پھر
چھ ماہ کے بعد آپ کے چچا بزرگوار امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام بھی اقتدار سے دستبردار ہوئے اور کئی اقتدار
پر معاویہ کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ ۴۰ھ میں معاویہ نے آپ کو مقرر کیا گیا اور ۴۲ھ میں واقعہ حرا پیش
آئے ہیں کہ بلا کا دل ہلا دینے والا سانحہ عظمیٰ پیش آیا چھ دو سال بعد ذوالحجہ ۴۳ھ میں واقعہ حرا پیش

سیاسی انقلاب

آیا جب کہ اہل مدینہ نے یزید کے ظلم و ستم اور کفر و عناد کی داستانیں سن کر اس کی بیعت توڑ ڈالی اور عمرو بن
خطلمہ کو اپنا سربراہ بنالیا۔ یزید نے مسلم بن عقبہ کو ۱۲ ہزار فوج دے کر تمارا جی مدینہ کے لئے بھیجا۔ اس ظالم نے
مدینہ کو فتح کر کے تین دن تک فوجیوں کو شہر میں ہر قسم کا اودھم مچانے کی کھلی چٹی دے دی۔ مدینہ نبوی میں
لوٹ لھوٹ اور قتل و غارت کا خوب بازار گرم ہوا چنانچہ نہایت محتاط انداز سے سات سو
معززین اور دس ہزار عوام مارے گئے۔ اور عورتوں کی آبروریزی کی کوئی حد باقی نہ رہی حتیٰ کہ کم از کم ایک ہزار
عورتیں زیادہ سے زیادہ دس ہزار عورتیں زنا سے حاملہ ہوئیں۔ (تذکرۃ الخوارج)
اور بعض روایات میں ہے کہ سب سے نبوی میں اس قدر قتل عام ہوا کہ خون نبوی سے جاری ہوا
اور قبر مطہر بھی خون آلود ہو گئی۔

اس روح فساد و فحش میں حضرت علی بن الحسین علیہ السلام اپنے گھر مدینہ میں ہی تھے اور آپ نے
بہت سے آدمیوں کو اپنے گھر میں پناہ بھی دی تھی۔ واقعہ حورہ کے تین ماہ بعد یزیدہ اصل جہنم ہوا۔ (تذکرۃ)
تمارا جی مدینہ کے بعد ہی ظالم فوج مکہ پر چڑھ دوڑی اور ہر کم کعبہ کی انہوں نے توہین کا ادا کیا۔ ظالم سپہ سالار
مسلم بن عقبہ راستہ ہی میں مر گیا اور حسین بن زبیر کو اپنا جانشین مقرر کر گیا انہوں نے منافقوں سے کعبہ پر چڑھ
برساتے اور غلات کعبہ کو نذر آتش بھی کیا اور باں ماہ ربیع الاول میں یزید کی موت کی خبر پہنچ گئی۔ علیہ لعنتہ اللہ
پھر عبدالملک کے زمانہ میں دوبارہ حجاج بن یوسف کی زیر سرکردگی بھی بیت اللہ پر سنگبارانی ہوئی۔ یزید
کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید تخت نشین ہوا لیکن اس نے فوراً استغناء دے کر اقتدار سے علیحدگی اختیار
کر لی اس لئے کہ وہ اس اقتدار کا مالک اولاد علی کو سمجھتا تھا اور بنی امیہ اس کے نزدیک غاصبین تھے۔

پس بنی امیہ نے مل جل کر مروان بن الحکم کو تخت اقتدار پر بٹھا دیا یہ بھی ۳ رمضان ۴۵ھ کو مر گیا
اور المشرقیین مروان کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک بن مروان تخت نشین ہوا۔ اس نے اموی عصیت
کے ماتحت عراق میں حجاج بن یوسف جیسے سفاک انسان کو گورنر بنا کر شیعان علی پر ظلم کے جوہر پاڑ کر اسے
کوئی دوسری حکومت اس کی نظیر پیش نہ کر سکی۔

عبدالملک بن مروان کے بعد اس کا بیٹا ولید بن عبدالملک تخت حکومت پر ٹھکان ہوا۔ اور اسی کے
۴۵ھ حکومت میں ۲۵ محرم ۷۹ھ کو حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام نے نہایت شہادت پائی
اور مدینہ کے قبرستان جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

حضرت محمد بن علی بن الحسین الباقر علیہ السلام

آپ کی ولادت یکم رجب سنہ ۵۰ھ مدینہ منورہ میں ہوئی آپ کی والدہ ماجدہ جناب فاطمہ بنت حسن بن علی علیہم السلام تھیں۔ آپ کی کنیت ابو جعفر ہے۔ آپ پہلے فاطمی ہیں بن کے ماں اور باپ دونوں فاطمی تھے۔ تذکرۃ الخواص میں ہے کہ آپ کا لقب باقر یا تو اکثریت سجدہ کی وجہ سے ہے یا وسعت علمی کی بناء پر اور شاکر و صافی بھی آپ کے القاب میں سے ہیں۔ آپ سے ابو حنیفہ نے بھی روایات لی ہیں اور گویا وہ بھی آپ کے شاگردوں میں تھے، (تذکرہ)

یصحیح قول کے مطابق آپ کی شہادت ۵۰ھ بمطابق ۶۱ھ کی عمر ۵۰ برس اور کچھ ماہ تھی۔ بہت بقیہ میں دفن ہوئے۔ آپ علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں اپنے اہل زمانہ سے افضل تھے۔ آپ کو شام بن عبد الملک کے حکم سے زہر لوانی لگنی۔ آپ نے اپنی زندگی میں بڑے انقلابات دیکھے اور سخت سے سخت مراحل سے گزر کر آپ آگے بڑھے تقریباً آپ کی عمر ساڑھے تین برس تھی جب واقعہ بالمدہ کر بلا پیش آیا پھر اپنے تمام کنبہ کے ساتھ حالت اسیر ہی میں آپ شام بھی گئے اور وہاں سے رہا ہو کر مدینہ میں آئے۔ آپ کے بچپنے کے زمانہ ہی میں واقعہ مرو پیش آیا جس میں بہت سے سادات بے خاں ہو گئے۔ آپ اپنے والد ماجد کے نیر سایہ مدینہ میں ہی رہے۔ حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کی شہادت کے وقت آپ کی عمر تقریباً ۴۵ برس تھی۔ ولید بن عبد الملک کے بعد آپ نے سلیمان بن عبد الملک کا دور دیکھا پھر عمر بن عبد العزیز کا زمانہ دیکھا اور اس کے بعد یزید بن عبد الملک کا دور آیا۔ پھر شام بن عبد الملک تخت نشین ہوا تو اس نے آپ کو سیاسی اغراض کی بنا پر لکھا۔ فردوسی نے اسے کی دعوت بھی دی چنانچہ آپ تشریف لے گئے اور بحیرہ سمیت واپس آئے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے جانی عزیز کو شام بن عبد الملک نے شیکر کے سولی پر چھڑایا۔ شام کی طرف سے کوثر کا گورنر یوسف بن عمر و ثعلبی تھا بہت ظالم تھا۔ یہاں تک کہ شام بھیجا گیا اور لاش کو عربیہ کے کنارے کوثر میں سولی پر لٹکایا گیا۔ یوسف بن عمر و ثعلبی کی حمایت کے مطابق یوسف سے چاہیں بیٹے رہیں لاش سولی پر لٹکی رہی۔ شام کے بعد جب ولید بن یزید بن عبد الملک تخت نشین ہوا تو اس نے لاش کو جلادینے کا حکم دیا۔

مذہب جمہور کی تشکیل و تنظیم | حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے مذہب جمہور

اہل سنت کا کوئی ضابطہ نہ تھا اور نہ اصول و فروع میں ان کا کوئی خاص مسلک تھا بلکہ اقتدار کے ساتھ ساتھ مذہب چلتا رہا اور سیاسی قیادت ہی دینی قیادت پر حکمران رہی۔ اگرچہ واقعہ کربلا واقعہ عرہ اور واقعہ ثوہین بیت اللہ نے اُمت اسلامیہ کو بار بار جگایا اور آلِ محمد کی صداقت علم فضل زہد و تقوٰے نے پوری اُمت کو اپنی قیادت دینیہ کی طرف متوجہ کیا لیکن ساٹھ سال یا بتو لے ایک ہزار ماہ کے طویل عرصہ میں بنی اُمیہ کے سرکاری احکام اور متشددانہ نظام کے ماتحت حضرت علیؑ کی اولاد اور ان کے شیعیان پر سب و شتم تنقیص و توہین اور تذلیل و تحقیر بلکہ کفر کے مسلسل رویے نے عامۃ المسلمین کے دل آلِ محمد سے متنفر کر دیئے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز کے امتناعی حکم سے اتنا بھی غنیمت ہے کہ کسی حد تک شیعیان علی پر کئے جانے والے مظالم میں تخفیف ہو گئی اور لوگ حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کا نام سن کر برداشت کرنے لگ گئے اور رفتہ رفتہ ان کے محامد و مناقب بھی زبانوں پر آنے شروع ہو گئے بہر حال بنی اُمیہ کے دورِ اقتدار کے بعد حضرت علیؑ یا ان کی اولاد امجاد کے متعلق یہ تو تصور ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان ہی کو دینی قیادت کا سربراہ تسلیم کیا جائے ائمہ شیعہ کے ساتھ اتنی نرمی ہوئی کہ علانیہ ان پر سب و شتم بند ہو گیا لیکن شیعیان علیؑ کی دینی قیادت کے قائل ہونے کی وجہ سے ویسے کے ویسے معتوب رہے حکومت کی نظروں میں بھی اور جمہور اہل اسلام کی نگاہوں میں بھی۔

بنی اُمیہ کے مسلسل اسلام کش رویے کے پیش نظر جمہور اہل اسلام میں یہ احساس ضرور پیدا ہوا کہ دینی قیادت کا راستہ سیاسی قیادت سے الگ ہے لیکن اب ان کی حالت ایک طویل و عریض جنگل میں راہ گم شدہ مسافر کی سی ہو گئی کیونکہ ایک طرف اقتدار کی پوجا کے جمہوری تقلیدی رویہ کے ماتحت وہ آلِ محمد کی دینی قیادت کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور دوسری طرف اقتدار سے ہر وقت اسلام دشمنی کا دھواں بلند ہوتا دیکھ کر انہیں دینی قائد کہنا بھی گوارا نہ کرتے تھے پس اس قافلہ کا نہ کوئی سالار تھا نہ پیش رو۔ جس کا جس طرف کو منہ آیا وہاں ہوا اور چند آدمی اپنے پیچھے لگا لئے اور اُمت اسلامیہ ایک شتر بے مہار کی طرح یا راہ گم کردہ مسافر کی طرح اپنی صحیح منزل کے رُخ سے بے خبر ایک عرصہ تک چلتی رہی اور مودودی صاحب نے اُمت کی اس بے کسی و بے بسی کو اپنے ایسا نہ رنگ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

دوسرا حصہ دینی قیادت کا تھا جسے بقایا نے صحابہ و تابعین و تبع تابعین۔ فقہاء و محدثین اور علمائے اُمت نے آگے بڑھ کر سنبھال لیا اور اُمت نے اپنے دین کے معاملہ میں پورے اطمینان کے ساتھ ان کی امامت تسلیم کر لی یہ قیادت اگرچہ منظم نہ تھی اگرچہ اس کا کوئی ایک امام نہ تھا

جسے سب نے اپنا مرشد مان لیا ہو۔ اگرچہ اس کی کوئی باختیار کونسل نہ تھی کہ جو دینی مسائل پیدا ہوں ان کے بارے میں بروقت وہ ایک فیصلہ صادر کر دے کہ وہ پوری مملکت میں مان لیا جائے یہ سب لوگ انفرادی حیثیت میں کام کر رہے تھے۔ الخ خلافت و ملوکیت ص ۲۲، ۲۰۳ آگے چل کر رقمطراز ہیں:-

امام ابوحنیفہ کے وقت تک کسی نے ان اختلافی مسائل میں جمہور اہل اسلام کے مسلک کی باقاعدہ توضیح نہیں کی تھی جو ایک پورے نظام فکر کی شکل میں مرتب ہوتی بلکہ مختلف فقہاء و محدثین مختلف مواقع پر اپنے اقوال، فتاویٰ، روایات یا طرزِ عمل سے منتشر طور پر اس کے کسی پہلو کو واضح کرتے رہتے تھے۔ ص ۲۲

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:-

امام ابوحنیفہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ”الفقہ الاکبر“ لکھ کر ان مذہبی فرقوں کے مقابلہ میں عقیدہ اہل سنت والجماعت کو ثبت کیا۔ ص ۲۳

اس کے مقابلہ میں شیعیان علی کا مسلک مسلسل ایک دینی قیادت کے ماتحت رہا جس میں کبھی کوئی رخنہ نہیں آیا۔ ابوحنیفہؒ میں پیدا ہوا۔ اس وقت شیعہ مسلک میں امام وقت حضرت علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام تھے اور ان کی مذہبی قیادت ان کے سپرد تھی۔ ہر پیش آمدہ مسئلہ میں وہ ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ۹۵ھ میں آپ کی شہادت ہوئی تو امام محمد باقر علیہ السلام شیعیان علی کے مسلک کی رو سے قیادت دینیہ کے سربراہ تھے اور بقول صاحب تذکرۃ الخواص ابوحنیفہؒ نے آپ سے بھی حدیث کا درس لیا تھا۔ آپ کے حلقہ درس میں ہزاروں تشنگانِ علوم دینیہ اپنی علمی پیاس بجھاتے اور آپ کے علمی بحرِ ذخار سے کسب فیض کرتے تھے۔ آپ جب تقریر فرماتے تو علوم و معارف کا دریائے بے کراں منبع دہانِ امامت یا سرچشمہٴ لسانِ ہدایت سے موجزن معلوم ہوتا تھا جمہور اہل اسلام کا بڑے سے بڑا عالم آپ کے سامنے طفلِ مکتب نظر آتا تھا۔ آپ کا حوزہ علمیہ وہی مسجد نبوی تھی جہاں سے پیغمبر کی زبانِ وحی ترجمان سے صحیح اسلام کی تعبیر و قرآن کی تفسیر منظرِ عام پر آکر ظلمتِ کدو عالم کو بقعہ نور بنانے میں مصروف ہوا کرتی تھی۔ حضرت باقر العلوم نے علوم نبویہ اور معارف ربانیہ کی تعلیم و ترویج سے جہاں مسلمانانِ عالم کو اپنا فیض عام پہنچایا وہاں شیعیانِ آلِ محمد کو مذہب کے اصول و فروع کی کافی تفصیلات سے آگاہ فرمایا۔

ابوحنیفہ کی تشکیل مذہب جمہور کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں:-

جس فتنے کے زمانے میں امام نے عقیدہ اہل سنت کی یہ وضاحت پیش کی تھی اُس کی تاریخ کو نگاہ میں رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کا بڑا کارنامہ تھا جس سے انہوں نے امت کو راہ اعتدال پر قائم رکھنے کی سعی بیخ فرمائی تھی۔ اس عقیدے کے معنی یہ تھے کہ امت اس ابتدائی اسلامی معاشرے پر پورا اعتماد رکھتی ہے جو نبیؐ نے قائم کیا تھا اس معاشرے کے لوگوں نے جو فیصلے بالاتفاق یا اکثریت کے ساتھ کئے تھے امت ان کو تسلیم کرتی ہے جن اصحاب کو انہوں نے بے بعد و گیرے خلیفہ منتخب کیا تھا ان کی خلافت کو بھی اور ان کے زمانے کے فیصلوں کو بھی وہ آئینی حیثیت سے درست مانتی ہے اور شریعت کے اس پورے علم کو بھی وہ قبول کرتی ہے جو اس معاشرے کے افراد (یعنی صحابہ کرام) کے ذریعے سے بعد کی نسلوں کو ملا ہے۔ یہ عقیدہ اگرچہ امام ابوحنیفہ کا اپنا ایجاد کردہ نہ تھا بلکہ امت کا سوا و اعظم اس وقت یہی عقیدہ رکھتا تھا مگر امام نے اسے تحریری شکل میں مرتب کر کے ایک بڑی خدمت انجام دی کیونکہ اس سے عام مسلمانوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ متفرق گروہوں کے مقابلہ میں ان کا امتیازی مسلک کیا ہے، ص ۲۳۶۔

چھٹے امام

حضرت جعفر بن محمد الصادق علیہ السلام

آپ کی ولادت ۴۳ھ اربع الاول ۸۳ھ مدینہ منورہ میں ہوئی آپ کی کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ ام فروہ بنت قاسم بن محمد بن ابی بکر تھی۔ آپ سن دس سال میں ابوحنیفہ سے اڑھائی تین برس چھوٹے تھے۔

آپ کا زمانہ دینی و سیاسی ہردو لحاظ سے انقلابات کی آماجگاہ تھا۔ ہشام بن عبد الملک کی دعوت پر جب آپ کے والد امام محمد باقر علیہ السلام دمشق تشریف لے گئے تو آپ ان کے ہمراہ تھے۔ ہشام بن عبد الملک کے بعد اس کا جتیا ولید بن یزید بن عبد الملک تخت نشین ہوا اور اس کے بعد مروان الممار وارث تخت ہوا اور یہ شخص بنی امیہ کا آخری ماحدار تھا۔

بنو العباس کی تحریک ہشام کے زمانہ ہی سے چل رہی تھی اور بنو امیہ کے مظالم لوگوں کو بنو العباس کی تحریک انقلاب کے ساتھ متفق ہونے کی دعوت دے رہے تھے اور لوگ دن بدن بنو امیہ سے متنفر ہو کر بنو العباس کے حامی ہوتے جا رہے تھے اور آخر کار بنو امیہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔

بنو عباس کی تحریک کی کامیابی کا راز آل محمد کی مظلومیت کی داستانیں تھیں اور انہی کی نیابت کا دعویٰ کر کے عوام سے ہمدردیاں حاصل کی گئی تھیں۔

ربیع الاول ۱۳۲ھ میں حبیب ابوالعباس سفاح کے ہاتھ پر کوفہ میں خلافت کی بیعت ہوئی، تو اس کے چچا داؤد بن علی نے اپنی تقریر میں اس امر کا اظہار بھی کیا چنانچہ مودودی صاحب لکھتے ہیں۔ ہم اس لئے نہیں نکلے ہیں کہ اپنے لئے سیم و زر جمع کریں یا محلات بنوائیں اور ان میں نہریں کھود کر لائیں بلکہ ہمیں جس چیز نے نکالا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا حق چھین لیا گیا تھا اور ہمارے نبی عم (آل ابیطالب) پر ظلم کیا جا رہا تھا اور بنی امیہ ہمارے درمیان برے طریقے سے چل رہے تھے انہوں نے تم کو ذلیل و خوار کر رکھا تھا۔ الخ۔ ص ۱۹۲۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے زمانہ میں علوم و معارف کا بحر موجزن اور عزم و استقلال کا پہاڑ تھے۔ آپ کا حلقہ درس بہت وسیع تھا۔ اطراف مملکت اسلامیہ سے تشنگانِ علوم کھچ کھچ آتے تھے اور چشمہ فیض سے سیراب ہو کر اپنے اپنے وطن کو پلٹتے تھے تقریباً چار ہزار یا اس سے کچھ زیادہ تعداد ہے ان فقہاء و محدثین کی جو حوزہ علمیہ میں شریک درس ہو کر آپ کے شجرہ علم سے خوشہ چینی کر کے اور خوان معرفت سے ریزہ چینی کر کے آنے والی نسلوں کے لئے منبع فیض بن کر پلٹے۔

آپ نے سفیان ثوری سے فرمایا: اگر نعمت کی بقا چاہتے ہو تو شکر پروردگار ادا کرو کیونکہ خدا فرماتا ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَا زِيدَنَّكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ لَا زِيدَنَّكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ لَا زِيدَنَّكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ لَا زِيدَنَّكُمْ اور اگر سلطان جائز کا خوف ہو تو لا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ پڑھا کرو۔

حلیۃ الاولیاء سے منقول ہے آپ نے اپنی بعض اولاد کو وصیت فرمائی۔

- (۱) جو اپنے تقسیم شدہ رزق پر قناعت کرے گا وہ مستغنی رہے گا۔
- (۲) جو غیر کے مال پر لچائی ہوئی نظر ڈالے گا وہ فقیر مرے گا۔
- (۳) جو اللہ کی تقسیم پر راضی نہ ہو گا تو یقیناً قدر میں اللہ پر اس کا گمان اچھا نہیں۔
- (۴) جو اپنی غلطیوں کو حقیر سمجھے وہ بڑی سے بڑی غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔
- (۵) جو دوسروں کے عیوب کی پردہ دری کرے اس کے اپنے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے۔
- (۶) جو بغاوت کی تلوار اٹھائے وہ اسی ہی تلوار سے خود قتل ہوتا ہے۔
- (۷) جو اپنے دشمن بھائی کے لئے کنواں کھودے وہ پہلے خود ہی اس میں گرتا ہے۔
- (۸) جو جاہلوں کے ساتھ میل ملاپ رکھتا ہے وہ جلد ہی ذلیل ہوتا ہے۔

- (۹) جس کا علماء سے میل جول ہو وہ عزت پاتا ہے۔
 (۱۰) جو بُرے معاشرہ میں قدم رکھتا ہے وہ جلد متم ہو جاتا ہے۔
 (۱۱) حق بات کو خواہ تلخ ہی ہو اور اس میں تمہارے لئے ذاتی فائدہ ہو یا نقصان۔
 (۱۲) چغل خوری سے بچو کیونکہ یہ لوگوں کے دلوں میں بغض کا بیج بونتی ہے۔
 (۱۳) سخاوت کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو۔

(تذکرۃ الاولیاء علیہ السلام ابن جوزی)

آپ کا زمانہ نبوأمیہ کے زوال اور بنو العباس کے عروج کا زمانہ تھا نبوأمیہ کے آخری تاجدار بنو العباس سے ترساں و ہراساں رہے اور ان کے خطرہ کو اپنے سر سے ٹالنے کی تدابیر میں مصروف رہے اس لئے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی آزادانہ مذہبی تبلیغ و ترویج میں خلل انداز نہ ہو سکے پس نہ درپے ایذا ہونے کا ان کو وقت ملا اور نہ آپ کی اشاعت مذہب پر پابندی عائد کرنا ان کے بس میں رہا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے عباسیوں کی تحریک میں مزید تقویت پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ پس آپ نے علوم آل محمد کو خوب نشر کیا اور دین اسلام کی قیادت کی۔ مذہب نبویؐ کی قیادت کی۔ آپ نے نبویؐ کی رسالت رسالتِ نبویؐ نے اسلام کو جن خطوط پر پیش کیا اور ان کی قیادت کی وہ دھندلا چکے تھے آپ نے اپنی خطوط کو اجاگر کیا اور سلاطین وقت کی ہر دور کی بدعت کا پرہیز کیا۔ بنو ہاشم اور آل اسلام نے مذہب کا حصہ بھڑھار رہا تھا اور علانیہ طور پر حکومت کے دخل و اثر سے بے نیاز ہو کر چونکہ آپ ہی نے اصول و فروع مذہب کی تفصیلات کو منظر عام پر پیش کیا اس لئے شیعیان آل محمد کے مسلک کو جعفری اور ملت کو ملت جعفریہ امامیہ کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تہوڑا اہل اسلام کا مسلک بھی اس وقت تک سلاطین دور کی مسلسل سرپرستی میں تربیت پاتا رہا اور صحابہ و تابعین و تبع تابعین خواہشات اقتدار کے خلاف زبان کھولنے کو چونکہ موت کا پیغام سمجھتے تھے اس لئے ان کی ہاں میں ہاں ملانا ہی ان کا مذہب تھا اور ہر ایک کو اچھا کہنا ہر ایک کا احترام کرنا اور کسی صحابی و تابعی کے کسی فعل یا قول پر تنقید نہ کرنا حتیٰ کہ ان سے صادر ہونے والے فعل حرام تک کو حرام کہنے کی جرأت نہ کرنا ان کی بغاوت کو بغاوت نہ کہنا و گروہ لڑ پڑیں تو ایک کو حق ماننے کے باوجود دوسرے کو جہنمی نہ کہنا اور دونوں پر حسن ظن رکھنا اور دونوں کی برابر عزت کرنا وغیرہ منافی عقل و دین باتیں ان کا مذہب بن چکی تھیں اور یہی عقیدہ ان کو راسخ کرایا گیا تھا اور اسی کو وہ حقیقی اسلام سمجھتے تھے بلکہ حضرت رسالت مآبؐ تک اس مطلب کی حدیثیں بنا کر منسوب کر دی تھیں جو حضورؐ کی ذات پر افتراء محض تھیں کیونکہ دین خدا میں متضاد امور کے عقیدہ کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ وہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہتا ہے

وہیں سے جو سچا ہے اس کو سچا اور جھوٹے کو جھوٹا کہتا ہے اور یہی اس کی تعلیم ہے۔ جھوٹے اور سچے کو نیک و حق اور باطل کو برا و قابلِ احترام جھوٹ اور کسی صحابی پر تنقید نہ کرو، اقتدار کے بنائے ہوئے اصول تھے، جو نبی علیہ السلام تک منسوب کئے گئے۔

بنی امیہ کے جبر و ستم اور اسلام دشمنی کے ان گنت آثار اور شعائر اللہ کی علانیہ توہین کے واقعات نے اگرچہ اہل اسلام کو جھوٹ کر بٹایا اور انہیں دینی و سیاسی قیادت کے راستوں میں امتیاز پیدا کرنے کی دعوت دی لیکن بنو امیہ کی سرپرست مکیہ والی تلواروں نے کسی کو اس دعوت فکر پر کان دھرنے کی مہلت نہ دی بس ایک شیعیان علی ہی تھے جنہوں نے پہلے دن سے قیادت دینیہ و الشیعی کے سلسلہ میں جو مسلسل اور ظلم پیچ کا مقابلہ کرتے ہوئے سیاست کو مذہب نہ بنانے کا جہد کر رکھا تھا اور دامن امامت سے وابستہ رہے آ رہے تھے۔

جہوڑ اہل اسلام کے دلوں پر بنی امیہ کی حکومت کے طویل و مریض عرصہ میں حضرت علی و آل علی و شیعیان علی پر ہونے والے سب و شتم کی وجہ سے شیعیان علی سے حسد و کدورت کا رنگ تو بیٹھ ہی چکا تھا وہ آمد آل محمد کو عام و فاضل اور کردار و افعال میں اگرچہ کیتا نے روزگار تسلیم کرتے تھے لیکن سابق آباء کی تعلیم کے پیش نظر ان کی دینی قیادت تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔

نیز بنی امیہ کے مسلسل مظالم اور اسلام دشمن پالیسی کی بدولت وہ الگ دینی قیادت کی تلاش میں تھے جو آل محمد کی سرپرستی میں نہ ہو تاکہ شیعیان علی کے متعلق اموی دور کے ہوشربا و حیا سوز بے حقیقت پروپیگنڈہ کی زد سے بچ جائیں اب جو نبی عباسی تحریک کے زور پکڑنے سے اموی حکومت کی چولیں ہیلی ہوئیں اور فقہائے جہوڑ اہل اسلام کنہ بانوں سے قفل کھلنے لگے نیز اہل باخیا لات کے لئے آزادی کا وقفہ ملا تو جہوڑ اہل اسلام کے لئے شیعیان علی کے مسکاب کے مقابلہ میں دینی قیادت کی تشکیل کرتے ہوئے الگ مذہب کی طرح بولی گئی اور یہ کام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ہی زمانہ میں ابوحنیفہ نے انجام دیا اس لئے نہایت ہی محتاطانہ لزوم سے خلافت کے متعلق اپنے عقیدے کی وضاحت کی اور سابق جہوڑی عقائد و متشدد و کونگیا کے مذہب لیب پرست کی راہیں جہوڑا کیوں اور صحابہ و تابعین کی غلط کاریوں پر پردہ ڈالنا صحابہ پرست سے ان کے احترام کو باقی رکھنے کی کوشش کرنا خواہ اس میں اجتماع نہ ہو کو بھی برداشت کرنا جسے شکار مذہب قرار دیا اور شیعیان علی سے نفرت اور ان کی بات تک نہ سننا مذہب و صحابہ کی محبت کا تقاضا قرار دیا اور بعد میں آنے والے فقہائے عزا و امی کو بھی اس وجہ سے حرام کہہ دیا کہ اس کے زیرِ دامن کے باپ جہوڑا کی راہ پر مسکاب کے متعلق جو غلطی پیدا ہوئی ہے اس پر یہ پر باوجود اس کو

برا کہنے اور سمجھنے کے لعنت کرنا ممنوع قرار دے دیا تاکہ یہ لعنت اُوپر نہ چلی جائے جیسا کہ مودودی صاحب نے بعض علمائے اہل سنت کے اتنا عی قول کی وجہ بیان کی ہے ص ۱۸۳ سچ ہے (چور کی ڈاڑھی میں تنگا۔) اور چونکہ حضرت ابوحنیفہ ہی مذہب جمہور کی داغ بیل ڈالی تھی اس لئے مذہب بھی ان ہی کی طرف منسوب ہوا اور وہ حنفی کہلانے لگے۔

پس یہ زمانہ جس طرح سیاسی انقلاب میں ایک بڑی اہمیت کا حامل تھا اسی طرح مذہبی سرگرمیوں کے لحاظ سے بھی اسے بہت اہمیت حاصل ہے بنی امیہ کو اپنے اقتدار کے بچانے کی فکر تھی اور بنو عباس کو اس کے حاصل کرنے کا طمع تھا اور حب انقلاب آچکا تو بنی عباس کو اس کے مضبوط کرنے کی ضرورت تھی۔ پس اس زمانہ میں کتب تفسیر و حدیث و تاریخ کی تدوین بھی شروع ہوئی اور فقہی مسائل کی نشر و اشاعت بھی دل کھول کر کی گئی اور لوگوں نے آزادانہ طور پر مذہبیات میں حصہ لیا۔

ابوالعباس سفاح کے بعد منصور عباسی ۱۳۶ھ میں تخت نشین ہوا جسے دوایتی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ ۱۷۵ھ تک حکمران رہا ابتدائی دور حکومت میں بنو العباس کے سلاطین اپنی طبائع پر زور دے کر فقہائے اسلام کے فیصلوں کو سہہ لیتے تھے اگرچہ ان کے مزاج سے متضاد مہی ہوتے تھے کیونکہ ایک طرف انہوں نے بنی امیہ کا قلع قمع کرنا تھا اور ان کے معتقدین کو نیست و نابود کرنا ان کے لئے ضروری تھا اور دوسری طرف ہر طرف سے سر اٹھانے والی بغاوتوں کو دبانا اقتدار کی بحالی و مضبوطی کے لئے ان کے فرائض میں سے تھا اس لئے علماء و فقہاء کی کھری کھری باتوں کو وہ خندہ پیشانی سے یا طبیعت پر زور دے کر برداشت کرنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ ان کے خلاف یہ ایک نیافت نہ کھڑا ہو جائے۔

حلیۃ البوعینم میں ہے ایک مرتبہ ابو جعفر منصور دوایتی کے منہ پر کھٹی بیٹی وہ اسے بار بار اٹھاتا تھا اور وہ بار بار واپس آجاتی تھی آخر کار تنگ آکر امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس نے پوچھا کہ خدا نے کھٹی کو کیوں پیدا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا جبار لوگوں کے تکبر کو توڑنے کے لئے یہ سن کر وہ بہت شرمندہ ہوا لیکن غصہ کو ضبط کر کے چپ ہو گیا۔ (تذکرۃ الخوارج)

جب عباسیوں کے خلاف اٹھنے والی بغاوتیں فرو ہو گئیں اور ان کا اقتدار پوری طرح قائم ہو گیا تو انہوں نے ظلم و استبداد میں بنو امیہ سے بھی قدم بڑھا کر رکھا اور شیعیان علی کو پھر انہوں نے ظلم کی زنجیروں میں جکڑنا شروع کیا اور سادات علویہ کی دشمنی ان کے دلوں میں گھر کر گئی انہی کے پر آشوب دور میں سادات نے رفتہ رفتہ مدینہ کو چھوڑ کر جنگوں کی خاک چھاننا شروع کی اور دور دراز کے سفر طے

کر کے ترکستان ایران اور ہندوستان وغیرہ ممالک میں منتشر ہوتے گئے حتیٰ کہ آج دنیا سے اسلام میر
کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں سادات آباد نہ ہوں۔

منصور دوانیقی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ شیعان علی کی دینی قیادت کی سربراہ حضرت امام جعفر صادق
علیہ السلام کی ذات گرامی ہے اور وہ ان سے کسی حد تک خوفزدہ بھی رہتا تھا کہ کہیں ان کا اجتماع بڑھنے
بڑھتے خروج تک نہ پہنچ جائے اور کئی دفعہ اس نے آپ کو اپنے پاس بلا کر قتل کی دیکھیاں بھی دیں
لیکن جرأت نہ کر سکا۔ آخر کار مدینہ کے عامل کے ذریعے سے زہر دلو کر آپ کو شہید کر کے رہا۔ آپ کی
تاریخ شہادت ۱۲۸ شوال ۳۸ھ ہے۔ آپ جنت البقیع میں اپنے باپ داؤد کے پہلو میں دفن
ہوئے۔ ان کے دو برس بعد ۱۲۹ھ میں ابوحنیفہ کی وفات ہوئی۔ (ص ۲۲ خلافت و ملوکیت)

ساتویں امام

حضرت موسیٰ بن جعفر کاظم علیہ السلام

آپ کا نام موسیٰ لقب کاظم اور کنیت ابو الحسن ہے۔ آپ مدینہ منورہ میں ۲ صفر ۲۸۰ھ کو
پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی شہادت کے وقت آپ بیس برس
کے نوجوان تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ حمیدہ خاتون بربریا بقولے اندلس کے رہنے والی تھیں۔
آپ کی پیدائش اموی دور حکومت میں ہوئی۔ پھر بچپن کا کچھ زمانہ ابو العباس سفاح کی حکومت
میں گزاری۔ جب منصور بادشاہ ہوا تو آپ کی عمر آٹھ برس تھی اور جب مہدی عباسی تخت نشین ہوا تو آپ
کاسن مبارک تیس برس کا تھا۔ مہدی آپ کو بغداد لے گیا اور وہیں کچھ عرصہ آپ اس کی قید میں رہے
اور پھر اس نے باکر کے واپس مدینہ بھیج دیا اس کے بعد ہادی عباسی نے حکومت کی پھر ہارون بادشاہ
ہوا تو حج کے سفر میں مدینہ میں پہنچا۔

حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام قبر رسول اللہ پر موجود تھے کہ ہارون نے حضور پاک کی قبر کو خطاب
کر کے سلام دیا اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ يَا اَبْنَ الْعَجَم۔ اس پر آپ نے چپا کے بیٹے آپ پر یہ سلام ہوا۔
یا رسول اللہ کہ سلام نہ کہا تاکہ رعایا پر اپنی قیادت کو ظاہر کر کے فخر کرے۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام
سے اس کے بعد وراثت کو توڑتے ہوئے قبر مبارک کی طرف متوجہ ہو کر اس طرف سلام دیا۔ اَلسَّلَامُ
عَلَیْكَ يَا اَبْنَ لَ۔ اسے والد گرامی میرا تجھ پر سلام ہو۔ یہ سنتے ہی ہارون کے مدبر فریب کا دامن چاک

ہو گیا اور شرمندگی سے اس کا منہ بد رنگ ہو گیا ظاہر آکھنے لگا خدا کی قسم اسے ابوالحسن واقعی یہ فخر و شرف آپ کے لئے ہی ہے۔ لیکن دل ہی دل میں غصہ سے جل بھن گیا پس آپ کو اپنے ہمراہ بغداد لے گیا اور شہر سے شہر تک آپ کو زندان میں رکھا اور اسی حالت میں ماہِ رجب میں آپ کی رحلت ہوئی۔

(تذکرۃ الخواص)

اس لحاظ سے آپ کی عمر شریف ساٹھ برس بنتی ہے۔ بعض مورخین نے ۲۵ رجب ۱۸۳ھ تاریخ شہادت لکھی ہے اور اس لحاظ سے آپ کی عمر شریف ۵۵ برس ہوتی ہے۔ بعضوں نے ۵۴، ۵۵، ۵۶ برس کا قول بھی کیا ہے (تذکرۃ الخواص) علم و فضل زہد و تقویٰ اور دیگر صفات نفسیہ و ذاتیہ میں آپ بکثرت زمانہ تھے اپنے باپ کے بعد شیعیان علی کے آپ ساتویں نامزد امام تھے آپ بغداد کے قبرستان میں دفن ہوئے جسے آج کل کاظمین کہتے ہیں۔ آپ کو باب الموائج کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

آٹھویں امام

حضرت علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام

آپ کی ولادت ازوالقعدہ ۱۵۰ھ مدینہ منورہ میں ہوئی آپ کی والدہ ماجدہ کا نام نامی بختہ لقب خیرہ بن اور کنیت ام البنین تھی۔ بقول واقعہ ہی آپ تقریباً بیس برس کی عمر میں مسجد رسول اللہ میں بیٹھ کر فتویٰ دیا کرتے تھے۔

آپ نے منصور و نبی، یامی اور یارون و امین و مامون کے دور حکومت دیکھے مامون نے آپ کو مدینہ سے فرسایا برا راستہ میں جب آپ نیشاپور پہنچے تو وہاں کے علماء و فضلاء نے آپ کا شاندار استقبال کیا اور آپ سے بہت سی احادیث حاصل کیں ان میں ایک حدیث سلسلۃ الذہب کے نام سے مشہور ہے جس میں آپ نے اپنے آباؤ اجداد بن علیہم السلام کی سند سے جناب رسول اللہ کا فرمان لیا کہ بیٹہ تویی میں التفردا تا ہے۔ فلا الا الا اللہ میرا تعلق ہے جو شخص میرے اس قلم میں میرے عتاب سے محفوظ رہے گا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کلمہ توحید پڑھنے والے کے لئے بہت ہے اور ایمان بنے و ذبح سے بیکس اس کی کچھ شرطیں بھی ہیں و اما من منہ و جہا عیان میں سے ایک شرط میں ہوں یعنی آل محمد کی اطاعت و محبت اور انہی کو اپنا دینی قائم مان کر ان کی ہدایات کی تعمیل میں اسلامی خطوط پر چلنا ہی لا الا الا اللہ کے اقرار کا حقیقی مفہوم ہے۔ نیشاپور میں چند روز قیام کے بعد آپ مرو شریف لے گئے جہاں مامون فرما کر ان کو ان کے مامون نے آپ کو اپنا ولیعہد

مقرر کیا و اطراف مملکت میں بھی امام علی رضا علیہ السلام کی ولیعهدی کی اطلاعات بھیج دیں حتی کہ سرکاری سکے پر بھی آپ کے نام کی مہر لگوائی لیکن اس سے عباسی خاندان کے لوگ بگڑ گئے اور بغاوتوں تک نوبت پہنچ گئی۔

۲۰۳ھ میں امام کو انگوروں میں زہر دیا گیا جس سے آپ کی شہادت واقع ہوئی۔ آپ کی تاریخ شہادت بنا بر مشہور ۲۳ ذوالقعدہ ۲۰۳ھ ہے اور بعض کے نزدیک ۱۶ صفر ہے۔ آپ کی عمر شریف تقریباً ۵۵ برس تھی۔ آپ کا دفن طوس ہے جسے آج کل مشہد کہا جاتا ہے۔

نویں امام

حضرت محمد بن علی التقی علیہ السلام

آپ کی ولادت باسعادت ۱۰ رجب ۱۹۵ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔ آپ کی کنیت ابو جعفر اور لقب تقی و جواد زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام نامی بقول صاحب تذکرہ سکینہ تھا۔ جب حضرت امام علی رضا علیہ السلام شہید ہوئے تو آپ کی عمر تقریباً ۸ برس تھی۔

مامون آپ کے کمالات ظاہرہ و صفات باہرہ کی بنا پر آپ کا گردیدہ تھا حتی کہ اپنی بیٹی ام الفضل کا رشتہ آپ سے کر دیا۔ عباسیوں کو اس پر بہت غصہ آیا چنانچہ انہوں نے اپنے مفتی زماں اور قاضی دوران یحییٰ بن اکثم (جو اس وقت حکومت اسلامیہ میں چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز تھا) کو علمی مسائل میں آپ کا امتحان لینے پر مجبور کیا تاکہ لا جواب ہونے پر امام کی سبکی ہو اور مامون کی نظروں میں اس کا بڑھتا ہوا وقار ختم ہو چنانچہ دربار شاہی میں برسر عام یحییٰ بن اکثم نے آپ کو چھیڑا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ حجت خدا ہیں اور خاندان رسالت اور دو دمان نبوت کے چشم و چراغ علوم دینیہ میں لوگوں کے لئے مشعل راہ ہوا کرتے ہیں اور خطیب منبر سلوئی کے وارث امت نبویہ کے لئے علوم پروردگار کے نبوی محل کا دروازہ ہوا کرتے ہیں پس آپ نے اسے سوال و جواب میں مہوت و ششدر کر دیا اور حاضرین کے دلوں میں بالخصوص مامون کے دل میں آپ کی قدر و منزلت پہلے سے بھی بڑھ گئی اور واقعہ کی تفصیل ہم نے اپنی تفسیر انوار النجف کی جلد ۱۶ ص ۱۲۸ بیان کی ہے۔

بغداد میں ایک مرتبہ مامون کا گزر ہوا تو راستہ میں بچے کھیل رہے تھے شاہی سواری کو ادھر آتا ہوا دیکھ کر سب بچے دوڑ گئے لیکن امام عالی مقام نے اپنے مقام کو نہ چھوڑا قریب پہنچ کر شاہی سواری رک گئی اور مامون نے سوال کیا۔ اے شہزادے۔ باقی سب بچے راستہ چھوڑ کر دور بھاگ گئے ہیں

لیکن کیا دبر ہے کہ آپ کھڑے رہے ہیں؟ تو آپ نے نہایت متانت سے جواب دیا راستہ تنگ نہیں تھا تاکہ میرے ہٹ جانے سے کشادہ ہوتا اور مجرم میں نہیں تھا کہ ڈر کے مارے کہیں بھاگ جانے کی کوشش کرتا۔ مامون نے اپنی مٹھی کی طرف اشارہ کر کے کہا بتاؤ اس میں کیا چیز ہے؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا خدا نے اپنی قدرت سے فضائے بیحد میں بحر پیدا کئے ہیں جب بادشاہ اپنے بازوؤں کو نشانہ کے لئے چھوڑتے ہیں تو وہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کھڑلاتے ہیں اور بادشاہ انہیں مٹھی میں بند کر کے اولادِ انبیاء کا امتحان لیتے ہیں یہ سن کر مامون کہنے لگا واقعی آپ امام علی رضا کے فرزند ہیں۔

آپ شیعیان علی کے نویں امام ہیں جب مامون کے بعد مقتدر^{۱۱۹} شہ میں تخت نشین ہوا تو اس نے اس امام کو عین عالم شباب میں (۲۵ برس کی عمر میں) زہر دے کر شہید کر دیا۔ آپ کی تاریخ شہادت ۲۹ ذوالقعدہ^{۱۲۰} ہے اپنے جدِ پاک امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے پہلو میں کاظمین میں دفن کئے گئے۔

دسویں امام

حضرت علی بن محمد النقی علیہ السلام

آپ کی ولادت ۵ ربیع الثانی^{۱۲۱} مدینہ منورہ میں ہوئی ۶ برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا آپ کی والدہ ماجدہ کا نام نامی سمانہ تھا آپ کی کنیت ابو الحسن اور لقب نقی و ہادی زیادہ مشہور ہیں علم فضل زہد و تقویٰ کے علاوہ تمام صفاتِ فاضلہ میں اپنے اہل زمان سے فوقیت رکھتے تھے اور اپنے والد بزرگوار کے بعد شیعیان علی کا مرجع دینی تھے۔

جب متوکل عباسی نے آپ کو مدینہ سے بغداد طلب کیا تو اہل مدینہ آپ کے فراق میں بہت روئے انہیں آپ پر عباسی حکومت کے تشدد کا خطرہ تھا یحییٰ بن برمک آپ کو بلانے آیا تھا اس نے آپ کے گھر کی پوری تلاشی لی سوائے قرآن مجید اور کتبِ علمیہ کے اور کچھ نہ پایا آپ پہلے بغداد پہنچے پھر سامرہ میں آپ کو لے جایا گیا کیونکہ متوکل کا قیام وہاں تھا یحییٰ بن برمک کی رپورٹ پر متوکل نے آپ کی عزت کی سامرہ میں رہ کر آپ نے متعدد اوقات میں مسائلِ شکائیہ میں متوکل اور دہباری علماء کی رہنمائی فرمائی جس سے آپ کا ان پر علمی رعب طاری ہو گیا۔

ایک دن متوکل نے آپ سے نوازش کی کہ کچھ اشعار سنائیں آپ نے معنت پیش کی لیکن اس نے اصرار کیا تو آپ نے چند اشعار پڑھے جن میں حکمرانی کی تجویز عزت کے بعد حکمرانوں کے اکسبام

قبر و برزخ کا تذکرہ تھا۔ اشعار سن کر متوکل اس قدر روکا کہ اس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی پس آپ کو پانچ ہزار دینار دے کر عزت و جلال کے ساتھ اس نے رخصت کیا۔
آپ کو معتز عباسی نے زہر سے شہید کیا آپ کی تاریخ شہادت ۳ رجب ۲۵۲ھ ہے۔ آپ کی عمر شریف چالیس برس تھی۔ آپ سامرہ میں دفن ہوئے آپ کا ایک فرزند سیّد ہے جن کا روحنہ بغداد و سامرا کے درمیان سڑک کے قریب واقع ہے۔
گیا رہیں امام

حضرت امام حسن بن علی العسکری علیہ السلام

آپ کی ولادت ۱۰ ربیع الثانی ۲۳۱ھ کو سامرہ میں ہوئی ان کی والدہ ماجدہ کا نام نامی سوسن تھا جو ایک کنیز تھیں آپ علم فضل زہد و تقویٰ اور مہذبہ صفات فاضلہ میں اپنے پدر عالی قدر کے وارث تھے اپنے والد کی شہادت کے وقت آپ کی عمر ۲۳ برس تھی آپ کا لقب عسکری ہے۔ معتز عباسی کے حکم سے آپ کو زہر دیا گیا اور آپ کی شہادت ۸ ربیع الاول ۳۲۹ھ میں ہوئی جب کہ آپ کی عمر ۲۹ برس تھی۔

بارھویں امام

حضرت ابوالقاسم حمزہ بن الحسن المہدی علیہ السلام

آپ کی ولادت باسعادت ۱۵ شعبان ۲۵۶ھ کو ہوئی۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی حضرت زہرا بنتون ہے جو روم کے شاہی ناندان سے حضرت شمعون دہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسل سے تھیں۔ ان کی حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے شادی کا مفصل واقع کتب تاریخ میں درج ہے آپ اپنے والد ماجد کی شہادت کے بعد غائب ہوئے اور لو اب اربعہ کی یکے بعد دیگرے وساطت سے آپ کا اپنے شیعوں کے ساتھ رابطہ قائم رہا لیکن ۳۲۹ھ ۱۵ شعبان کے بعد سے نیابت ختم ہو گئی۔ اس سلسلہ ختم ہو گیا اور غیبت کبریٰ شروع ہوئی۔ جب اللہ چاہے گا تو حضرت مہدی علیہ السلام تشریف لائیں گے اور دنیا جس طرح ظلم و جور سے پر ہو چکی ہوگی وہ عدل و انصاف سے اُسے پر کر دیں گے۔

مسلمانوں میں حضرت مہدی کی آمد اور حضرت عیسیٰ کی رجعت کا عقیدہ مسلمات میں سے ہے
 فرق صرف اس میں ہے کہ وہ پیدا ہو چکے ہیں یا پیدا ہوں گے شیعیان علی کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ پیدا ہو
 چکے ہیں اور غائب ہیں جب حکم خدا ہوگا غیبت کا پر وہ چاک ہوگا اور وہ اپنے مخصوص انداز میں ظاہر
 ہو کر خلافت کردہ عالم کو بقعہ نور بنائیں گے اور بعض اہل سنت علماء بھی ان کی ۱۵ شعبان ۱۲۵۶ھ کی
 ولادت کے قائل ہیں۔

شیعیان علی کے عقیدہ کی رو سے وہ خود غائب ہیں اور ان کی غیبت میں علمائے اعلام و
 مجتہدین غلام ان کی نیابت کا ذریعہ ادا کرتے ہوئے عوام میں روشنی کا بنیاد ہیں اور زمان غیبت میں
 قیادت دینیہ انہی کے سپرد ہے جب ان کا ظہور ہوگا تو قیادت دینیہ اور سیاست ملکہ وہ لوگ کے برابر
 وہ خود ہوں گے۔ عجل اللہ فرجہ۔

دور اموی کی شیعہ کش پالیسی کے ماتحت شیعہ مکتب فکر کے متعلق عوام کو
 شیعہ مکتب فکر | ایسی غلط فہمیوں میں مبتلا کیا گیا تھا اور ان کے متعلق سرکاری طور پر ایسے
 زہر بیجے پروپیگنڈے کئے گئے تھے کہ ان کی وجہ سے عامۃ المسلمین کی نظروں میں شیعیان علی کا مسلک
 کفر و زندہ تو کے مترادف تھا اور حکومتی پالیسی کا تقاضا یہ تھا کہ اسلام صرف اس جمہوری طرز عمل کو قرار
 دیا جائے جس پر پیغمبر کے بعد سے سلاطین اسلام عمل یہ اپنی اور انہی کی قیادت کو اسلامی و دینی قیادت
 قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف سوچنے یا کرنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج تصور کیا جائے
 اور اسی پالیسی کے ماتحت پہلی تینوں حکومتوں میں حضرت علی بلکہ مہدی بنی ہاشم کو بڑے عہدے تو درکنار
 کسی عہدے سے ہمراہی سرکاری ملازمت میں بھی حصہ نہ دیا گیا اور معاویہ کے دور سے اس پالیسی کو تشدد کا
 رنگ دے کر بہر منبر حضرت علی و اولاد علی کو سب و شتم کرنے کا سرکاری منصوبہ تیار ہوا تاکہ آنے
 والی نسلیں حضرت علی و اولاد علی کے متعلق غلط تاثر لے کر پروان چڑھیں۔ عمر بن عبدالعزیز کے دور
 حکومت تک کے ساٹھ سالہ عرصہ میں اس اسلام سوز پالیسی پر بڑی شدت سے عمل کیا اور کرایا گیا کہ اس
 شخص کو مقرب بانگاہ ہونے کا موقع ملا جس نے حضرت علی و اولاد علی سے دل کھول کر دشمنی کا اظہار کیا
 حتیٰ کہ معاویہ نے اپنے باپ کو جبرے دربار میں زانی ثابت کر کے زیاد بن ابیہ کو اپنا بھائی اور شاہی
 خاندان کا ایک ناس فرزند ثابت کیا جس نے ناس طور پر شیعیان علی کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ چنانچہ
 خلافت مملوکیہ کے غور ۱۶۴۰-۱۶۵۰-۱۶۵۱-۱۶۵۲-۱۶۵۳ء وغیرہ پر فقہ سے اظہار کیا گیا ہے۔

اگرچہ دولت امویہ کی بگڑی ہوئی حالت عباسیہ نے لی تو اعلانیہ حضرت علی پر سب و شتم کا

دروازہ تو بند ہو گیا لیکن اموی تعصب و عناد کی چکاریاں بعض دلوں میں سلگتی رہیں اور جن لوگوں نے بچنے سے بڑھاپے کے دوزخ حضرت علی و اولاد علی و شیعان علی پرست و شتم اور ان کے متعلق کفر و زندہ کا پرچار ہی سنا ان کے دل کب صاف ہو سکتے تھے اگر بعد میں کسی نے ان کی تعریف و مدح کی تو ان لوگوں نے اس کو کذب اور جھوٹ سے ہی تعبیر کیا جو کان پوری زندگی میں حضرت علی کے متعلق گالی گلوچ سنتے رہے تھے وہ حضرت علی کی تعریف کی احادیث پر کیسے باور کر سکتے تھے پس عوام میں شیعان علی کے متعلق تنفر ویسے کا ویسا باقی رہا اور اموی دور کے پروپیگنڈے سے متاثر و متعصب علما نے اپنی کتابوں میں شیعان علی کے متعلق زہریلے اثرات چھوڑنے میں کوئی کسر باقی نہ اٹھا رکھی جس طرح ابن تیمیہ کے متعلق خود مودودی صاحب نے بھی اعتراف کیا ہے ص ۳۱۳۔ اس دشمن علی کا یہ دستور ہے کہ حضرت علی کے متعلق وار و ہونے والی ہر فضیلت و منقبت کا بالعموم صاف انکار کرتا ہے ورنہ اُسے رد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا اور اس کی کتاب منہاج السنۃ دورِ اموی کی شیعہ کش پالیسی کی عکاس ہے اور اس کا لفظ لفظ شیعہ دشمنی کا غماز ہے اور اس کی پوری کتاب سے حضرت علی و اولاد علی کے متعلق حسد و بغض کا اظہار ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر شیعہ عقائد کا منظرِ عام پر لانا ضروری ہے تاکہ غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے شیعہ مسلک کی اساس جن اصولوں پر ہے ان میں بنیادی حیثیت عقیدہ توحید کو حاصل ہے۔ اس کے بعد عقیدہ نبوت و عقیدہ قیامت ہے۔ جمہور اہل اسلام کسی حد تک ان عقائد میں شیعہ مسلک سے متفق ہیں لیکن عقیدہ توحید کے ساتھ عقیدہ عدل اور عقیدہ نبوت کے ساتھ عقیدہ امامت شیعوں کے مختصات میں سے ہے۔

عقیدہ توحید | شیعان علی کے مسلک میں اللہ ذات صفات افعال و عبادت کے لحاظ سے یکا و تنہا ہے نہ اس کا شریک نہ سیم نہ ضد نہ ند نہ معاون نہ معاند نہ مشیر نہ وزیر نہ ماں نہ باپ نہ بیٹی نہ بیٹا نہ بیوی اور نہ کوئی رشتہ دار۔ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ اللَّهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَهُ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ۔

توحید ذات۔ یعنی وہ واحد بسیط ہے مرکب نہیں نہ اُس کی کوئی جز و تحلیل ہے نہ ترکیبی اور نہ خارجی ہے نہ ذہنی۔ تمام موجودات کا وہ واحد خالق ہے وہ ہر شے سے اول ہے اس کی اول کوئی نہیں وہ ہر شے سے آخر ہے اس کی آخر کوئی نہیں وہ فاعل مختار ہے مجبور نہیں جس طرح تمام اشیاء وجود میں اس کی ایجاب کی محتاج ہیں اسی طرح بقا میں اس کے بقا کی محتاج ہیں تمام نظامِ عالم اس کی حسنِ صندت و کمالِ حکمت کا کرشمہ ہے نہ اس میں اس کو تھکان ہوتی ہے اور نہ اس پر غفلت طاری ہوتی ہے نہ کسی کی مدد کا محتاج

ہے اور نہ مشورہ کا حاجت مند ہے جن وانس دیو و پری روح و ملک نبی و رسول اور ولی و مرشد خاکی و نوری۔
جاندار و بے جان ذوی العقول و بے عقل مجر و مادی سافل و عالی۔ بحری و بری ارضی و سماوی۔ فرشی
و عرشی اور ناسوتی و لاموتی تمام مخلوق اس کے قبضہ قدرت میں ہے وہی ایک ہر ایک کا ولی و کار ساز
ہے اور یہ سب کے سب اُسی ایک اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ **لِلّٰہِ کَسْبُجْدٌ مِّنْ فِی السَّمٰوٰتِ
وَمَنْ فِی الْاَرْضِ۔**

توحید صفات۔ یعنی اللہ تمام صفات کمال کا جامع ازلی وابدی ہے اور سب صفات
اس کی عین ذات ہیں وہ قدیم عالم قادر حی مرید مدک متکلم اور صادق ہے وہ احدی الذات ان تمام صفات
کمال کا منبع و حید ہے بایں طور کہ یہ صفات اس کی ذات میں تعدد کی موجب نہیں ہو سکتیں جس طرح
نفس انسانی متعدد خوبیوں کے باوجود متعدد و نہیں ہوتا بلکہ واحد ہی رہتا ہے اور اللہ ہر اس صفت سے پاک
منزہ ہے جو دامن جلال و جمال پروردگار کے لئے باعث نقص و عیب ہے پس وہ نہ مرکب ہے نہ جسم
نہ محل حوادث ہے نہ مرئی اس کا کوئی شریک ہے نہ ساتھی اور نہ وہ کسی شے میں حلول کرتا ہے نہ کسی کا محتاج
ہے اس کے متعلق جامع فقرات وہ ہیں جو رئیس الموحیدین و امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے مقام
توحید میں ارشاد فرمائے ہیں۔ **مَنْ وَصَفَهُ فَقَدْ حَدَّاهُ وَمَنْ حَدَّاهُ فَقَدْ عَدَّاهُ وَمَنْ عَدَّاهُ
فَقَدْ اَبْطَلْ اَزْلَهُ وَمَنْ قَالَ کَیْفَ فَقَدْ اسْتَوْصَفَهُ وَمَنْ قَالَ اَیْنَ فَقَدْ حَیَّرَہُ
عَالِمًا اِذَا مَعْلُومٌ وَرَبٌّ اِذَا لَمْرُبُوبٌ وَقَادِرٌ اِذَا لَمَقْدُورٌ**

۔۔۔ لمعۃ الانوار ص ۱۴۷ فقلاً از منہج البلاغہ خطبہ ص ۱۴۷

توحید در افعال۔ یعنی خالق رزق امانت و احیاء و جملہ امور تکوینیہ اور عالم امکان کے اندر صانع ازل
و حکیم مطلق کے یہ قدرت کی صنعت و حکمت کے چھوٹے بڑے کارخانے اُسی کی تدبیر اتم و نظام اکمل کے
مرہون منت ہیں وہ بغیر آنکھوں کے دیکھتا ہے بغیر کانوں کے سنتا ہے اور بغیر زبان کے بولتا ہے اسی طرح
وہ اپنے تمام افعال میں اعضاء و جوارح کا محتاج نہیں۔ قرآن مجید میں کُن کا لفظ صرف سمجھانے کے لئے
ہے ورنہ وہ پیدا کرنے میں کُن کہنے کا محتاج نہیں تاکہ زبان کا ہونا لازم آئے پس اس کے ارادے سے
فعل ہو جاتا ہے وہ اپنے افعال میں نہ کسی کو شریک کرتا ہے اور نہ اُس کا کوئی شریک بن سکتا ہے اور
نہ اُس نے کسی کو اپنے افعال کے اختیارات کا حامل بنایا ہے پس وہ خود ہی اس سارے اقتدار کا
واحد مالک ہے۔

توحید در عبادت۔ یعنی تمام کائنات کی عبادت کا مستحق وہ ایک اللہ ہے پس انسانوں جنوں

فرشتوں نبیوں رسولوں اماموں اور ولیوں کا وہی معبود حقیقی ہے اور اللہ کی جانب سے آنے والے جملہ انبیاء و رسل و حجج اور نازل ہونے والے جملہ صحیفے و کتب اُسی ایک خدا کی عبادت کی دعوت دیتے رہے ہیں پس وہی عبادتِ خلاق کا واحد مرجع اور ساری مخلوق کی حاجات کا واحد مرکز ہے وہی دعاؤں کو سنانے والا ہے اور وہی جو دو کرم اور عطا و بخشش کے لفظ سے ہر ایک کا داتا ہے۔

عقیدہ عدل۔ عدل بھی اگرچہ صفاتِ کمال میں سے ایک صفت ہے اور ذاتِ خدا جمیع صفاتِ کمال کی جامع ہے لیکن جمہور اہل اسلام کے اشعری العقیدہ لوگوں کے مقابلہ میں اس کو استقلالی حیثیت دی گئی ہے وہ کہتے ہیں کہ عدل خداوندی کے قائل ہیں لیکن وہ بعض ایسے امور کا عقیدہ رکھتے ہیں جن سے عدل کی نفی لازم آتی ہے مثلاً ان کے نزدیک افعال کا حسن و قبح ذاتی نہیں بلکہ جس چیز کا خدا حکم دے دے وہ حسن بن جاتا ہے اور جس چیز سے وہ منع کرے وہ قبیح بن جاتا ہے ورنہ حکم یا نہی سے پہلے وہ دونوں ایک جیسے تھے مثلاً احسان و ظلم اور سچ اور جھوٹ برابر ہیں لیکن جب اللہ نے احسان اور سچ کا حکم دیا تو وہ حسن بن گئے اور جب اُس نے ظلم اور جھوٹ سے روکا تو وہ قبیح بن گئے پس ہم شریعت کے پابند ہونے کی وجہ سے کسی فعل کے حسن یا قباست کا فیصلہ کرتے ہیں لیکن اللہ چونکہ ہر پابندی سے بالاتر ہے لہذا اُس کا ہر فعل ہر قسم کی پابندیوں سے بالاتر ہے پس وہ جو کرے حسن ہوگا اور جو نہ کرے وہ قبیح ہوگا اگر وہ کسی نیک کو جہنم میں اور کسی بد کو جنت میں بھیج دے تو وہ قبیح نہیں بلکہ حسن ہوگا کیونکہ حسن اور قبح افعال کا ذاتی نہیں بلکہ اللہ کے فعل یا امر کو اُس کی موافقت سے حسن یا قبیح کہا جاسکے۔

عقیدہ شیعہ کی رو سے افعال کا حسن و قبح ذاتی ہے اور خدا حسن کا حکم دیتا ہے اور قبیح سے منع فرماتا ہے عقل سلیم اور وجدان مستقیم خود اس کے لئے فیصلہ کافی ہے جس طرح دیکھنے کی چیزوں میں خوش و غل و بد تشل کا فرق ہے۔ آوازوں میں قمری اور بلبل کی آواز اور گدھے و گد کی آواز میں فرق ہے۔ چھوٹے کے لئے ملائم اور سخت میں فرق ہے۔ سو گھنے کے لئے خوشبو اور بدبو میں فرق ہے اور قوت ذاتیہ میٹھی اور تلخ میں واضح فرق محسوس کرتی ہے۔ اسی طرح عاداتِ انسانیہ میں ملائم و منافر اور مرغوب و مبغوض کے درمیان کھلا جو فرق موجود ہوتا ہے مثلاً احسان و صدق اچھی عادات ہیں اور ظلم و کذب بُری عادات ہیں اور یہ امتیاز ان غرائز و اوصاف میں ذاتی ہے نہ کہ اعتباری سستی کہ جو لوگ کسی دین و ملت کے پابند نہیں وہ بھی لسانِ عقل اور زبانِ فطرت سے ان کا فرق سن چکے ہیں اور کسی ملت و مذہب پر ایمان نہ لانے کے باوجود اس فرق پر ایمان رکھتے ہیں۔ اگر امر خداوندی اور نہی ایزدی کے بعد ان کا حسن و قبح قائم ہوتا تو کافرو عہد لوگ یقیناً اس فرق سے نا آشنا ہوتے مگر مسلمانوں کی طرح ان امور کی چٹائی و پائی کے وہ بھی قائل

ہیں اور یہ اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ افعال کا حسن و قبح ذاتی ہے اور اللہ حسن کا امر کرتا ہے اور قبح سے روکتا ہے اور اسی کا نام ہے عدل اگر اس کے خلاف کرے تو وہ ظلم ہے اور ساحت الوحییت ظلم سے پاک و منزہ ہے بنا بریں نیک کو جہنم میں بھیجا ظلم ہے اور اللہ سے اس کا صدور ناممکن ہے وہ خود بھی عادل ہے اور لوگوں کو بھی عدل کا حکم دیتا ہے۔

عقیدہ نبوت۔ شیعان علی کا نبوت کے بارے میں عقیدہ یہ ہے کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے خداوند کریم نے اپنے اہل بیت و کرم سے بعثت انبیاء کا انتظام فرمایا پس آدم سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ایک لاکھ پچیس ہزار نبی مبعوث ہوئے جو سب کے سب گناہان صغیرہ و کبیرہ سے معصوم تھے ان میں سے پانچ انبیاء حضرت نوح حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام اولوالعزم کہلاتے ہیں اور تمام نبیوں کے سلطان و سرور حضرت محمد مصطفیٰ ہیں اسی طرح ان کی امت تمام امتوں کی سرور ہے۔ آپ کی شریعت گذشتہ تمام انبیاء کی شرائع کی ناسخ ہے اور آپ کی کتاب قرآن مجید تمام کتب سماویہ و مصحف الہیہ سے افضل و برتر ہے۔ آپ کا لایا جو دین اسلام تمام ادیان سے برتر اور مکمل ہے۔ آپ آخری نبی ہیں ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا لہذا آپ کی شریعت آخری شریعت ہے اور دین اسلام آخری اور مکمل دین ہے اور قرآن مجید قیامت تک کے لئے انسانی دینی و تمدنی ضرورتوں اور پیش آمدہ مسائل کی مناسبت کا مکمل کورس اور دستور العمل ہے اور صداقت سید الانبیاء اور حقانیت اسلام کے اثبات کے لئے۔ ہر آدمی میں منہ و جہ و زبان سے حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت انسانیت کا مکمل دین ہے ان کا ملال قیامت تک کے لئے ملال اور ان کو حرام قیامت تک کے لئے حرام رہے گا۔ ان کی شریعت کے کسی دستور و قانون کا انکار یا اس کی توجہ کفر ہے۔ اسی طرح ان کی پیش کردہ کتاب قرآن مجید کی کسی آیت کا انکار یا توجہ کفر ہے۔ ان کی اطاعت باعث نجات و خوشنودی پر موقوف ہے اور ان کی نافرمانی باعث لعن و لعنت و ناب اور غضب پر موقوف ہے۔ ان کے دوستوں سے دوستی و محبت واجب ہے اور ان کے دشمنوں سے دشمنی و نفرت واجب ہے پس صحابہ کرام میں سے ہر ایک حضور کی تعلیمات پر ثابت قدم رہے ان سے محبت کرنا واجب ہے لیکن ہر ایک دنیاوی اقتدار کے چمکے میں اگر حضور کی تعلیمات کو فراموش کر بیٹھے اور جنہوں نے سیاست مکیہ کی خاطر شیعہ تقاضوں کو قبول کیا ان کا کوئی حرام نہیں پس ان سے نفرت کرنا بیان ہے کہ وہ کفر میں حصول ہستی سے بڑا شخص چستی

آپ کی پوری زندگی انسانیت کا مکمل لائحہ عمل اور اسوہ حسنہ تھی آپ مکہ میں پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد کا نام حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف تھا اور آپ کی والدہ کا نام حضرت آمنہ بنت وہب تھا۔ آپ نے چالیس برس کے بعد اعلان نبوت فرمایا۔ شیعہ عقیدہ ہے کہ انبیاء کے والدین کافر نہیں ہوتے اور حضرت رسالت مآب کے والدین بلکہ آبائی سلسلہ تا آدم و حوا مسلمان تھا اور یہ نور نبوت کسی بھی زمانہ میں کافر و مشرک پشت و رحم میں نہیں رہا بلکہ پاکیزہ اصلا ب اور طاہرہ ارحام میں منتقل ہوتا رہا۔ وَتَقَلَّبْتَ فِي السَّاجِدِينَ کی تاویل خاندان نبوت نے یہی فرمائی ہے۔ مزید وضاحت "لمعة الانوار" میں ہم نے کی ہے۔

عقیدہ امامت۔ شیعیان علی کے نزدیک عمدۂ امامت و خلافت عمدۂ نبوت کا قائم مقام ہے چونکہ آپ خاتم الانبیاء تھے پس نبی تو آسکتا نہیں اور دین کی حد قیامت تک ہے لہذا ہدایت امت کے لئے قیامت تک کے لئے نفعنا آمد کا انتظام ضروری ہے اور نبی کے لئے جن جن اوصاف کا ہونا ضروری ہے ان کے بعد ان کے قائم مقام کے لئے سوائے صفت نبوت کے باقی تمام اوصاف کمال کا ہونا ضروری ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ اسلام میں عالم کے لئے دینی و سیاسی ہر دو قسم کی قیادت کے سربراہ تھے وہ جس طرح عقائد اعمال اور اخلاق و عادات کی اصلاح کے علمبردار تھے اسی طرح تمدنی زندگی اور معاشرتی بہبود میں نظامی امور کی کفالت بھی آپ کے ذمہ تھی اور سرحدات اسلام کی مخالفت اور دشمنان اسلام سے نبوہ انسانی یا صلح و صفائی کی تدبیر بھی آپ ہی کے بیٹے اختیار میں تھیں لہذا ان کے حقیقی جانشین کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تمام امور میں اُستِ اسلامیہ کی سربراہی کے لئے استعداد تمام کا حامل ہو۔ وہ جہاں علوم قرآنیہ و معاملہ و فہم و سنن نبویہ عالمہ مل ہو وہاں سیاست ملکہ اور بصورت سلطانہ کے لئے بھی اہلیت و موزونیت تامہ رکھتا ہو۔ پس وہ اوصاف باطن و کمالات ظاہرہ سے آراستہ ہو اور دینی قیادت کے لئے اپنے پورے اہل زمان سے افضل۔ اعلم ازہد و اتقى ہو بکبر و عظمت سے پیراستہ ہو تاکہ اس کی اطاعت خدا اور رسول قرار دی جائے اور ان تمام امور کو مد نظر رکھتے ہوئے شیعیان علی کے مسک میں ضرور رسالت مآب کے بعد قیادت و مصلحت میں تقسیم ہو گئی چنانچہ سیاسی قیادت مخصوص طریقہ دار سے حضرت ابو بکر نے سنبھالی لی جس کو نبوتیت کا نام دیا گیا اور دینی قیادت حضرت علی علیہ السلام کو حاصل تھی کیونکہ دینی قیادت کا عمدہ و عبوری طرز عمل سے اور انجماعی طریقہ کا ہے نہیں بلکہ اگر تا بلکہ یہ خدائی عمدہ ہے وہ جس کو پہلے سے دیتا ہے اور اس کی اہلیت کا اندازہ بھی سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہو سکتا پس دینی قیادت

میں ضروری ہے ان کا انکار کفر والحاد ہے۔ پس عبادات، معاملات، عقود اور تعزیرات کے معاملہ میں حضور کی ہدایات اور فرمائشات واجب الازعان اور واجب العمل ہیں ان کی مخالفت فسق اور انکار کفر ہے۔ عقائد شیعہ پر مفصل و مدلل بیان ہماری کتاب لمتہ الانوار فی عقائد الابرار میں پڑھیے۔

کرسی اقتدار کے رائج الوقت ذرائع

ہر دور میں طلب اقتدار کے لئے نفوس انسانیہ حرص و ہوس کے دیوؤں کو اپنی چرب لسانی، سحر بانی یا قلم کاری و مضمون نگاری یا دیگر مناسب و مقبول ذرائع کی بدولت امن و سکون کے دیوتاؤں کا روپ دے کر عوام الناس کو اپنا گرویدہ بناتے ہوئے مضبوط پارٹیاں بنا کر کرسی اقتدار پر براجمان ہوتے چلے آئے اور تجربہ شاید ہے کہ کرسی اقتدار کا طالب کرسی حاصل ہونے سے پہلے عوام سے جس قدر والہانہ محبت سے پیش آتا ہے کرسی ملنے کے بعد اس سے کہیں زیادہ عوام کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور کامیابی سے پہلے عوام سے جس قدر خلق و تواضع سے پیش آتا ہے کامیابی کے بعد اس سے کہیں زیادہ بدخلق اور تکبر مزاجی کا اظہار کرتا ہے نہ اسے کئے ہوئے وعدوں کی پاس ہوتی ہے نہ کسی کی احسان مندی کا اسے احساس ہوتا ہے اور نہ اسے غیرت انسانیہ اور شرافت بشریہ کا لحاظ ہوتا ہے پس اقتدار کے نشے میں وہ اپنے تئیں ایک بلند شخصیت بلکہ اعلیٰ مخلوق قرار دیتے ہوئے تمام انسانوں کو ذلت اور حقارت بھری نگاہوں سے دیکھتا اور اقتدار کی لالٹھی سے سب کو حیوانوں کی طرح ہانکنے میں وہ سرور محسوس کرتا ہے حتیٰ کہ قبل از اقتدار اچھے خاصے اور بے تکلف دوستوں اور قابل قدر بزرگوں کو بھی اس کی بارگاہِ رفعت تک پہنچنے کے لئے کافی کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور عوام کے لئے تو اس تک باریابی صرف مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہوتی، ایسی صورت میں شکایات سنی جائیں تو کیونکر اور کالیف و مصائب کا مداوا ہو تو کیسے؟ پس بیچارے عوام کی چیخ و پکار جانتے افراد کا شور و غوغا مظلوموں کی فریادیں بے کسوں کی دہائی اور کمزوروں کی نالہ و زاری اگرچہ ایک طرف عرش بریں تک مسلسل پہنچ جاتی ہیں لیکن ایوان حکومت میں بسنے والوں کے کانوں میں جوں تک نہیں رینگتی ہاں جب قادر مطلق کی بے آواز لالٹھی حرکت میں آتی ہے اور بے کسوں و بے بسوں کی آپہں بارگاہِ اجابت تک پہنچتی ہیں اور ایوان حکومت کی چولیس ہلنے لگتی ہیں تو اقتدار کے متوالوں کی بھی آنکھیں کھلتی ہیں لیکن اتنے میں کرسی اقتدار چھین جاتی ہے اور صاحب تخت تختہ دار پر یا زندان کی تحریک کوٹھری کی طرف منتقل ہو کر اپنے تکبر و عنوت کی نذر بھگتنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا اور علیٰ ہذا القیاس۔ اور ہر بعد میں اقتدار حاصل کرنے والا۔ اپنے سے پہلے حکمران کے انجام بد سے سبق حاصل کرنے کے بجائے ان ہی اغلاط کا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا اعادہ کرتا ہے جو سابق صاحب اقتدار کے زوال کی موجب بنی تھیں اور لطف یہ کہ اقتدار حاصل کرنے کے لئے جن جن اغلاط کو سابق حکمران کی طرف منسوب کر کے اپنے لئے راستہ ہموار کرتے ہوئے عوام کی تائید حاصل کی جاتی ہے اقتدار حاصل ہونے کے بعد بعینہ اسی نوعیت کی غلطیوں کا اعادہ ہوتا ہے اور اس انجام سے نشہ اقتدار بالکل غافل کر دیتا ہے جو سابق کو پیش آیا تھا۔

ایسے خوش بخت انسان بہت کم ہیں جو انسانیت کے فطری تقاضوں کو سمجھتے ہوں اور خود بھی اُن کے مطابق اپنے احساسات و جذبات کی باگ ڈور موڑ سکنے پر قادر ہوں لیکن ایسے لوگ اقتدار کی سرکشی میں شامل ہونے سے گریزاں رہتے ہیں اس لئے کہ زمانہ ساتھ دینے سے انکاری ہوتا ہے کسی بھی اہم کام کی طرف اسباب و ذرائع کے بغیر اقدام کرنا دانشمندانہ فعل نہیں اور بالخصوص جمہوری طریقہ اقتدار کے ماتحت اس میدان میں پیش قدمی کے لئے جن جن اسباب و ذرائع اور جس قسم کے جائز و ناجائز ہتھکنڈوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ انسانی اقدار کو سمجھنے اور اپنانے والے افراد کی ہمت اور دسترس سے بہت دور ہوتے ہیں پس ایسے لوگ ہی اس میدان میں کود سکتے ہیں جو جائز و ناجائز ہر رنگ اختیار کر سکنے پر قادر ہوں جو وعدہ کرنے میں سچ و جھوٹ کے درمیان ملاوٹ کر سکیں اس کو پورا کرنے یا کر سکنے کی فکر سے بے نیاز ہوں اسی طرح درست و غلط کہنے یا کرنے میں نہ فرق کریں نہ شرائین، نہ کڑائیں اور نہ گھبرائیں بلکہ سیاسی میدان میں اس قدر دلیر ہوں کہ اگر بھرے مجمع میں ان کی بات جھوٹی بھی ثابت ہو جائے تو اُن کے چہرہ پر نہ عرقِ خجالت آئے نہ ماتھے پر شکن نہ زبان میں لکنت اور نہ مسکرا سنے و مینے میں فرق آئے اسی طرح پارٹی کو مضبوط کرنے کے لئے ہر آدمی سے ہر قسم کا وعدہ کرنے میں جھجک نہ محسوس کریں اور ردِ مقابل کو جائز و ناجائز طور پر ہر برے کچھڑ میں ملوث کرنے پر پوری جرات کا مظاہرہ کر سکیں۔ پس نہ دوسرے کی توہین کو گناہ سمجھیں اور نہ اپنی توہین کو تیک سمجھیں اور اس قسم کی دریادلی کے ساتھ ساتھ مالی ذرائع میں بھی کافی وسعت ہو۔

اور اس میں شک نہیں کہ ایسوں کا مقابلہ ایسے ہی کر سکتے ہیں پس اس میدان میں جو جیتے گا وہ لازماً ایسا ہی ہوگا جیسا کہ بیان ہو چکا ہے تو ایسی صورت میں انسانی تقاضوں کا جب سے سے خون ہو جاتا ہے تو بعد میں انسانیت کی لاج کون رکھے؟ پس اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اقتدار کی کرسی ہر وقت ڈاواں ڈول رہے گی اور تختِ حکومت ہر وقت تختہ دار یا زندان کا پیش خیمہ رہے

گا اور ساتھ ساتھ انسانیت کی کشتی ظلم و جور کے تلاطم میں ہچکولے کھاتی پھرے گی اور عوام الناس امن و سکون کے لئے ترستے ہوئے زندگی کو خیر باد کہہ کے چلتے رہیں گے۔

اور اس بیان کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ جمہوری ذرائع سے اقتدار کی منتقلی صحیح اور حقدار انسانوں کی طرف بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے کیونکہ افراد انسان یہ میں کثرت غیر سنجیدہ لوگوں کی ہوا کرتی ہے اور سنجیدہ افراد بہت کم ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں وہ اس میدان میں قدم نہیں رکھ سکتے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کیونکہ اس میدان میں ایک سو ایک جاہل کو پورے ایک سو عالم و فاضل پر سبقت حاصل ہے پس اگر ایک طرف ایک سو دانشمند کامل انسان ہوں اور دوسری طرف ایک سو ایک احمق و بیوقوف انسان ہوں خواہ مرد ہوں یا عورتیں تو ان کی حیثیت ہے لہذا نظام جمہوریت میں دانشمندی کے اقتدار کا تصور بالکل ناشدنی امر ہے۔ چنانچہ اسلام کے دورِ اول میں حضرت علی علیہ السلام ان ہی وجوہ کے ماتحت پس پشت ہوئے اور دوسرے لوگ پیش رو بن گئے۔ معاویہ جیسا انسان اقتدار پر قابض رہا اور امام حسن جس کو پیغمبر نے جو انانِ حجت کا سرِ دار کہا تھا وہ گوشہ نشینی پر مجبور ہو گئے اسی طرح یزید عنید کثرت کی مہنوائی کے صدقہ میں تخت نشین رہا اور امام حسین نے اپنے قلیل برابر بیوں کے ساتھ جامِ شہادت پی لیا۔ تاریخ اسلام کے ان سابق اوراق سے وابستگی رکھنے کے بعد یہ احساس انسان جمہوری طریق حکومت کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے لیکن اکثریتی رجحان ایک طوفان بے کراں بن کر یہ انسان کو اپنی رو میں تنکوں کی طرح بہائے لے جا رہا ہے اور اس طوفان کا منزلہ موڑ نامہ و منہل نہیں بکھٹا ہوا ناممکن ہے پس کرنی اقتدار عیاشی کی آماجگاہ ہوتی ہے جسے شاطرائہ طریقہ سے حاصل کیا جاتا ہے عوام کی خدمت کے لئے نہیں بلکہ عوام پر حکومت کرنے کے لئے اور انسانیت کی بھلائی و خیر خواہی کے لئے نہیں بلکہ اپنی بھلائی و بہبود کے پیش نظر انسانوں کو غلام بنانے کے لئے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حمران رعایا کی جانب سے مطمئن ہوتا ہے اور رعایا حکمران کی جانب سے سکون حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ دو طرفہ بے چینی مستقبل قریب میں نئے اقتدار کو جنم دے کر دم لیتی ہے۔

دورِ حاضر میں اسلامی حکومت کا تصور

اقتدار کی منتقلی میں بے راہ روی کی جوابدہا۔ مسلمانوں میں روزِ اول سے ہونی اس کا خمیازہ ان کو ہمیشہ بکھٹنا پڑا۔ اگر رسالت مآب کی وصیت کے پیش نظر حضرت علی کی نامزدگی پر اکتفا کیا جاتا اور

اس کے مقابلہ میں جمہوری طریق کار کو رائج نہ کیا جاتا تو ایک طرف اُمتِ اسلامیہ دورِ اول کے گھناؤنے واقعات سے دامن بچا لیتی اور دوسری طرف اقتدار کی منتقلی کے پُر امن ذرائع ہاتھ سے نہ چھوٹتے۔

اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ دورِ حاضر میں اسلامی حکومت کو کنسی تصور ہوگی تو اس کا جواب صرف یہ ہی ہو سکتا ہے کہ جمہوری تقاضوں کے پیش نظر اگر حکومتِ اسلامیہ کے قیام کا نعرہ بلند کر کے عام رجحانات کو اپنے ساتھ ملا کر کوئی شخص یہ خدمت انجام دینا چاہے تو موجودہ طریق کار اور اسلامی اقتدار کی کس میرسی اور ساتھ ساتھ قیود مذہب سے آزادی کا عام تصور قطعاً اسے پیٹنے نہ دے گا۔ کیونکہ دورِ حاضر میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے ہر رائج الوقت ذریعہ کو اپنائے بغیر چارہ نہیں پس اقتدار کی کرسی سنبھال لینے کے بعد جس کسی کو خدا توفیق دے اور انسانی اقتدار کا قدردان بن کر خدمتِ خلق کی خاطر اپنے آپ کو پیش کرے پس خدائی اصولوں کو اپناتے ہوئے اسلامی طریق کار کو مشعلِ راہ بنائے۔ اور رعایا کے لئے عدل و انصاف کی راہیں ہموار کر کے اسلامی و شرعی آئین کو رائج کرنے کی جرات کرے تو ایسا شخص اپنی ذات کے لئے بھی صحیح خیر خواہ ہوگا اور افرادِ رعایا کی بھلائی کی توقع بھی اس سے ہو سکے گی اور یقیناً ایسا کرنے والا اپنے اندر رعایا کی جانب سے اطمینان محسوس کرے گا اور رعایا کو بھی اس کی حکومت میں امن و سکون کا سانس لینا نصیب ہوگا اور ہر دو طرف سے جب بے چینی ختم ہو جائے گی تو مملکت چین و اطمینان کا گہوارہ ہوگی پس ایسی حکومت یقیناً اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق ہوگی اور اس میں آباد معاشرہ اسلامی معاشرہ تصور ہوگا۔ خدا کرے ایسا دن بہت جلد آئے جب حکمران طبقہ میں یہ احساس پیدا ہو اور ملک آنے دن کے فسادات و بے چینیوں سے پاک و صاف ہو کر اچھے اور تھرے ماحول کو جنم دینے کے قابل ہو۔

اسلامی مساوات

یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہے اور اس کے جذبات پر تفصیلی تبصرہ کے بغیر کسی نتیجہ کی ٹوہ لگانا دانشمندی نہیں اگر وقت نے ساتھ دیا تو اس موضوع پر الگ ایک کتاب پر قلم کی جائے گی سرِ دست نعرہٴ مساوات کے متعلق مختصر سی گزارش پیش کرنی ہے۔ جس کی تفصیل ہماری کتاب "اسلامی سیاست" میں کی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مساوات کا نعرہ اور بالخصوص اسلامی مساوات نہایت جاذبِ طبع اور خوش کن سببِ خدا کرے اس کے پیچھے پیچھے ظلم اور بے راہ روی کا ہاتھ پوشیدہ طور پر کارفرما نہ ہو۔

اللہ نے فطری اور خلقی طور پر کائنات کی کسی جنس و نوع میں مساوات کو جگہ نہیں دی بلکہ اعلیٰ و ادنیٰ افراد پر مشتمل اجناس و انواع معرض وجود میں منصفہ شہود پر جلوہ گر ہو کر ارباب دانش کے لئے کھلی ہوئی دعوت فکر کا انتظام اپنے اندر رکھتی ہیں۔ بنا بریں طبقہ انسان بھی اس قسم کے خلقی و فطری اختلافات کی زد سے محفوظ نہیں۔ جو بصورت، بد صورت، نیک بد، دراز قد، پستہ قد، ذہین، احمق، محنتی، نیکے، کامل ناقص، شریف رذیل، وفادار غدار، طامع قانع، شاکر کافر، مالدار غریب اور صحت مند و بیمار، غرضیکہ ہر انسانی صفت میں اعلیٰ و ادنیٰ افراد کا وجود فطری و فطری تقسیم کا مظاہرہ ہے جس سے انکار کرنا فطری اقدار کو ٹھکرانے کے مترادف ہے۔ اسی طرح دنیاوی زندگی کی ہیئت کے لئے نظریاتی فرق اذیان انسانیہ کی فطری آزادی کی لازمی پیداوار ہے جس کے سیل رواں کو روکا نہیں جاسکتا نیز تحصیل منفعت اور کسب دولت کے لئے فکر و نظر اور مناسب ذرائع کے استعمال میں طرق و اسباب کی تعیین اور عملی اقدام میں افراد انسانیہ کے درمیان معتد بہ فرق نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جہاں ایک انسان نفع مند ہوتا ہے تو دوسرا نقصان و خسارہ کا منہ دیکھتا ہے اور دوسرے وقت میں پہلا آدمی خسارے سے دوچار ہو جاتا ہے تو دوسرا آدمی نفع مندی کے گیت گا تا نظر آتا ہے اور یہ رد و بدل اور نشیب و فراز انسانی زندگی کے لوازم ہیں۔

ہے جس طرح صحت و مرض کو لازم بدن کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح ایک آدمی تنومند حسیت و چالاک ہونے کے باوجود محض نکما اور مدت سے رہتا ہے اور اس کے مقابلہ میں ایک تپلا و بلا اور نحیف و لاعز انسان یا تھپاؤں ہلا کر اور بدن کو مستحکم میں ال کر کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہے اور جس طرح ایک نکما انسان دوسروں کی کمائی پر لچائی ہوئی نظریں ڈالتا ہے اسی طرح باہمت انسان دوسروں کی کمائی پر نظر ڈالنا اپنی غیرت و حمیت کی موت سمجھتا ہے۔ اسی طرح ایک فضول خرچ آدمی ہزاروں روپوں کو چند لمحات میں تلف کر بیٹھتا ہے اور اس کے مقابلہ میں قانع آدمی ایک پُر وقار زندگی کی خاطر کاروبار یا جائداد کی طرف اقدام کرتا ہے اور اسی قسم کے خلقی و فطری اختلافات امیر و غریب کے فرق کے موجب بنتے ہیں۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ ایک زمیندار کے دو بیٹوں میں سے ایک نے اپنی عیاشی کی خاطر اپنی جائداد کو ڈیو کے داموں سچپی اور کنکال ہو کر بسر اوقات پر مجبور ہوا اور اس کی اولاد گداگری یا مزدوری یا کسی مناسب ملازمت کی تلاش میں بہکتی پھری اور دوسرے نے قناعت سے وقت گزارتے ہوئے مروت جائداد کے ساتھ ساتھ اور بھی خرید لی اور ٹھاٹھ کی زندگی گذاری اور اس کی اولاد نے بھی اُسی ٹھاٹھ سے بسر اوقات کی۔ اسی طرح تاجر کے لڑکوں میں سے جو نکما اور نکمھٹو ہوا اس نے غلط کاریوں اور وابستگیوں

میں موروٹ روپیہ سنانے کو دیا اور اس کے لائق و ذہین بھائیوں نے اپنی تجارت کو فروغ دے کر دنیا کی ریل پل کے ساتھ فرحت و سرور کی مسندوں پر آرام سے وقت گزارا۔

ان فطری و خلقی اختلافات کو نظر انداز کرنا دانشمندی نہیں اور ان کا انکار کرنا کسی کے بس کا روک نہیں باقی رہا ان کو ختم کر دینا یہ فطرت کے خلاف کھلی جونی جنگ ہے جس کو فتح کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اب یہی اصلاح تو اس کا ہر صاحب دل کو قدردان ہونا چاہیے لیکن کیا اصلاح کا راز اسی میں مضمر ہے کہ بڑوں کی ملکیت کو چھوٹوں میں تقسیم کر کے سب کو چھپا بنا دیا جائے یا چھوٹوں کے لئے اسباب کی فراوانی کر کے ان کو بڑوں کے دوش بدوش چلانے کی کوشش کی جائے؟

مذکورہ بالا فطری و خلقی اختلافات کے علاوہ حالات و ماحول کی سازگاری یا ناسازگاری بھی بعض اوقات طبقاتی اختلافات کی باعث و موجب یا محرک و داعی بن جاتی ہے مثلاً ایک ہی باپ کے دو بیٹوں میں جو بھائی و بھائی برابری تقسیم ہوئی، ایک کے حصے میں زرخیز ٹکڑا آگیا اور دوسرے کے حصے میں کمزور خط آیا یا ایک کے لئے اسباب آب پاشی کی فراوانی ہو گئی اور دوسرا اس سے محروم رہا۔ یا ایک کے فصل پختہ پر آفات سما دیئے بلابل دیا اور دوسرا محفوظ رہا تو ایسی صورتوں میں بھی نتیجہ یہی نکلے گا کہ کوئی امیر ہوگا اور کوئی غریب ہوگا پس ان اسباب و ذرائع پر کنٹرول کرنا انسان کے بس سے باہر ہے اور ان کا سرے سے انکار کرنا محض کور باطنی ہے۔

اگر طبقاتی اختلاف کی وجہ افراد انسانیہ کی بے راہ روی سے پیدا ہوں تو ان کی روک تھام اور موثر تدابیر سے ان کا قلع قمع حکومت و وقت کے فرائض میں داخل ہے جس طرح کہ فطری و خلقی اختلافات کی بدولت ہونے والے طبقاتی فرق میں زیر دست کی سپردستیوں اور استبدادی بدستوں سے زیر دست کی نگہداشت حکومت کے ذمہ ہے۔

پس بے راہ روی اور ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ املاک دولت کو ظالم منافع خوروں کے قبضہ سے نکال کر مستحقین تک پہنچانا ہر انصاف پسند طبیعت کے لئے قابل قبول ہے اور حکومت و وقت اس فریضہ کو باسن طریق انجام دے سکتی ہے جس طرح کہ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے وہ اقتدار میں اس قسم کی اصلاحات نافذ فرما کر آنے والی نسلوں کے لئے اقتصادیات کی بہترین شکل و نمونہ فرمائی۔ چنانچہ ناجائز حاصل شدہ تمام دولت و املاک کو بیت المال میں واپس کرنے کا حکم صادر فرمایا اور تمام مسلمانوں کو ان میں برابر کا شریک قرار دیا اور بعد میں آنے والی ہر اسلامی حکومت کے لئے اسوۂ حسنہ کی شکل فرمائی اور اس مسئلہ میں ہر بڑی سے بڑی مخالفت کو

قابل اعتناء بھانپنا پچا امیر شام کی بغاوت کی سب سے بڑی وجہ تھی یہی ہے کہ اس کو اپنی املاک و جاگیروں سے دست بردار ہونا پڑتا تھا پس خلیفہ سابق کے قتل کے انتقام کا سنا نہ کر آگے بڑھا اور بنی امیہ کے تمام ناجائز منافع خوروں اور جاگیرداروں نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور ایک متحدہ محاذ بنا کر نبرد آزما ہو گئے۔

ہاں ہمہ حضرت علی علیہ السلام نے ان لوگوں سے زمینیں اور جائیدادیں نہیں چھینیں جو جائز طور پر ان کے وارث و قابض تھے اور نہ ایسے لوگوں سے دولت چھینی جو جائز طور پر کماکر دولت مند ہوئے تھے البتہ وہ کسی زبردست کو زبردست کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کا موقع نہ دیتے تھے اور نہ کسی بڑے کو چھوٹے پر ظلم کرنے کی اجازت یا مہلت کے حق میں تھے بلکہ اس سلسلہ میں اپنی جانب سے معین کردہ تمام حکام دولت کو کڑی نگرانی کی ہدایت کرتے تھے پس ان کے دور حکومت میں ہر کمزور کے لئے قصر حکومت کے دروازے کھلے تھے اور وہ بلا تھجک اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی شکایت کر سکتا تھا اور اس کی دادرسی بھی ہوتی تھی اور ظالموں کو سختی سے کنٹرول میں رکھا جاتا تھا تاکہ امیر امیر رہتے ہوئے غریبوں پر درندوں کی سی نکاہیں نہ اٹھا سکیں اور غریب غریب رہتے ہوئے بھی امیروں کے دوش بدوش بلا خوف و خطر دنیا کی ریل پیل میں شریکِ مسرت رہیں اور امن و اطمینان سے پرسکون زندگی گزارنے کے قابل ہوں۔

پس اسلامی مساوات - عدل و انصاف کا دوسرا نام ہے۔ یعنی عدلیہ کے دروازے امیر و غریب دونوں کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوں۔ قانون کی تمام حقوق امیر و غریب دونوں پر برابر حاوی ہوں۔ انتظامیہ کے دروازوں تک امیر و غریب دونوں کے لئے سہانی پوری طرح میسر ہو اور ہر ایک کے لئے عدل و انصاف کی بساط کھچی ہو اور قانونی شہنشاہ کی گرفت اس قدر مضبوط ہو کہ نہ منیت و زاری سے اس کو ڈھیلا کیا جاسکے اور نہ رشوت و رعب اور نہ دھونس و دھاندلی سے اس میں نرمی پیدا کرنے کی گنجائش ہو۔

غریب کو کلپنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

اگر اس سوال کو تشریحی طور پر دیکھا جائے اور جذباتی نظریہ سے اس کا جائزہ لیا جائے تو فوراً اس کا جواب یہی دیا جاتا ہے کہ جاگیردار اور دولت مند کا غنا و دار و غیرہ اس سنگین مجرم کے قریب ہیں لیکن اگر غنہ سے دل سے اس کی تہ تک بھانک کر مکمل انصاف کی جائے تو مسئلہ مہم ہو گا کہ

بالا تر جو کر غریب کو کچھ نہیں آتا، ساتھ دیتے ہیں پس اگر حکمران طبقہ کے دل میں عوام رعایا کا درد ہو اور وہ آفسران پر کڑی نظر رکھیں اور آفسران وقت کے دل میں یا تو رعایا کا درد ہو یا حکومت کا خوف ہو پس وہ قانونی شکنجے میں بہر مجرم کو جکڑنے کی جرأت کریں خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو تو مجال نہیں کہ کوئی کسی کا خون چوس سکے یا کسی کے امن و اطمینان میں خلل انداز ہو سکے۔

پس اسلامی مساوات صرف یہی نہیں کہ زمینداروں سے زمینیں کا رخا، داروں سے کارخانے دولت مندوں سے دولت اور جاگیرداروں سے جاگیریں ضبط کر کے امیر و غریب سب کو برابر کر دیا جائے کیونکہ زندوں سے موت حیات سلب کر کے سب کو مرد بنا کر کیا جانے سے یہ بہتر ہے کہ مردوں میں موت حیات چھٹک کر ان کو زندوں کے دوش بدوش چلنے کا موقع دیا جائے اسی طرح طلاق کو کمزور کر کے سب کو کمزوری میں برابر کرنے سے بہتر ہے کہ کمزوروں کی طاقت کو بڑھا کر سب کو طاقتور بنانے کے بعد ایک دوسرے کے دوش بدوش چلنے کے اسباب پیدا کئے جائیں۔ اور بیمار انسان کا علاج یہ نہیں کہ اسے زہر دے کر مرنے کر دیا جائے بلکہ اس کی بیماری کا سراغ لگا کر بیماری کے اسباب کی روک تھام کے لئے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں خداوند کریم اگر چاہتا تو دنیا میں جہاں اس نے جیٹیں اور بکریاں پیدا کی ہیں وہاں جیٹوں اور اس قسم کے ظالم و رندوں کو پیدا ہی نہ کرتا لیکن اس نے کمزور و طاقتور دونوں کو پیدا کر کے کمزوروں کی مخالفت کے لئے انسانوں کو ان کا پاس بان بنا دیا۔ اسی طرح انسانوں میں بھی کچھ شریف طبقہ اور کچھ رند و مزاج افراد پیدا کر دیے اور شریفوں و بے کسوں کی پاسبانی اس نے حکمران قوم کے حوالہ کر دی پس اس کی جانب سے غلام کردہ و آئین کا تقاضا یہ ہے کہ طاقت ور سے طاقت چھیننے کے بجائے اس کو قانون اسلام کی گرفت سے خوف نہ کر کے بے بسوں اور بے کسوں پر دست و رازی سے رکھا جائے اور یہی چیز انسانی سکون کا عالمی امن کو برقرار رکھنے کا واحد اور موثر ذریعہ ہے۔

قانونی گرفت کے ساتھ ساتھ اسلام نے امیر و غریب کو ایک

امیر و غریب میں تعاون

دوسرے کے قریب تر کرنے اور ایک دوسرے کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے جو تمدنی ذرائع اور اخلاقی مضبوطی تشکیل کئے ہیں عالم کی کوئی تہذیب اور دنیا کا کوئی آئین اس سے بہتر پیش نہیں کر سکتا مثلاً ایک طرف امراء طبقہ کو بکتر اور بھائی سے اجتناب کی دعوت دی تو دوسری طرف غریب طبقہ کو خود داری اور خود اعتمادی کا جذبہ تعلیم کرتے ہوئے ان کو ادارہ کے سامنے دست سوال دروازہ کرنے سے منع فرمایا۔ اسی طرح امراء کو طربا پر حسد و قہر کرنے کا حکم دیا اور ان کے اموال سے نفس و زکوٰۃ و خیرات وغیرہ کی ادائیگی کو واجب قرار دیا اور غریب کو امراء کے مال پر چھاپی

ہوئی نظریں ڈالنے سے گریز کرنے کی دعوت دی اور مالِ حرام سے بچتے ہوئے اپنے تھوڑے حلال پر قناعت کرنے کا سبق دیا۔ ایک طرف امراء کو غریب طبقہ کے لوٹنے سے منع کیا تو دوسری طرف غرباء کو امراء کا مال چرانے سے باز رکھا۔

جہاں ایک طرف امراء کو ظلم سے منع کیا وہاں دوسری طرف غرباء کو صبر و ضبط اور سکون و حوصلہ کی تلقین فرمائی اسی طرح ایک طرف مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بھائی بنا کر امیر و غریب کو ایک سیٹج پر کھڑا کیا اور ایک دوسرے سے محبت کے بڑا ڈکوا ایمان کی علامت قرار دیا اور تشدد و زیادتی سے منع فرمایا تو دوسری طرف تجاویز و شہادتیں دے کر انسانیت کے لئے روحانی حبّت کا سامان مہیا فرمایا خداوند کریم تمام مسلمانوں کو صحیح اسلامی جذبہ سے سرشار ہونے کی توفیق دے تاکہ امیر و غریب اور حکمران و رعایا سب الٰہی نیکوئی میں وسکون کا سانس لیں۔

حضرت علی علیہ السلام کی حکومتِ روشنی کا مینار تھی

اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ حضرت علی کا دورِ اقتدار و حقیقت پوری اُمتِ اسلامیہ کے لئے روشنی کا وہ بلند مینار ہے جسے جاہ و اقتدار کی آندھیوں نے گرد آلود کرنے میں کامیابی حاصل نہ کی اور آپ کی خلافت ہی صحیح معنوں میں خلافتِ راشدہ کہلانے کے مستحق ہے۔ جاہ طلبی ہو جس اقتدار عیش کوشتی اور اقرارِ بالِ نوازی کے پرستار حکمرانوں کے لئے حضرت علی کی طرزِ حکومت خارجِ چشم تھی۔ ان کے لئے اسلامی طریق کار کو اپنانا اور اپنی خواہشاتِ نفسیہ و جذباتِ ذاتیہ کو کچلتے ہوئے قرآنی تعلیمات کا بول بالا کرنا نہایت مشکل ترین امر تھا خصوصاً وہ لوگ جو محبتِ نبوی سے فیض یاب نہ ہو سکے تھے یا صحابیت کا لیبل تو ان پر چسپاں ہو گیا تھا لیکن بہت کم وقت بارگاہِ نبوی کے شرف سے مشرف ہو سکے تھے اور ان کے دلوں سے ابھی زمانِ جاہلیت کی کافرانہ عادات کا رنگ نہیں اُترا تھا۔ حضرت علی کی حکومت میں انتشار پھیل کر میدانِ سیاست میں آدھمکے اور بالآخر تمام اقتدار ہاتھ میں لے کر اُمتِ اسلامیہ کی گردنوں پر سوار ہو گئے۔ ان لوگوں کے لئے حضرت علی کا طرزِ بہا نبائی قطعاً قابلِ عمل تو بجائے خود قابلِ برداشت بھی نہ تھا پس انہوں نے عوام الناس کے رجحانات کو بدلنے اور اپنے اقتدار کا سکہ جانے کے لئے یہ حربہ نکالا کہ حضرت علی اور اس کے اشیاع پر سب و شتم عام کیا جائے اور ہر مجلس و منسل میں ان کو بدنام کرنے کی سعیِ بلیغ کی جائے چنانچہ سرکاری آرڈینیٹس کے ذریعے اطرافِ مملکت میں اس جیاسوز

تحریک کو قانونی حیثیت دی گئی تاکہ رفتہ رفتہ لوگوں کے دلوں سے علی علیہ السلام کا وقار اٹھ جائے اور ان کے طرز حکومت کی خوبی کو نظر انداز کرنے کے بعد لوگ اموی دور اقتدار کی دھاندلیوں کو اسلامی سیاست کے رنگ میں ڈھال سکیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

حقیقت بین نگاہیں بناوٹ کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کا دامن چاک کر کے شمس حقیقت کا سراغ لگالیتی ہیں۔ اموی استبداد کی گھناؤنی تاریکیوں کی تہوں کو حقیقت رسائطرس عدل وانصاف کی قندیلوں کے ذریعے چیرتی پھاڑتی اور اُلٹی پلٹی ہوئی قمرامت کی ضیا پاشیوں سے ہمکنار ہو کے رہیں اور الحاد و زندقہ کے دھند لکوں میں جو رواجعتسات کی طوفانی موجوں کا مقابلہ کرنے کے بعد سمیت نہ ہارنے والے محقق آنسر منزل مقصود اور ساحل مراد حاصل کر کے رہے الصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُولٌ کی مصنوعی آڑ خبیرو القودن قسوفی کی فرضی دیوار اور صحابی کالذجوم کا جعلی حصار اگرچہ سطحی آدمیوں کو مرعوب کر کے حقیقت کی تہوں تک جھانکنے سے روک لیتا رہا لیکن جس قلب میں قندیل انصاف روشن ہو جس کا سہ سر میں فانوس عقل منور ہو اور جس ذہن میں تحقیق و تدقیق کا مادہ موجود ہو اور پہلو میں عزم مصمم موجود ہو وہ اپنے نظرو فکر کو تقلید گذشتگان کا قیدی کیوں بنائے؟ اُسے حق پہنچتا ہے کہ مصنوعی آڑوں فرضی دیواروں اور جعلی حصاروں کے اندر جھانک کے عادلانہ و منصفانہ جائزہ لے۔

چنانچہ اموی اقتدار کا تختہ اُلٹتے ہی ارباب تحقیق فکر و نظر کے تازی تیز رو پر سوار ہو کر مہمیز عدل و استقلال کے ساتھ میدان میں نکلے تو مصنوعی حصاریں ان کے پائے تحقیق کی ٹھوکر سے پاش پاش ہوئیں اور حق و باطل کی آمیزش کی خطرناک اور افسوسناک سازشوں کی قلعی کسل گئی ہر گوش حق پرورش نے سن لیا۔ ہر حق بین نگاہ نے ناز لیا اور ہر منصف بلیع انسان نے سمجھ لیا کہ رسالت مآب کے بعد ہوس اقتدار کے متوالوں اور کرسی حکومت کے پرستاروں نے اپنی جاہ پرستیوں کو شرعی غلاف میں چھپانے اور اپنے باطل طریقہ کار پر حق کا لیل لگانے کے لئے فرضی احادیث کی آڑ میں امت اسلامیہ کو گرویدہ بنانے کے لئے یہ پروگرام مرتب کیا تھا اور اموی دور اقتدار میں باطل پرستی کو مقبول عام کرنے کے لئے قائد حق اور امام عدل کے کردار پر پردہ ڈالنے کے لئے حضرت علی اور شیعان علی کو سب و شتم کا نشانہ بنایا گیا تھا تاکہ پشت بہ پشت امام حق پرکالی کلوچ کی بوچھاڑ سننے والی امت کہیں بھی ان کے کردار حق سے متاثر نہ ہو سکے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مؤرخ اسلامی تاریخ کو مرتب کر رہے تھے محدث احادیث نبویہ کو جمع کر رہے تھے مفسر قرآنی تناسبہ کو عام کرنے کے درپے تھے اور فقہا شرعی منابط حیات کو ترتیب

دے رہے تھے۔ اگرچہ اکثریت کے اذہان اموی تاریک دور کے تربیت یافتہ تھے جو حضرت علی اور شیعان علی کے متعلق اچھی بات سننے اور باور کرنے کے قطعاً عادی نہ تھے لیکن ہر دور میں منصف مزاج گروہ بھی ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ و صداقت کا خود پاسبان ہے وہ ایسے افراد پیدا کر دیتا ہے جو حقیقت رسا ہوتے ہیں پس اسی دورِ نابینائی و تصنیف میں اگرچہ بعض مصنفین نے اموی ذہنیت کی لاج رکھی اور حضرت علی کی ہر فضیلت کو جرح و قدح کے ناخنوں سے نوچنا اپنا شیوہ بنایا لیکن بعض مصنفین نے عدل و انصاف کے تقاضوں کو اپناتے ہوئے حضرت علی کے مناقب و محامد کے نقل کرنے میں سخی نہ کیا اور مجموعی طور پر حضرت علی کے فضائل و مناقب باوجود ناسازگار حالات کے اس قدر منظرِ عام پر آئے کہ جمہوری حکام اور عوامی سلاطین کے مناقب باوجود حالات سازگار ہونے کے اس قدر نہ آ سکے اور جب پردہ اٹھا تو ہر دیکھنے والے نے دیکھ لیا کہ جن لوگوں کو بڑے طمطراق سے خلافتِ راشدہ کا مایہ ناز حکمران تسلیم کیا گیا وہ بھی "لَوْ لَا عَلِيٌّ لَهْلَكَ عُمَرُو" کا نعرہ لگاتا ہوا کرسیِ اقتدار پر تشریف فرما حضرت علی کی حکومت کا ہر شعبہ بلکہ آپ کی پوری زندگی کا ہر لمحہ اسلامی تعلیمات کا صحیح آئینہ دار ہے۔

کردار میں بلندی جناب مودودی صاحب خلافت و ملکیت^۹ میں فرماتے ہیں کہ کبھی کسی ایسے شخص سے بازار میں کوئی چیز خریدتے تھے جو آپ کو جانتا ہوتا کہ وہ قیمت میں امیر المومنین ہونے کی بنا پر آپ کے ساتھ رعایت نہ کرے جس زمانے میں حضرت معاویہ سے ان کا مقابلہ درپیش تھا لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ جس طرح حضرت معاویہ لوگوں کو بے تحاشا انعامات اور عطیے دے دے کہ اپنا ساتھی بنا رہے ہیں آپ بھی بیت المال کا منہ کھولیں اور روپیہ بکا کر اپنے حامی پیدا کریں مگر انہوں نے یہ کہہ کر الیا کرنے سے انکار کر دیا "تم چاہتے ہو میں ناروا طریقوں سے کامیابی حاصل کروں" ان سے خود ان کے بڑے بھائی حضرت عقیل نے چاہا کہ بیت المال سے ان کو روپیہ دیں مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا بھائی مسلمانوں کا مال تمہیں دے کر جہنم میں جائے۔

بروایت مجاہد ابن عباس بیان کرتا ہے کہ میں نے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے سنا کہ کانٹوں کے لیٹر پر بے چینی سے رات بسر کرنا اور زنجیروں میں جکڑ کر گھسیٹا جانا میرے لئے اس سے بہتر ہے کہ دربارِ خداوندی میں ظالم یا غاصب ہو کر پیش ہوں اور میں ظلم کا ارتکاب کیونکر کر سکتا ہوں جب کہ جانتا ہوں کہ انجام کار فنا ہے اور مدتِ مدید تک زیرِ خاک رہنا ہے۔ پس خدا اگر

آمان کے نیچے آباد ہونے والی اس دنیا سے سات گنا زیادہ سلطنت مجھے دی جائے اس لئے کہ ایک پیونٹی کے منہ سے ایک بکاوانہ غصب کر لوں اور اللہ کی نافرمانی کروں تو میں ایسی حکومت کو ہرگز قبول نہ کروں گا اور میرے نزدیک اس دنیا کی حکومت اس پتے سے بھی حقیر تر ہے جو بکڑی کے منہ میں ہو۔

(تذکرہ خواص الامہ (سبط بن الجوزی)

حضرت ابوذر صحابی رسول کو دور عثمانی میں مدینہ سے جلا وطن کر دیا گیا تھا اس لئے کہ وہ افسہ با پروری و غیرہ اندوزی اور بیت المال کے ناجائز اخراجات کو ناقابل برداشت قرار دے کر حکومت وقت کے اقدامات پر کڑی نکتہ چینی کرتے تھے جس کو حکومت برداشت نہ کر سکی۔ حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے اسی زمانہ جلا وطنی میں حضرت ابوذر کو ایک خط تحریر فرمایا۔

اما بعد۔ اے ابوذر۔ تم نے خوشنودی خدا کے لئے غصہ کیا لہذا اسی سے ہی اپنی امیدیں

دابتہ رکھو یہ لوگ اپنی دولت کے بارے میں تجھ سے خوف زدہ تھے اور تمہیں ان لوگوں سے اپنے

دین کا خطرہ تھا۔ پس ان کے لئے وہ چیز چھوڑ دو جس کا انہیں تم سے خوف ہے اور جس چیز کا تمہیں ان

سے ڈر ہے اُسے لے کر بھاگ جاؤ۔ یہ لوگ درحقیقت اس چیز کے ضرورت مند ہیں (نصیحت و

خیر خواہی) جو تم اپنے پاس رکھتے ہو لیکن تم اس چیز سے بے نیاز ہو (مال و دولت) جو یہ اپنے

پاس رکھتے ہیں کل (بروز قیامت) راز کھلے گا کہ نفع میں کون رہا (اور خسارے میں کون) الخ

(تذکرہ خواص)

مودودی صاحب خلافت و ملکیت

حصہ ۹۳ پر رقمطراز ہیں۔

حکومت اور رعایا کے لئے دستور العمل

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قیس بن سعد کو مصر کا گورنر مقرر کر کے جو فرمان اہل مصر کے نام

بھیجا تھا اس میں وہ فرماتے ہیں۔

خبردار ہو! تمہارا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق

عمل کریں اور تمہارے معاملات کو اللہ کے مقرر کردہ حق کے مطابق چلائیں۔ اور بنی

صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو نافذ کریں اور تمہارے درپردہ بھی تمہارے ساتھ خیر خواہی

کریں۔

اس فرمان کو مجمع عام میں سناتے کے بعد قیس بن سعد نے اعلان کیا کہ اگر ہم اس طریقہ پر

تمہارے ساتھ بتاؤ نہ کریں تو ہماری کوئی بیعت تم پر نہیں ہے۔ حوالہ الطبری ج ۳ صفحہ ۵۵۔

ایک گورنر کو حضرت علیؑ نے لکھا۔

اپنے اور رعیت کے درمیان لمبے چوڑے پردے حائل نہ کرو۔ حکام کا رعیت سے پردہ کرنا نظر کی نگاہ اور علم کی کمی کا ایک شاخصانہ ہے اس پردے کی وجہ سے ان کو صحیح حالات معلوم نہیں ہوتے چھوٹی باتیں ان کے لئے بڑی بن جاتی ہیں اور بڑی باتیں چھوٹی ہو جاتی ہیں اچھائی ان کے سامنے برائی بن کر آتی ہے اور برائی اچھائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور حق باطل کے ساتھ غلط ملط ہو جاتا ہے۔ حوالہ ابن کثیر ج ۸ ص ۵۷۔

یہ حضرت علیؑ کا محض قول ہی نہ تھا بلکہ ان کا عمل بھی اس کے مطابق تھا کوفہ کے بازاروں میں خود دروے کر نکلتے۔ لوگوں کو برائیوں سے روکتے بھلائیوں کی تلقین کرتے اور تاجروں کی ایک ایک منڈی کا چکر لگا کر یہ دیکھتے تھے کہ وہ کاروبار میں بددیانتی تو نہیں کر رہے ہیں اس روزمرہ کی گشت میں کوئی اجنبی آدمی ان کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ بلا واسلام کا خلیفہ اس کی آنحوں کے سامنے پھر رہا ہے کیونکہ نہ ان کے لباس میں بادشاہی کی شان ظاہر ہوتی تھی اور نہ ان کے آگے کوئی چوہدری ہٹو بچو کھڑا تھا۔ حوالہ ابن کثیر ج ۸ ص ۵۷۔

اس مقام پر نہایت مناسب ہے کہ حضرت علیؑ علیہ السلام کی ایک تقریر کا اقتباس پیش کیا جائے جس میں آپؑ نے سلطان و رعایا کے حقوق کے متعلق تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

اما بعد۔ مجھے خدائے تعالیٰ نے تمہارے اوپر حق ولایت عطا فرمایا ہے تمہارا میرے اوپر ویسے ہی حق ہے جیسے میرا حق تمہارے اوپر ہے۔ مقام بیان میں تو حق کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن مقام عمل میں بہت تنگ اور مشکل۔ اگر ایک مقام پر اس کا فیصلہ کسی کے حق میں ہے تو دوسرے مقام پر اسی کے خلاف ہونا بھی متوقع ہے اگر ایسی ذات تلاش کریں کہ ہر حق فیصلہ اسی کے ہی حق میں ہو اور اس کے خلاف کبھی نہ ہو تو وہ صرف ذات حق سبحانہ ہی ہے کیونکہ بندوں پر اس کو قدرت نامہ حاصل ہے اور رضا کے پیش نظر اس کا عمل عدل سے ہے لیکن بندوں پر اطاعت کو اپنا حق قرار دے کر اپنے فضل و وسعت رحمت سے اس کا بدلہ چند در چند مقرر فرمایا ہے اور وہ عطاۓ مزید کا اہل ہے اس نے اپنے حقوق میں سے بعض حقوق بندوں کی بیبود کے لئے انہی میں سے ایک دوسرے پر عائد کر دیئے ہیں جو اپنے مقام پر ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہیں اور اس طرح لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں کہ کسی ایک کے حق کے بموجب کی باعث بنتی ہے اور ان تمام حقوق میں سے

نہایت اہم بادشاہ و رعایا کے حقوق ہیں جن کو دینی و قار اور باہمی انس کے کلی نظام کو قائم رکھنے کے لئے خدا نے کل افراد پر واجب قرار دیا ہے کیونکہ رعایا کی اصلاح حکام کی اصلاح کے بغیر ناممکن ہے اور حکام کی فلاح رعایا کی استقامت کے بغیر ناشدنی ہے۔ اور جب رعایا کے دلوں میں حکام کے حقوق کا احساس ہو اور حکام رعایا کے حقوق کی پاسداری کو اپنا فریضہ سمجھیں تو حق کا بول بالا ہوگا دین کی راہیں ہموار ہوں گی اور عدل و انصاف کے جھنڈے بلند ہوں گے پس وہ دور بہترین دور ہوگا۔ اور وہ حکومت بہترین حکومت ہوتے ہوئے دوام پذیر بھی ہوگی دریں حالت مملکت کے بدخواہوں کی نظریں اور ان کے اچھے ارادے قعر بایس و مذلت میں دب کر رہ جائیں گے۔

اور بخلاف اس کے کہ اگر رعایا حکام سے دل برداشتہ ہو اور حکام رعایا کو کچلنے کے درپے ہوں تو اس کا نتیجہ سوائے باہم آویزی کے اور کچھ نہ ہوگا پس ظلم و جور کا علم بلند ہوگا دین کمزور اور سنت متروک ہوگی خود غرضی منظر نام پر آجائے گی احکام معطل ہوں گے۔ قلوب ناصاف ہوں گے بڑی سے بڑی حق تلفی یا بڑی سے بڑی باطل کوشی کا ذرہ بھر بھی احساس نہ رہے گا۔ شرفاء ذلیل ہوں گے اور کمینوں کا وقار بڑھے گا۔

سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا انصاف پسند طبقہ کے نزدیک حکمران کی فخر شکاری اور تکبر مزاجی ان کا انتہائی گھٹیا پن ہے اور میں قطعاً نہیں پسند کرتا کہ تم مجھے شناسند اور اپنی تعریف کا دلدلہ خیال کرو اور بحمد اللہ میں الیسا نہیں ہوں بالفرض اگر مجھے اپنی تعریف پسند بھی ہوتی تب بھی میں اللہ کے لئے تواضع کرتے ہوئے اس کو چھوڑ دیتا کیونکہ عظمت اور کبریائی صرف ذات اقدس الہیہ کے لئے مناسب ہے اور بعض لوگ اپنی تعریف سن کر لذت محسوس کرتے ہیں لیکن تم میرے سامنے میری تعریفیں نہ کیا کرو تاکہ اللہ کی جانب سے اور تمہاری طرف سے جو حقوق میرے اوپر عائد ہوتے ہیں ان سے صحیح طور پر عہدہ برا ہو سکوں لہذا میرے ساتھ تمہارا انداز گفتگو الیسا نہ ہو جیسا جابر حکمرانوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے اور مجھ سے ایسی چیزوں کی بابت خوف زدہ نہ ہوا کرو جو جلد باز سے خوف و ہراس کی موجب ہوا کرتی ہیں نہ میری بے جا خوشامد کیا کرو اور یہ خیال کرو کہ مجھے حق بات کہنے سے میری طبیعت پر بوجھ پڑتا ہے اور نہ میں اپنی بڑائی کا خواہشمند ہوں کیونکہ جو شخص کلمہ حق کو سن نہیں سکتا اس کے لئے عمل کرنا تو زیادہ بار خاطر ہوتا ہے لہذا تم لوگ حق کہنے میں کبھی مجھ سے جھجک محسوس نہ کیا کرو۔ اور نہ نیک مشورے دینے میں کوئی باک کرو کیونکہ میں بذات خود قولی یا فعلی خطا سے اپنی ذات

کو مستثنائیں کرتا جب تک اللہ ہی کی جانب سے کفایت (عصمت) نہ ہو (یعنی عصمت اس کی ذات کا عطیہ ہے میری عین ذات نہیں ہے) میں اور تم اس رب کے عہد و مملوک ہیں جس کے علاوہ کوئی دوسرا رب نہیں ہے ہمارے نفوس کی ملکیت جس طرح اس کو حاصل ہے ہمیں حاصل نہیں اس نے ہی ہمیں ایک ناموزوں حالت سے نکال کر مناسب اور سزاوار حالت تک پہنچایا ہے اسی نے ہی راہ گم کرنے کے بعد ہدایت اور بصیرت کے راستہ پر کھڑا کیا ہے انتہی بقدر الضورة

دین و اسلام ص ۱۵۱

آپ کے ان کلمات میں غور کیجئے۔ کیسے اچھوتے انداز اور نرالی طرز بیان کے ذریعے سے بعد میں آنے والے حکمرانوں کے لئے ایک بہترین دستور العمل پیش فرما رہے ہیں تاکہ وہ فخر و تکبر، خواہش نفس و حب مال، جاہ پرستی و خود ستائی اور عظمت و نخوت کے پیش نظر اپنے تئیں جھول چوک سے بلند نہ قرار دیں اور اقتدار کے نشہ میں اپنی ہر رائے درست و مناسب اور ہر تصرف کو بجا و بر محل نہ سمجھیں لہذا مملکت کی خوشحالی و بکالی اور بقا و ارتقاء کے لئے ہر جوڑ توڑ اور ہر محل و عقد کے وقت انہیں ایسی مجلس مشاورت کی طرف رجوع کرنا چاہیے جن کے نمبر ارباب عقل و دانش بلند حوصلہ عالی ہمت دین میں مضبوط خیر خواہی کے علمبردار ملک و ملت کے وفادار، اور اغراض صحیحہ کے حامل ہوں۔ یہ بعینہ اسی طرح ہے جس طرح خداوند کریم نے اپنے نبی کو ارشاد فرمایا: **يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ** (معاذات میں ان سے مشورہ لیا کرو) حالانکہ ان کی ذات گرامی اپنی قوم و اصحاب کے مشوروں سے بے نیاز تھی۔ آپ حامل وحی تھے اور روح الامین کی آمد و شد کا مقدس آستان آپ کی بارگاہ فیض انتساب تھی اور آپ کے مصاحبین میں اکثریت ایسے بدوی لوگوں کی تھی جو علوم و معارف سے بالکل کورے جبکہ آداب مجلس تک نہ جانتے تھے بایں ہمہ آپ کو ان سے مشورہ لینے کا حکم آنے والے حکمرانوں کے لئے ہمیشہ عبرت اور تازیانہ نصیحت بنے لیکن نہ ہر بادشاہ و سلطان اس مکان رفیع پر فائز ہو سکتا ہے اور نہ ہر خلیفہ مثل علی ہو سکتا ہے۔

ملک اشتر کو مصر کی گورنری پر مامور فرماتے

تقویٰ اور حقوق کے متعلق آپ کے جامع کلمات

نبوت نے آپ نے ان کو ایک وصیت نامہ دیا جس میں تحریر فرمایا ہے:-

اللہ سے تقویٰ کرو۔ اس کی اطاعت کو ہر امر پر ترجیح دو اور ان فرائض و سنن کی اتباع کرو جو اللہ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمائے کیونکہ اس کے بغیر سعادت ناممکن ہے اور ان کے انکار اور مخالفت میں بد بختی ہے اور دین خدا کافی یا تو دل اور زبان سے نصرت کرو۔ (دین و اسلام ص ۱۵۱)

حضرت حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے وصیت نامہ میں آپ نے فرمایا۔

اے فرزند میں تجھے اللہ کے تقویٰ، اس کی اطاعت، اس کے ذکر سے دل کی تعمیر اور اس کی توفیق سے
نفس کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ تیرے اور اللہ کے درمیان کے باہمی رشتہ سے اور کوئی رشتہ
زیادہ قابل وثوق نہیں ہے بشرطیکہ تم اس کو حقانے رہو۔ دین و اسلام ص ۱۸۵۔

آپ نے فرمایا۔ بیٹا اپنے اور غیر کے درمیان اپنے نفس کو میز بن قرار دو۔ پس غیر کے لئے وہی چیز
پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرو اور غیر کے لئے ایسی چیز نہ کرو کہ اگر وہ جو تمہیں اپنے لئے گوارا نہ ہو جس
طرح تمہیں اپنی ذات پر غیر کا ظلم پسند نہیں اسی طرح اپنی طرف سے غیر پر ظلم کو روک دو۔ اور جس
طرح تمہیں غیر سے امان مطلوب ہے اسی طرح تم خود بھی غیروں پر احسان کیا کرو اور جو چیز غیروں سے
تمہیں ہر می معلوم ہوتی ہے وہ اپنے نفس سے رو کرو۔ صاحبان غیر یعنی نیک لوگوں سے قرب اختیار
کرو تاکہ تمہارا شمار انہی میں سے ہو۔ اپنی مقبول چیز کی حفاظت غیر کی مقبول چیز کی طلب سے بہتر
ہے۔ یاس و ناامیدی کی تمنی لوگوں کے سامنے ہاتھ چیلنے سے بہتر ہے۔ پاکدامنی کے ساتھ کام کر
کھا یاس دولت مذہبی سے بہتر ہے جو فخر کے نسبے حاصل ہو۔ کمزور پر ظلم کرنا بدترین ظلم ہے۔

ذیل مدکار کا نہ ہونا بہتر ہے بھیل دوست کے ہونے میں کوئی غبن نہیں حالی کی قطع رہی
کے باوجود بھی اس سے صدمہ محسوس کرنے کا بوجھ اپنے نفس پر ڈالو جو جانی کی روگردانی کے بعد بھی اس
کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آؤ۔ اس کے بھیل کے مقابلہ میں جو وہ اس کی تمنی کے بدلہ میں
نہی ہو اس کے ہرم کے بعد قبول صفا بتاؤ کہ وہ ایسا معلوم ہو کہ وہ تباہی و تفت سے
اور ہم اس کے ختم ہو گئیں۔ ادا کھنا ایسا بتاؤ بے فعل نہ ہو اور قابل سے نہ ہو۔

(ملخص دین و اسلام ص ۱۸۵ و ص ۱۸۶)

علامہ شیخ محمد حسین آل کاشغری الفطامہ مرحوم حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ان جامع کلمات
کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں، جو شخص غور و فکر اور تدبیر و تفحص کر کے حقائق و معانی تک دسترس
حاصل کرے اس کو یقین ہو گا کہ سوائے انہی کی فداست و تقدیر کے اس صفت کا خارج میں کوئی صلاح
نہیں ہے مگر یہ حکام و خلائق میں کس قدر ہی تنقی یا فتر کیوں نہ ہو کہ اگر اس صفت کا لازم یہ ہے کہ انسان
میں خود پسندی اور تکبر جیسی صفات نہ ہوں۔ اس کے بجائے اس صفت کا لازم یہ ہے کہ انسان
اپنی طرف کسی لیت نہ لے اور نہ ہی بلانے کے یہ بھی ہے کہ انسان اپنی دولت و ثروت و دیگر نعمتوں میں
وہ جس نے سلطان جلالوں کو اپنا شریک نہ سمجھے بلکہ اسے اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو دور حاضر کی

فضا میں اتنا بھی غنیمت ہے کہ انسان اپنے شر و فساد کو دوسروں سے روک لے (نفع پہنچانا تو درکنام
ہماری حالت یہ ہے کہ قہر و غلبہ کی خاطر دوسروں کو نوچنے کے درپے ہوتے ہیں اور اپنے امیانی
بھائیوں کی تنگ عزت کے لئے ہر وقت ان کے عیبوں کی قبریں کھودتے اور خوش ہوتے ہیں باریں
ہمیں اس قسم کے فضائل سے کیا واسطہ؟ بلکہ اس قسم کی باتیں کرنا بھی اس زمانہ والوں کے سامنے سبکی کا
موجب ہیں اور لوگ ایسی باتوں کو فرافات سمجھتے ہیں۔ (خدا ہدایت و اصلاح کا دلی ہے)

دین اسلام صفحہ ۱۹۱-۱۹۲

دانشمندی کے اصول

آپ نے اپنے عزیز نذر اکبر حضرت حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو ایک نصیحت میں ارشاد فرمایا کہ مجھ سے چار اور
چار باتیں یاد کرو کہ ان پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں نقصان نہ اٹھاؤ گے۔

(۱) عقل پر دولت سے بڑی دولت ہے (۲) حماقت ہر فقر سے بڑا فقر ہے (۳) خود اپنی ہر گنجیہ معصیت سے
گھٹیا ہے۔ (۴) حق خلق ہر ذاتی خرابی سے بڑی خرابی ہے۔

الحق سے دوستی نہ رکھنا کہ فائدہ پہنچاتے پہنچاتے تنہا نقصان پہنچائے گا۔ بخیل سے دوستی نہ کرنا کہ شریہ
نہ دولت کے وقت تم سے الگ ہو جائے گا۔ فاجر سے دوستی نہ رکھنا کیونکہ چند لمحوں میں تنہا ایسا بیچ دے
جھوٹے سے دوستی نہ کرنا کیونکہ دوسرا بے طرح بے حقیقت ہے۔ (منہج البلاغہ)

آپ نے فرمایا عقلمند کی زبان اس کے دل کے پیچھے ہوتی ہے اور بے وقوف کا دل اس کی زبان کے پیچھے
ہوتا ہے۔ یعنی عقلمند سوچ کر بات کہتا ہے اور بیوقوف بات کہہ کر سوچتا ہے۔ (منہج البلاغہ)

جس طرح حضرت علی علیہ السلام کی حکومت قیامت تک کے حکمرانوں کے لئے روشنی کا بلند منار تھی اسی طرح آپ کی
سیرت عالمی دانشوروں اور انصاف پسندوں کے لئے پُر امن زندگی میں مشعل راہ تھی اور آپ کے پُر از حکمت اقوال
عام حکمیہ اور معارف اعلیٰ ہر چشمہ حقہ سے جاری ہیں یہ کہنا بجا نہیں ہے حضرت علی علیہ السلام کے کلمات حکمیہ کو اولین و
آخرین کے انصاف و انصاف کے مآل سے موازنہ کیا جائے تو آپ کا بعض اقوال ایک جملہ تمام دانشوروں کے اقوال پر
جاری ہو جاتا ہے۔ خداوندین قریب کرے جب عدل و انصاف کا بلال بالا ہو اور دنیا امن و سکون کا گہوارہ بن سکے۔

۱۲ جولائی ۱۹۴۲ء - مطابق یکم جمادی الثانیہ ۱۳۶۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
ہوئی۔ والحمد للہ رب العالمین۔ وہو الموفق والمعين۔

از قلم عماد الاعلام مولانا نذر حسین صاحب ظفر
مدرس دارالعلوم محمدیہ سرگودھا

ثقتہ الاسلام والمسلمین، ناصر المائتہ والدین، العالم البیل والفاضل الجلیل علامہ حسین بخش صاحب ظلہ العالی کی ذات گرامی قدر علمی و دینی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ مملکت خداداد پاکستان میں ایسے دینی مدارس کی اکثریت ہے جن میں اکثر و بیشتر افاضل اساتذہ و مدرسین کرام کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ آپ سید الصلحاء، عمدۃ الاقنیاء، استاذ العلماء، العالم العالی، الفاضل الکامل سرکار علامہ محمد باقر شاہ اعلیٰ اللہ مقامہ فی فراولیں الجنان کے قابلِ فخر اور ممتاز تلامذہ میں سے ہیں۔

آپ نے قیام پاکستان سے پہلے شیعانِ پاکستان کے مدارس دینیہ، مدرسہ محمدیہ جلالپورنگیانہ اور پھر علی الترتیب مدرسہ صادقہ خاںپور دریا ست بہاولپور، دارالعلوم محمدیہ سرگودھا، باب النجف جٹا ضلع ڈیرہ اسماعیل خان جامع المنظر لاہور اور دارالعلوم الجعفریہ کربلا خورشاب میں مدرس اعلیٰ کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہ کر سیکڑوں تشنگانِ علوم کو مذہبِ اہل بیت علیہم السلام کی تعلیم دی اور بیسیوں طلبہ کو عالم و فاضل بنا کر ملتِ شیعہ اثنا عشریہ پر احسانِ عظیم فرمایا۔ **حوزۃ علیہ نجف اشرف**، سرکار علامہ مدظلہ ۱۹۵۲ء میں باب مدینۃ العلم کی علمی درسگاہ "حوزۃ علیہ نجف اشرف عراق" میں وارد ہوئے اور اپنی خداداد قابلیت و تدریسی، تعلیمی تجربہ کی بدولت حضرات مجتہدین عظام و علماء اعلام کے درس خارج میں حاضر ہونے لگے۔ فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث وغیرہ اور درس خارج کی تکمیل کے بعد جب اپنے وطن مالوف کی طرف مراجعت فرما ہونے لگے تو مجتہدین اعلام نے آپ کو روایتِ احادیث معصومین علیہم السلام کے اجازاتِ سامیہ اور مرتبہ اجتہاد پر فائز ہونے کی سندتِ عالیہ عطا فرمائی اور ان میں متعدد القائیں آپ کی روحانی شان اور علمی وقار کا اظہار فرمایا۔ جیسا کہ اُنہ صفعات پر اجازات و سندت کی مندرجہ عبارات سے واضح ہے۔ آپ تے نجف اشرف سے واپس آکر انتہائی نامساعد حالات کے باوجود اپنے وطن مالوف میں جامعہ علمیہ باب النجف جٹا کی بنیاد رکھی اور قوتِ لامیوت پر بسر اوقات کرتے ہوئے مدرسہ کی تعمیری و تدریسی تمام تر خدمات کا بیڑا اٹھایا چنانچہ کامیابی نے بڑھ کر قدم چوم لئے اور آج جامعہ علمیہ باب النجف جٹا ضلع ڈیرہ اسماعیل خان ملک بھر کے ممتاز مدارس دینیہ میں شمار ہوتا ہے اور متعدد طلبہ اس مدرسہ عالیہ سے نارس ہو کر نجف اشرف تکمیلِ علوم کے لئے گئے اور دستِ فضیلت سر پر رکھ کر مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ اس وقت بھی تیس سے زیادہ انبائے قوم اس میں زیرِ تعلیم ہیں اور تین فاضل مدرسین فرائض تدریس انجام دے رہے ہیں اور مدرسہ مذکورہ کے مصارف کا زیادہ تر بوجھ آپ کے کندھوں پر ہے جسے وہ بخوشی برداشت کئے ہوئے ہیں اور پورے طور پر مدد میں ملتِ جعفریہ کی یہ واحد درس گاہ ہے۔ جو

تشنگانِ علومِ دینیہ کی پیاس بجھانے کی کفیل ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی طرف دستِ تعاون بڑھانا تمام مومنینِ پاکستان کا مذہبی و ملی فریضہ ہے۔

آپ نے جہاں اپنی ہمت سے مدرسہ عالیہ باب النجف کی بنیاد رکھی اور اُسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کی جدوجہد جاری رکھ کر منزلِ مراد حاصل کی۔ وہاں تدریسی و تعمیری مشاغل سے وقت بچا کر سلسلہ تصنیف و تالیف کو جاری فرما کر قوم پر احسان فرمایا۔

چنانچہ سب سے پہلے قرآن مجید کی تفسیر کو آسان اردو زبان میں شائع کرنے کا تہیہ کیا اور بحمد اللہ بہترین تفسیر لکھ کر قوم کو علومِ قرآنیہ سے روشناس کرایا اور اس وقت تفسیر کی بارہویں جلد زیرِ طبع ہے۔ تفسیر کا نام انوار النجف فی اسرار المصحف ہے۔ اس کے علاوہ عقائدِ شیعہ پر مبسوط و مدلل کتاب لمعة الانوار فی عقائد الابرار اور واقعاتِ کربلا پر مفصل پیش کش اصحاب الیمین اسی طرح المجالس المرئیہ۔ المجالس الفاخرہ آپ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

زیرِ نظر کتاب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب خلافت و ملوکیت کا جواب لا جواب ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خداوندِ کریم ان کو زیادہ سے زیادہ مذہبِ حقہ کی خدمت پر موفّق فرمائے اور مومنینِ کرام کو ان سے استفادہ کی سعادت عطا فرمائے۔

نذر حسین ظفر

مدرسہ دارالعلوم دہلی ضلع سرگودھا

اجازة اجتهاد وروايت

في حجة الاسلام والمسلمين اية الله في العالمين استاد العلماء والمجتهدين العلامة
لميرزا محمد حسن اليزدي اعلى الله مقامه

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله الذي رفع قدر العلماء وفضل مدادهم على دمار الشهداء وجعلهم ورثة الانبياء وامناً
على عبادته بعد الحجج والاوصياء والصلوة والسلام على اشرف الانبياء محمد وآله السفراء الامناء
الى يوم الجزاء ولبعد فان جناب العالم العامل والفاضل الكامل صفوة العلماء العاملين ثقة الاسلام والمسلمين
الميرزا محمد حسين نجش جابر ساكن ديرة اسماعيل خان دامت ايام اناصاته ممن صرف
في النجف الاشرف برهة من عمره وشطراً من دهره في اكتساب المعاليم الالهية والمعاليم الدينية الفقهية
والاصولية من الاساتيد العظام والمدرسين الفخام وقد حضر نجش ايضاً حضور تفهم وتعمق وتدقيق
باحثاً فاحصاً مجتهداً حتى فخر بحمد الله تعالى مرتبة من الاجتهاد مقروناً بالصلاح
والسداد قلته دثرة وعليه سبحانه اجرة واجزؤه دامت قابلياته ان يروى عني كلما صح لي
سروايتيه من كتب الاخبار ومصنفات علماءنا الابرار سيما الكتب الاربعة القديمة التي كان عليها
المدرس في سالف الاعصار الكافي والفقيه والمقنن والاستبصار والثلاثة المتأخرة الوافي
والوسائل وبجانب الانوار واجزت له احتياطاً التصدي في الامور الشرعية المحببة واستد الله
تعالى ان يجعله من مروجي الدين وكشيد به احكام خاتم النبيين صلوات الله عليه وآله اجمعين
واوصيه بملازمة التقوى والاحتياط وان لا ينساني من صالح الداعات كما اني لا انساه ان شاء الله
في ١٢ من شهر الثوال المكرم ١٣٤٥ هـ

الاحقر ميرزا محمد حسن اليزدي

ميرزا محمد حسن

ترجمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس اللہ کے لئے حمد ہے جس نے علماء کا مقام بلند کیا۔ ان کی سیاحت کو شہداء کے خون پر فوقیت بخشی انہیں انبیاء کا وارث بنایا۔ اور آئمہ معصومینؑ و اوصیائے طاہرین کے بعد ان کو اپنے بندوں پر امین مقرر کیا۔ درود و سلام ہوا شرف الانبیاء پر اور ان کی آل پر جو قیامت تک اللہ کی جانب سے مخلوق کی طرف عہدہ سفارت و امانت پر نائز ہیں۔

اما بعد۔ جناب عالم عامل فاضل کامل صفۃ العلماء العالمین ثقۃ الاسلام و المسلمین آقا شیخ حسین نجف جابر اضلع ڈیرہ اسماعیل خان، ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے معالم الہیہ و شرائع دینیہ کی تحصیل کے لئے عمر عزیز کا ایک حصہ اور قیمتی زندگی کا ایک ٹکڑا نجف اشرف میں صرف کیا۔ عظیم اساتذہ اور بزرگ مدرسین کے فقہی اور اصولی درسوں میں شریک رہے چنانچہ وہ پوری ہمت و محنت کے ساتھ بحث و فحس کے نظریے سے تقہیم و تحقیق اور تعمق و تدقیق کے پیش نظر میرے درس خارج میں بھی شریک رہے۔ یہاں تک کہ بعد اللہ صلاح و سداد کے ساتھ مرتبہ اجتہاد پر نائز ہوئے۔ ان کی خوبیوں کا کیا کہنا۔ خدا اکبر اسکائیک اجر عطا فرمائے۔ میں نے ان کو اجازت دی ہے کہ کتب احادیث اور علمائے اعلام کی جملہ تصانیف بالخصوص کتب اربعہ کافی فقیہ تہذیب و استبصار اور کتب ثلاثہ متاخرہ وافی وسائل اور سجاد الانوار سے روایات نقل کریں اور امور شرعیہ حبیبہ میں پوری احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ تصرف کریں۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کو دین کی ترویج کرنے والوں میں قرار دے تاکہ حضرت سید الانبیاء خاتم النبیینؐ کے احکام کو لوگوں کے دلوں میں پختہ کر سکیں اور میں ان کو تقویٰ و احتیاط کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ مجھے نیک دعاؤں سے فراموش نہ کریں جس طرح کہ میں بھی ان کو فراموش نہ کروں گا۔ ان شاء اللہ۔

میرزا محمد حسن یزدی

(مہر شریف)

آقائے یزدی مرحوم آیتہ اللہ علامہ شیخ ضیاء عراقی اعلیٰ اللہ مقامہ کے شاگرد تھے اور وہ آقائے شیخ محمد کاظم خراسانی صاحب کفایت الاصول کے تلمیذ رشید تھے۔ پس اجازہ روایت کے ماتحت ہمارا سلسلہ اسناد اس طرح ہوگا۔ عتہ قدس سرہ عن استاذہ الاوحد و شیخہ الامجد آیتہ اللہ الشیخ ضیاء الدین العراقی عن استاذہ خاتمتہ المحققین آیتہ اللہ الشیخ محمد کاظم الخراسانی الی آخرہ

(م) اجازة الرواية المنتهية استادها الى الأئمة الطاهرين عليهم السلام عن الشيخ الفاضل
الكامل قدوة العلماء العالمين شريفة العرفاء الكاملين آية الله العلامة الشيخ محمد
المدعو بآقا بزرگ انظر في المتوفى في النجف حصلت في السادس عشر من جمادى الثانية
سنة اربع وسبعين بعد الثلثة و^{١٣٨٩} اوفت من الهجرة -

بسم الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي اجاز لنا تحديث الاله واجازنا من حيث بلائه والصلاة والسلام على سيدنا خاتم
النبياؤه وعلى الائمة الاثنى عشر المعصومين خلفائه وبعد فيها ان الحديث احدا الاصلين الاصيلين والاسين
الدليلين المتفق على لزوم الاخذ بهما كافة علماء الاسلام من الخاص والعام اعنى السلف الصالح يحفظ الاحاديث
وضبطها وتعملها باحدى الطرق الثمانية التي اسهلها الاجازة وقد تاشى بتلاب السيرة المرضية الشيخ الفاضل
الكامل العالم العامل الثقة الدرع المعتمد الامين جناب المولى حسين نجش بن الله نجش بن خان محمد ساكن
دير اسماعيل خان من نواحى ايجاب الغربى في پاكستان دام افصاله وكثر في تلك البلاد اقرانه وامثاله فانه بعد تكميل
علومه سطحاً وخارجاً في جوارى باب العلم اعنى قبة الاسلام النجف الاشرف اراد ان يصراف الى موطنه وندار قومه
واسرشارهم الى امور دينهم واصلاح معادهم وعين ظنه استجاز من هذا الحقير فرجده جديراً بالاجابة وحريراً بالاجابة
فاستغرت الله تبارك وتعالى واجزته ان يروى عنى جميع ما صحت لى رواية وصلحت متى اجازته من مسوداتى ومروياتى
عن مشائخى الاعلام رحمهم الله وَاَيْتُ الله فى الانام القاطنين فى العراق والقاهرة والطيبة والبلد المحرام قدس الله
اسرارهم بجميع طرقهم واسانيدهم المذكور بعضها فى الاستاد المصنف وبعضها فى ذيل المشيخة وسائر الاجازات
فليروا دامت بركاته عنى عنهم لمن شاء واحب ممن استجاز وطلب ما جيا عنه وعنهم ان لا ينسرونى من الدعاء فى مظان
الاجابة ولتبرك بذكر سند معتد عال وهو ما ارويده عن شيخى العلامة خاتمة المجتهدين والمحدثين الحاج الميرزا
حسين النورى المتوفى فى النجف فى (١٣٢٠) عن استاده واستاد الكل الشيخ العلامة المرقضى الانصارى المتوفى
(١٢٨١) عن استاده وشيخه الا واحد صاحب المستند المولى احمد النراقى المتوفى (١٢٨٥) عن شيخه واستاده آية الله
مجل العلوم السيد مهدي الطباطبائى المتوفى (١٢١٣) عن شيخه الاستاد الوحيد الاقا محمد باقر البهبهاني المتوفى بالمحائر
الشريف (١٢٠٦) عن والده واستاده الاجل المولى محمد اكمال عن العلامة الاعلم المولى محمد باقر المجلسى المتوفى (١١١١)
عن والده العلامة المولى محمد تقى بن مقصود على المجلسى المتوفى (١٠٤٠) عن شيخه الاسلام والمسلمين بهار الملة والدين
محمد الاملى المتوفى (١٠٣٠) عن والده الشيخ سزالدين حسين بن عبد الصمد الحارثى المتوفى (٩٨٢) عن استاده السيد الشيخ
نور الدين الشهيد فى (٩٦٦) عن مشائخه المذكورين فى اجازته لوالديه البهبهاني المنقرلة صورتهما فى كتاب الاجازات

آخر مجلدات بحار الانوار ذكر واحد منهم وهو الشيخ الفقيه علي بن عبد العالي الميسي المتوفى (٩٣٨) عن الشيخ محمد بن محمد بن داود المرزني ابن عم الشهيد الاول عن الشيخ ضياء الدين علي بن الشهيد عن والده العلامة السعيد الشيخ شمس الدين ابي عبد الله محمد بن محمد مكي الجزيني الشهيد في (٤٨٦) عن استاده فخر الدين محمد المعروف بفخر المحققين المتوفى (٤٤١) عن والده واستاده الشيخ جمال الدين ابي منصور الحسن بن يوسف بن المطهر الحلبي الشهير بالعلامة المتوفى (٤٢٦) عن استاده الشيخ نجم الدين ابي القاسم جعفر بن الحسن بن يحيى بن سعيد الحلبي الشهير بالمحقق الحلبي المتوفى (٦٤٦) عن الشيخ تاج الدين الحسن بن علي الدربني عن الشيخ ابي عبد الله محمد بن احمد بن شهر يار الخاقاني مشهور امير المؤمنين عاميه السلام عن شيخه وشيخ الطائفة وابي اولاده الشيخ ابي جعفر محمد بن الحسن بن علي الطوسي المتوفى (٦٢٠) عن مشايخه المطوسرين في مشيخة كتاب التهذيب بطرقهم المنتهية الى المعصومين عليهم السلام منها روايته عن شيخه واستاده السعيد الشيخ ابي عبد الله محمد بن محمد بن النعمان الشهيد المتوفى (٦١٣)

عن شيخه واستاده الشيخ ابي القاسم جعفر بن محمد بن قزويني الفقيه المتوفى (٣٦٨) عن شيخه ثقة الاسلام الشيخ ابي جعفر محمد بن يعقوب الكليني المتوفى (٣٢٩) باسانيد التي ذكرها في كتابه الكافي المنتهية جميعها الى الاوصياء المعصومين صلوات الله عليهم اجمعين فليروا دامت بركاته عن جميع هذه الاسانيد مراعيًا للاحتياط مراقبًا الله تعالى في سائر الحالات داعيًا لهذا الفقير الفاني في الحياة وبعد الممات حررته وانا المذنب المي محمد محسن المدعوبًا قاترًا الطهراني في السادس عشر من جمادى الثانية سنة اربع وستمائة بعد اثنتا عشرة والاف الهجرية.

مهررين

(٢) وصورة الاجازة والعنونة المستملة على اكاير العلماء واعاظم الفضلاء في الهند

وهو ما ارد به عن ستيدي وسندي استاد العلماء والعاملين السيد الجليل المولى سيد محمد باقر المتوفى ١٢٨٥ هـ عن استاده المولى سيد شريف حسين جگر فري عن استاده المحقق الكبير المولى سيد حامد حسين صاحب العبقات عن المولى المفتي السيد محمد عباس عن المولى السيد حسين المعروف بميرن صاحب عن المولى سلطان العلماء السيد محمد رحمان مآب كان يعد من اركان امة محمد عن والده واستاده العالم الكامل المولى سيد دلدل علي غفران مآب عن آية الله السيد مهدي بحرالعلوم الطباطبائي الحلي.

اجازہ عالیہ

انرا استاد الفضل المجتہدین و ستاد الفقہاء المتورعین استاد المعقول والمنقول ایت
العلامہ محمد باقر الزنجانی مدظلہ العالی۔ وانرا سید الفقہاء والمجتہدین
واوراع العلماء العالمین ایت اللہ فی العالمین السید المتق والسند الرضی المرضی علامۃ
الدہر وفہامۃ العصر السید محمد محسن الحکیم اعلی اللہ مقامہ المتوفی ۱۳۹۱ھ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ الحمد للہ رب العالمین وافضل صلواتہ وانرا کی تجاتہ علی من اصطفاه من
الاولین والآخرین محمد والہ الطیبین الطاہرین واللغۃ الدائمہ علی اعدائہم اعداء الدین وبعد فان جناب
العالم العامل والفاضل الکامل والمہذب الصفی عماد الاعلام ثقۃ الاسلام المویذ المستد الاقا شیخ
حسین نجش البنجانی ادام اللہ توفیقہ وتا بیاتہ ممن صرف برہۃ من عمر وشطرا صالحاً من دہرہ
فی تحصیل العلوم الشرعیۃ وتکمیل المعارف الالہیۃ معتکفاً بجوارسید المتقین وامام المرہدین امیر المومنین
صلوات اللہ وسلامہ علیہ والہ الطاہرین مستفیضاً من الاعلام ومستفیلاً من الاساتید الکرام وقد حضر
شطرًا من ابحاث الفقہیۃ حضوراً جاد واجتہاداً وتعمق وتامل وتدقیق واتقان وهو بحمد اللہ من الافاضل
الاعیان وممن یشار الیہ بالبنان وممن یرجى منه تائید الدین المقدس الاسلامی وترویج احکام الشریعۃ المقد
اسئل اللہ تعالیٰ ما فہ ان یوفقہ ویؤیدہ ویبصرہ ولقد اذنت لہ فی ان یتصدی لما یجوز من التصدی لہ
للمجتہدین العظام والمذونین من قبلہم واجزت لہ ان یروی عنی جمیع ما صحت لی روایتہ من مصنفات
اصحابنا قدس اللہ اسرارہم بحق اجازتی عن مشائخی العظام باسانیدہم المفصلہ فی الفہارست وطرقہم
المنتهیۃ الی ارباب الجوامع ومنہم الی اہل بیت الوحی صلوات اللہ علیہم اجمعین وارضیہ ببلانہ من مہمۃ التقی
وان لا یبسانی من صالح دعواتہ ان شاء اللہ تعالیٰ کتبہ المحتاج الی مغفرۃ ربہ الکریم محمد باقر الزنجانی ۱۳۹۱ھ

(مہر شریف)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ولہ الحمد۔ جناب الشیخ سالمہ اللہ عجائز علی النور المذکور والفہم المسطور واللہ سبحانہ ولی التوفیق
والسداد

محسن الحکیم الطباطبائی

(مہر شریف)

ان دنوں میں آتے حکیم علی اللہ مقامہ بیمار تھے اور داخل ہسپتال تھے اس لئے انک اجازہ نہ لکھ سکے اور آتے زنجانی کے اجازہ
کے نیچے تائیدی کلمات تحریر فرمادیے۔